اسلامی دنیا میں ایرانؔ ہی کی تہذیب و معاشرت جاری ہی، ترکوں نے بڑی بڑی پرزور سلطنتیں قائم کیں، لیکن دفتر کی زبان اور دربار کے دستور اور آئین سب فارسی ہی رہے،

ایرانؔ کی خاک فنونِ لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی، اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا، اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا، اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف، اور صرف ایرانؔ کی شاعری ایک طرف، لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایرانؔ کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی، کن اسباب سے شروع ہوئی ؟

حصۂ اول

سلسلۂ آصفیہ

شعر العجم

یعنی

حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جسمیں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور اُن کے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعرا کا مفصل تذکرہ، اور اُن کی شاعری پر تقریظ اور تنقید ہے

مصنّفہ

شبلی نعمانی

باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپی

سنہ ۱۳۵۹ھ

سنہ ۱۹۴۰ء

طبع چہارم
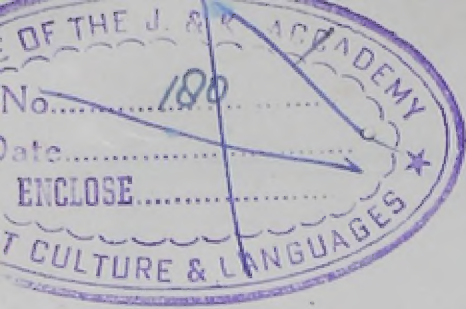
شعر العجم

حصّۂ اوّل

عبّاس مروزی سے نظامی تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف

تاریخ عجم

سنہ ۱۳۲۴ھ

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف

تذکرہ

سنہ ۱۳۲۵ھ

مصنّفہ

شبلی نعمانیؒ

طبع چہارم

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

سنہ ۱۳۵۹ھ
۱۹۴۰ء

فہرست مضامین شعرالعجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرم جویاں، درے را می پرستند　　فقیہاں، دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد　　کہ یاراں دیگرے را می پرستند

وَالصَّلوٰۃُ عَلیٰ رسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۵

اسلام ایک ابرِ عام تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، لیکن فیض بقدرِ استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی، عرب، ایران، افغانستان، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم، سب اس کے حلقہ میں آئے، لیکن قبولِ اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرقِ مراتب تھا، اور فرقِ مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں، جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی، اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے، ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا، بوعلی سینا، غزالی، رازی، طوسی، امام بخاری، مسلم، سیبویہ، جوہری، سب ایران ہی کی خاک سے اُٹھے تھے، آج تمام

اسلامی دنیا میں ایران ہی کی تہذیب و معاشرت جاری ہی، ترکوں نے بڑی بڑی پرزور سلطنتیں قائم کیں، لیکن دفتر کی زبان اور دربار کے دستور اور آئین سب فارسی ہی رہے،

ایران کی خاک فنونِ لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی، اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا، اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا، اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف، اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف، لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی، کن اسباب سے شروع ہوئی؟ کس طرح عہد بعہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں؟ ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کئے، خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟

شعرا کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعرا کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھدیئے ہیں، شعرا کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں، اور شاعری کے عہد بعہد کے انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں، میں اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور اکثر اس ادھیڑبن میں رہتا تھا، سنہ ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور استاد مسٹر آرنلڈ نے مجھکو اطلاع دی کہ جرمن کے ایک پروفیسر جیمیس ڈارمسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہی، میں اس زمانہ میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا، بڑے شوق سے کتاب منگوائی لیکن وہ ۸۰ صفحوں کا ایک

رسالہ تھا، جس میں شعرا کے نہایت معمولی حالات تھے، ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی، جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے جسمیں ژند پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے اور اسلام کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے، شاعری کی تاریخ سے اُسکو لگاؤ نہیں،

اس اثنا میں سر رشتہ علوم و فنون حیدر آباد کے تعلق سے سلسلۂ کلامیہ کی طرف متوجہ ہوا، اور چند کتابیں لکھیں جو چھپ کر شائع ہوئیں، اس سلسلہ سے فی الجملہ فراغت ہوئی تو پچھلے سال پُرانا خیال پھر تازہ ہوا، اور ۲۷ مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا، لیکن بیچ بیچ میں موازنہ انیس اور الندوہ سد راہ ہوتے رہے، جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن، اس کام میں مصروف ہوا، اور فردوسی کے حال تک پہنچا تو مئی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا، یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا[1]، یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع "دریغ برید و شکست و بہ بست" قلم کی زبان پر تھا، اس حادثہ نے تین چار ہفتہ لکھنے سے معذور رکھا، پھر وہ سلسلہ شروع ہوا، اور باوجود درد اور تکلیف کے کچھ نہ کچھ کام ہوتا گیا، یہانتک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دور اول کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا،

کتاب کی اجمالی ترتیب یہ ہے کہ قدما، متوسطین، متاخرین کے تین دور ہیں، پہلا دور حنظلہ سے شروع ہو کر نظامی پر تمام ہوتا ہے، دوسرا کمال اسمٰعیل سے جامی تک اور تیسرا فغانی

---

[1] شبلی نامہ سیہ را بہ جزائے عملش — پا بہ ید و صدا خاست کہ ہمرہی با لیست

سے ابو طالب کلیم تک کے بعد شاعری شاعری نہیں رہی، بلکہ چیستان گوئی بن گئی، ان دورون کے لحاظ سے کتاب تین حصوں پر منقسم ہی، چوتھے حصہ میں شاعری پر عام ریویو ہے اور یہی حصہ گویا کتاب کی جان اور اُسکی روح رواں ہی، اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہی، اگرچہ بہت ہیں لیکن خاص طرح پر جو ذکر کے قابل ہیں حسبِ ذیل ہیں،

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
لب اللباب	عوفی یزدی	سب سے پہلا تذکرہ ہے مصنف ساتویں صدی ہجری میں تھا اور اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں، پروفیسر براؤن نے تصحیح و تحشیہ کرکے شائع کیا ہی،
چہار مقالہ	نظامی عروضی سمرقندی	مصنف نظامی گنجوی کا ہمعصر تھا، گو مختصر سا رسالہ ہے، لیکن نہایت مفید باتیں لکھی ہیں، خود بھی باکمال شاعر تھا،
تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی		مشہور تذکرہ ہے، اور گو اکثر جگہ غلطیاں کی ہیں، تاہم دلچسپ اور مفید ہے،
تاریخ آل غزنین	بیہقی	مصنف مسعود بن سلطان محمد غزنوی کے زمانہ میں تھا، ضمناً شعراے عصر کا تذکرہ

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		کیا ہے،
عرفات	اوحدی	عرفی وغیرہ کا ہم صحبت تھا، یہ تذکرہ دو ضخیم جلدوں میں ہو، حالات بھی کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں،
میخانہ	عبد النبی فخر الزمانی	جہانگیر کے زمانہ میں تھا، صرف اُن شعراء کا حال لکھا ہے جنھوں نے ساقی نامے لکھے، تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل ہو اور اپنے ہمعصروں کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہو،
تذکرۃ الشعراء	مرزا طاہر نصیرآبادی	۱۰۸۳ئہ کی تصنیف ہے،
مآثر رحیمی	عبد الباقی نہاوندی	مصنف خان خاناں عبد الرحیم کا درباری تھا، کتاب اصل میں خان خاناں کی سوانحمری ہے، ضمن میں تمام شعرائے خان خانانی کے حالات بھی لکھے ہیں، اور تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل اور صحیح لکھے ہیں،
مرآۃ الخیال	شیر خاں لودی	چھپ گیا ہے،
ہفت اقلیم	امین رازی	جہانگیر کے عہد میں لکھا گیا، مستند اور معتبر ہے،

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
تذکرہ میر تقی کاشی		۹۹۳ھ کی تصنیف ہے،
تذکرہ سامی	سام میرزا صفوی	خاندان صفویہ کا شہزادہ اور جہانگیر کا معاصر تھا معتبر کتاب ہی مصنف جہانگیر کے عہد میں تھا
ریاض الشعراء	والہ داغستانی	
سرو آزاد	مولوی غلام علی آزاد	شعراے عہد تیموریہ کا تذکرہ ہی،
ید بیضا	"	عام تذکرہ ہی،
خزانہ عامرہ	"	صرف اُن شعرار کا حال ہی جن کو مدح کے معاوضہ میں صلہ ملا،
مجمع النفائس	خان آرزو	
مجمع الفصحا	ہدایت قلی خاں	حال کی تصنیف ہی، شعرار کا کلام نہایت کثرت سے جمع کیا ہے،

شعرار کے کلیات اور دیوان جس قدر نظر سے گذرے اُن کی فہرست اس قدر لمبی ہی کہ کئی ورق صرف ہوں گے، اس لئے قلم انداز کرتا ہوں،

عجیب بات یہ ہے کہ یورپ نے فارسی زبان کے ساتھ مسلمانوں سے زیادہ اعتنا کیا، مسلمانوں کو اسلام سے قبل فارسی زبان کی ایک تصنیف کا بھی پتہ معلوم نہ تھا لیکن یورپ نے ان تصنیفات کا اس قدر سرمایہ جمع کر لیا کہ زردشت سے لیکر

نوشیرواں کے عہد تک زبان کی پوری تاریخ مرتب ہوگئی،

پروفیسر دارمسٹیٹر جرمنی نے فرنچ زبان میں ایک ضخیم کتاب لکھی جسمیں کیومرث سے لیکر اسلام کے عہد تک چار دور قائم کئے اور ہر دور کی زبان کی نحو و صرف لغات الفاظ و تغیرات پر مفصل ریویو لکھا (یہ کتاب ہماری نظر سے گذری ہی) یورپ کے اور محققین نے خاص خاص زبانوں پر مستقل تصنیفات لکھیں، خصوصًا اوستا اور ژند کی زبان کے متعلق اسقدر کثرت سے معلومات مہیا کئے کہ نکتہ نکتہ حل ہوگیا، اکثر اساتذہ کے دیوان، جو نایاب تھے انکو بڑی کوشش اور تلاش سے بہم پہنچاکر تصحیح و تحشیہ کے ساتھ چھاپا، منوچہری کے قصائد ایران میں نہایت ناتمام اور غلط سلط چھپے تھے، لیکن فرانس میں اس اہتمام سے چھاپا کہ دیکھکر آنکھیں روشن ہوتی ہیں، اسکے ساتھ فرنچ میں اس کا ترجمہ بھی چھاپا، اور لغات و اصطلاحات کی علٰحدہ فرہنگ لکھی، اسی طرح روس کے پروفیسر والن ٹن ژوکوسکی نے انوری کے قصائد چھاپے اور دیباچہ میں انوری کی سوانحعمری اور کلام پر ریویو لکھا، پروفیسر نولدیکی نے خاص شاہنامہ کے تاریخی ماخذوں پر ایک مستقل کتاب جرمنی زبان میں لکھی، شعرا کے بہت سے تذکرے لکھے گئے جنمیں سے سرگور اوسلی کا تذکرہ عام طور پر مشہور ہی، سب سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب پروفیسر براؤن نے لکھی جو کیمبرج کالج کے فارسی لکچرار ہیں، اس کتاب[1] کے دو حصے شائع ہوچکے ہیں،

ان کوششوں کے علاوہ قدیم فارسی زبان کی اصل کتابیں بہم پہنچائیں اور چھاپ کر

---

[1] اس کتاب کا نام لٹریری ہسٹری آف پرشیا ہے اور لندن میں ۱۹۰۲ء میں چھاپی گئی ہی،

شائع کیں، آج مسلمانوں کے پاس پہلوی زبان کا ایک حرف موجود نہیں لیکن یورپ نے پہلوی زبان کی بہت سی تصنیفات شائع کیں جن میں سے ایک کتاب یات زیران حضرت عیسیٰ ؑ سے پانچسو برس قبل کی تصنیف ہے،

ان تصنیفات میں سے بعض بعض میری نظر سے گذریں، اور جن سے فائدہ اٹھا سکنا ممکن تھا میں نے فائدہ اُٹھایا لیکن ان تمام باتوں پر بھی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کتاب کے لکھنے کا جو حق تھا پورا ہوا، قدیم واقعہ نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے جو کمی کی وہ آج کیونکر پوری ہو سکتی ہی، ؎

گیرم کہ مرا طرز نوشتن نستد ازیاد   پیدا است کہ بااین سر و ساماں چہ نویسم

شعر کی حقیقت

چونکہ ایک مدت سے علم کی کمی اور طبیعتوں کی بد مذاقی نے شعر کی حقیقت پر پردہ ڈالدیا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ پہلے شعر کی حقیقت پر بحث کیجائے، تاکہ ایک صحیح معیار قائم ہو جس سے ایران کی شاعری کا اندازہ کیا جائے[1]،

شاعری کی حقیقت اور اُس کی ماہیت پر سب سے پہلے ارسطو نے بحث کی، چنانچہ اُس نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام بوطیقا (پویٹری) ہے، اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا، اور ابن رشد نے اس کی تلخیص کی، اس تلخیص کے جستہ جستہ حصے پروفیسر

---

[1] شاعری کی حقیقت پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے نہایت اجمالی لکھا ہے، اسکے متعلق اس قدر مواد موجود ہے کہ ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہی،

شنخوویس نے اپنی کتاب علم الادب میں جو بیروت میں چھپ گئی ہے شامل کیے ہیں، افسوس ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا، اسلئے شاعری کے متعلق ارسطو کے جو خیالات تھے وہ مسلمانوں میں بالکل پھیل نہ سکے،

شعر کی عام تعریف

کتب ادبیہ میں شاعری کی جو تعریف کی گئی ہے، اور وہی عام وخاص کی زبانوں پر جاری ہے، یہ ہے کہ کلام موزوں ہو، اور متکلم نے بہ ارادہ موزوں کیا ہو" لیکن یہ تعریف درحقیقت عامیانہ تعریف ہے، آج تو یہ مسئلہ بالکل فیصل ہو چکا ہے لیکن قدماء کے کلام میں بھی اسکے اشارے بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں، کہ شاعری صرف وزن وقافیہ کا نام نہیں کتب ادبیہ

شعر صرف وزن وقافیہ کا نام نہیں،

میں مذکور ہے، کہ ایک دفعہ حضرت حسان بن ثابتؓ کے صغیر السن بچے کو بھڑ نے کاٹ کھایا وہ حسان کے سامنے روتا ہوا آیا کہ مجھکو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے حسان نے جانور کا نام پوچھا، وہ نام سے واقف نہ تھا، حسان نے کہا اچھا اسکی صورت کیا تھی؟ بچے نے کہا۔ "کانہ مُلتفٌ ببردی حبرۃ" یعنی "گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہے" چونکہ بھڑ کے پروں پر رنگین دھاریاں ہوتی ہیں اسلئے اُس نے مخطط چادر سے تشبیہ دی، حسان اچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا کہ "واللہ صار ابنی الشاعر" یعنی خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا" فقرہ موزوں نہ تھا لیکن چونکہ نہایت عمدہ تشبیہ تھی، حسان نے سمجھا کہ بچہ میں شاعری کی قابلیت موجود ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک شعر کی اصلی حقیقت کیا تھی؟

ابن رشیق قیروانی نے عرب کی شعر وشاعری پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اس میں شعرا اور علمائے ادب کے جو اقوال نقل کیے ہیں، اُن سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے،

شعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیل کا نام تھا، نظامی عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر اور نظامی گنجوی کا معاصر تھا اپنی کتاب چہار مقالہ میں لکھتا ہی،

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتساق مقدمات موہومہ کند والتیام قیاس نتیجہ براں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ کند، و بزرگ را خرد ونیکو را در لباسِ زشت و زشت را در حلیہ نیکو جلوہ دہد، و با ایہام قوتِ غضبانی و شہوانی برانگیزد تا بداں ایہام طبائع را انبساطے وانقباضے بود وامور عظام را در نظام عالم سبب گردد"

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے کہ مقدماتِ موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز بدنما اور بری چیز خوش نما ثابت کیجائے، جس سے محبت و غضب کی قوتیں مشتعل ہوجاتیں۔

یورپ کے محققین کے نزدیک شعر کی ماہیت

یہ قدما کے اقوال وخیالات تھے، یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت دقیق بحثیں کی ہیں، اور عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں، مُل نے اس پر ایک نہایت مفصل اور بسیط مضمون لکھا ہی، جس کا نہایت مختصر خلاصہ حسب ذیل ہی،

انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے جذباتِ انسانی کو کچھ تعلق نہیں مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی مسئلہ حل کریں تو اس سے ہم کو غصہ یا جوش یا رنج نہیں پیدا ہوگا، لیکن اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال دردانگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا، اس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے، اور جو چیز ان جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے، وہی شاعری ہی، اس تعریف کی بنا پر تصویر، تقریر

وعظ بھی شعر میں داخل ہو جاتے ہیں، کیونکہ یہ چیزیں بھی جذباتِ انسانی کو بر انگیختہ کر سکتی ہیں، اسی بنا پر بعضوں نے ان چیزوں کو بھی شاعری میں داخل کر لیا ہے، لیکن مل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "انسان جو کلام کرتا ہے اس کی غرض کبھی تو دوسروں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے، مثلاً اسپیچ، لکچر، وغیرہ، کہ ان سب کا مقصد دوسروں کو متاثر کرنا ہوتا ہے، کبھی دوسروں سے مطلق غرض نہیں ہوتی، بلکہ انسان محض اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے، اور اپنا آپ ہی مخاطب ہوتا ہے، مثلاً اگر کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو اس حالت میں اُس کی زبان سے جو الفاظ نکلیں گے، اُس کی غرض کسی شخص یا گروہ کو مخاطب کرنا نہ ہوگا، بلکہ وہ اپنا آپ مخاطب ہوگا، فرض کرو، وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی وہی الفاظ اس کی زبان سے نکلیں گے، شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے، اس بنا پر شاعری کی تعریف منطقی طور پر کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ، جو کلام اس قسم کا ہوگا اس سے جذباتِ انسانی بر انگیختہ ہوں، اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں، بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو، اس کا نام شاعری ہے"

مل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے لیکن اس سے شاعری کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے، اور اگر معیاری معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اردو کا دفترِ بے پایاں بالکل بیکار ہو جائیگا،

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا دائرہ نہ اس قدر تنگ ہی، جیسا حالی صاحب کرنا چاہتے ہیں، اور نہ اس قدر وسیع جتنا ہمارے علماے ادب نے کیا ہے،

شعر کی اصلی حقیقت

شعر (جیسا کہ ارسطو کا مذہب ہے) ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہی، فرق یہ ہی کہ مصور صرف مادی اشیار کی تصویر کھینچ سکتا ہے، بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہی،

ایک شخص کا عزیز دوست جدا ہو رہا ہے، اس حالت میں جو اس پر صدمے گذرتے ہیں، اور دلدوز خیالات کا جو طوفان اس کے دل میں اُٹھتا ہے شاعر اُسکی تصویر اسطرح کھینچ سکتا ہے کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور اُن کی تصویر کھینچی جاتی، تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی تھی،

اس بنار پر کسی چیز کا بیان جب اسطرح کیا جائے کہ اُس شے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئیگی، دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی طپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی یا رنج، غم، غیظ، غضب، جوش، محبت، افسوس، حسرت، خوشی، ان اشیا کا اس طرح بیان کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں میں پھر جائے، یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے، یہی شاعری ہے،

ایک اور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کیجا سکتی ہی،

دنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں خواہ مادی ہوں مثلاً پہاڑ، بیابان، باغ دریا وغیرہ

خواہ غیر مادی، مثلاً وصل، ہجر، تحسین، نفریں، ان سب سے دل پر اثر پڑتا ہے، اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہیں، بعض اشخاص پر کم بعض پر زیادہ اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے، جو شخص ان مظاہرِ قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہ اس اثر کو الفاظ سے ادا بھی کر سکتا ہو وہی شاعر ہے،

شاعر کے جذبات اور احساسات، فطرۃً نہایت نازک لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں، دوست کی جدائی ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بیتاب ہو جاتا ہے، دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے، لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے، ممکن ہے کہ اس درجہ کی کیفیت دوسروں پر بھی طاری ہو لیکن وہ لوگ اس کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ سے اسطرح ادا نہیں کر سکتے جس طرح شاعر کر سکتا ہے، حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہرِ قدرت سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہوا اور اس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ظاہر کر سکتا ہو وہی شاعر ہے،

برادر عزیز مولوی حمید الدین نے جمہرۃ البلاغۃ فن بلاغت میں ایک نادر کتاب لکھی ہے اس میں شعر کی حقیقت نہایت نکتہ سنجی سے بیان کی ہے اس کا خلاصہ ذیل میں ہے،

"شاعر کے لفظی معنی صاحبِ شعور کے ہیں، شعور اصل میں احساس (فیلنگ) کو کہتے ہیں، یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو، انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی ہیں مثلاً رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا، یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اس سے خاص خاص

حرکات صادر ہوتی ہیں رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں، ہنسی کے وقت ایک خاص
آواز پیدا ہو جاتی ہی، انگڑائی میں اعضا تن جاتے ہیں، اسیطرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہی،
شاعر کی طبیعت پر رنج، یا خوشی، یا غصہ، یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا
ہے، اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی، اسی کا نام شاعری ہی،

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہی تو مختلف قسم کی آوازوں کے ذریعہ سے ظاہر
ہوتا ہی مثلاً شیر کی گونج، طاؤس کی جھنکار، کوئل کی کوک، بلبل کا ترانہ، اسیطرح انسان پر جب
کوئی جذبہ طاری ہوتا ہی تو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی اور جسطرح حیوانات کے جذبات
کبھی حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں مثلاً طاؤس ناچنے لگتا ہی، سانپ جھومتا اور
لہراتا ہی، اسی طرح انسان کو چونکہ نطق کے ساتھ نغمہ کا ملکہ بھی عطا ہوتا ہی، اسلیے موزوں
الفاظ منہ سے نکلتے ہیں، اور ساتھ ہی انسان غنغنانے بھی لگتا ہی، اور جب یہ جذبہ زیادہ تیز
ہو جاتا ہی تو انسان ناچنے لگتا ہی، یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو یہی اصلی شعر ہے، اس بیان سے ظاہر
ہو گا کہ شعر الفاظ وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعہ کا نام ہے،

لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں، جذبات کی کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں، اسلیے ہر شعر میں
ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضرور نہیں، تاہم کوئی شعر راگ سے خالی نہیں ہو سکتا، وزن جو شعر کا
ایک ضروری جزو ہے، راگ کی ایک قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل عرب ہمیشہ اشعار کو گا کر
پڑھتے تھے شعر کے پڑھنے کو جو اہل عرب انشاد کہتے ہیں، اسکی یہی وجہ ہی کیونکہ انشاد کے اصلی
معنی گانے کے ہیں،

ارسطو نے اس بحث میں سخت غلطی کی ہے، وہ کہتا ہی کہ شاعری کے جذبہ کے وقت انسان جو گانے یا ناچنے لگتا ہی، اسکی وجہ یہ ہی کہ نغمہ اور رقص ایک قسم کی مصوری ہی یعنی انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، آواز اور حرکات کے ذریعہ سے انکی تصویر کھینچتا ہی چنانچہ رقاص جو کچھ گاتے ہیں، حرکاتِ رقص کے ذریعہ سے اس کو بتاتے جاتے ہیں،

لیکن ارسطو کا یہ خیال غلط ہی اصل یہ ہی کہ جذباتِ انسانی مثلاً رنج، خوشی وغیرہ انسان کے دل میں نہایت پرزور حرکت پیدا کر دیتے ہیں یہی حرکت آواز یا راگ یا رقص یا تڑپ بنجاتی ہے مثلاً انسان جب ہنسی آتی ہی، تو دل میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہی، اور یہی حرکت ہنسی بنجاتی ہی، اور چونکہ یہ آثار، حرکاتِ نفسانی کے مشابہ ہوتے ہیں، اسلئے وہ حرکاتِ نفسانی پر اسی طرح دلالت کرتے ہیں جسطرح الفاظ معانی پر دلالت کرتے ہیں، غرض جسطرح نطق ایک فطری چیز ہے اسی طرح یہ اشارات و حرکات بھی خود بخود سرزد ہوتے ہیں، وہ نقالی اور محاکات کی غرض سے نہیں کئے جاتے، گو یہ ممکن ہی کہ محاکات کا مقصد اس سے حاصل ہو جائے،

ان تمام خیالات سے تمکو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا، اور معلوم ہوگا کہ آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اسکی شاعری سے کچھ تعلق نہیں،

فارسی شاعری کی ابتدا

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ اسلامی دور میں، شاعری تیسری صدی سے شروع ہوتی ہی

ابو العباس مروزی کے اشعار جنکا ذکر آگے چل کر کہیں آئیگا اگر روایۃً ثابت بھی ہوں تو وہ ایک

اتفاقیہ تفریح خاطر تھی، جو سلسلۂ تاریخی کی کوئی کڑی نہیں بن سکتی،

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے، کہ دو سو برس تک شاعری کی زبان کیوں بند رہی، فارسی تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب یہ بتائے ہیں،

"ظاہر است کہ اشعار قدیم شعرائے عجم بسبب غلبۂ عرب از میان رفتہ چنانکہ مشہور است کہ تمام کتب و تواریخ عجمیان را عرب سوختند۔ ....

از کتب قدیمہ چیزے بر جا نگذاشتند الا قلیلے کہ پنہاں داشتند، چوں مردم را قدغن بلیغ نمودند قاعدہ سخن فارسی و شعر متروک شد تا مدتے گذشت و اوضاع بنوع دیگر گشت۔"

یہ مجمع الفصحار کی عبارت تھی جو زمانۂ حال کا سب سے بڑا مستند تذکرہ ہے، اور ناصر الدین قاچار مغفور کے عہد میں ۱۲۸۴ھ میں تصنیف ہوا ہے، یہ خیال اصل میں دولت شاہ کے تذکرہ سے ماخوذ ہے، اُس نے یہ روایت نقل کی ہے کہ "عبداللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ ایران کی تمام کتابیں برباد کر دیجائیں اس بنا پر آلِ سامان کے زمانہ تک فارسی شاعری نے ظہور نہیں کیا۔"

ان بزرگوں کی تاریخ دانی کی داد دینے کا یہ موقع نہیں، اس کے لئے ہمارے مضمون تراجم کو دیکھنا چاہئے جو رسائلِ شبلی کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا ہے، لیکن استدلال کس قدر لطیف ہے، یعنی چونکہ ایران کی قدیم کتابیں برباد کر دی گئیں اس لئے اہلِ عجم فارسی میں شعر بھی نہ کہہ سکے، اسلام نے ملکی زبان سے کبھی کچھ تعرض نہیں کیا، حضرت عمرؓ کے عہد سے حجاج ابن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے، حجاج کے زمانہ سے عربی میں ہو گئے، لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی، رفتہ رفتہ فارسی عربی مخلوط ہو کر اردو کی طرح

شروع اسلام سے کئی سو برس تک فارسی شاعری کیوں وجود میں نہیں آئی؟

ایک جدید زبان پیدا ہوگئی، اور وہ گویا خاص اسلامی زبان تھی، جب خود فارسی زبان سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا، تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا،

اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قوم میں پھیلتا تھا، اس کو مذہبی اثر سے اس قدر لبریز کر دیتا تھا کہ اس کو سوائے مذہب کے دنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا تھا، خود عرب کو دیکھو، وہ ملک جس کے در و دیوار سے شاعری کی آواز آتی تھی، اسلام کے آتے ہی دفعۃً چاروں طرف سناٹا چھا گیا، ولید کے زمانہ سے جب شاہانہ دربار قائم ہوا تو لوازم سلطنت کی حیثیت سے شاعری نے دوبارہ جنم لیا لیکن تخت کی زبان عربی تھی، اسلئے شاعری بھی عربی ہی رہی، شعراء جو مدحیہ قصائد کے ذریعہ سے زندگی بسر کرتے تھے فارسی میں شاعری کرتے تو ممدوح اُن کی زبان کیونکر سمجھتا، اور نہ سمجھتا تو انکی داد کیا دے سکتا، اتنے سے سہارے سے کہ مامون الرشید ایک مدت تک خراسان میں رہا تھا، اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہوگیا تھا، عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا، اور مامون الرشید نے اُس کے صلہ میں ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیئے، ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ اسلامی عہد میں فارسی شاعری کا یہ پہلا حرف تہجی تھا، اس سے پہلے اگر برائے نام کچھ پتہ چلتا ہے تو ابوحفص حکیم سغدی کا شعر ہے جو پہلی صدی ہجری میں موجود تھا، شعر یہ ہے،

آہوئے کوہی در دشت چگونہ دودا ۔۔۔ وندارد یار بے یار چگونہ بودا،

ایک اور بڑا سبب یہ ہوا، کہ چند ہی روز میں اسلام نے اپنے خاص علوم و فنون اور ادب و انشا کا سرمایہ اس قدر وسیع کر لیا تھا، اور ہر شاخ میں وہ اختراعات اور جدتیں پیدا کی تھیں کہ اُس کے سامنے تمام قوموں کو اپنا قدیم لٹریچر ہیچ اور بے وقعت نظر آتا تھا، دوسری

تیسری صدی ہجری میں اسلام کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں یعنی ایران، مصر، شام، اندلس، ان تمام ممالک میں اسلامی علوم وفنون نے مفتوحہ قوموں کے علوم وفنون کو بالکل ماند کر دیا، اس لئے عرب کی شاعری کے آگے، دوسری قوموں کو اپنی زبان میں شاعری کرتے شرم آتی تھی خراسان، مصر و شام وغیرہ میں سیکڑوں ہزاروں شعرا پیدا ہوگئے تھے لیکن جو کچھ کہتے تھے عربی ہی میں کہتے تھے، چنانچہ ثعالبی نے یتیمۃ الدہر میں ان عجمی شعرا کا مفصل تذکرہ لکھا ہی،

شاعری کے پیدا ہونے کے اسباب

تیسری صدی ہجری میں دولت عباسیہ کا آفتاب اقبال ڈھلنا شروع ہوا اور بڑے بڑے صوبے خودمختار ہوکر نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں، اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت جو قائم ہوئی وہ خاندان طاہریہ تھا جو مامون الرشید کے مشہور سپہ سالار طاہر ذوالیمینین کی طرف منسوب ہے یہ خاندان جو ۵۴ برس حکمراں رہا، اور ۲۵۹ھ میں اس کا خاتمہ ہوگیا، اگرچہ خودمختاری کا مدعی نہ تھا لیکن خراسان میں اس کا اس قدر زور اور اقتدار بڑھ گیا تھا کہ خودمختاری کے تمام سروسامان پائے جاتے تھے، دربار میں شعرا کا ہونا بھی ضروری، اس لئے باوجود اس کے کہ یہ خاندان فارسی زبان سے بہت کم آشنا تھا، تاہم بہت سے شعرا پیدا ہوگئے، منوچہری دامغانی نے ایک قصیدہ میں متقدمین شعرا کا ذکر کیا ہے، ؎

بو العلاو بو العباس و بو سلیک و بو المثل	آنکہ آمد از نوائح آں کہ آمد از ہری
از حکیمان خراساں کو شہید و رودکی	بو شکور بلخی و بو الفتح بستی ہکذی

ان شعروں میں جن شعرا کے نام آئے ہیں، ان میں طاہریہ شعرا بھی ہیں، یعنی حنظلہ بادغیسی محمود وراق، فیروز مشرقی،

حنظلہ بادغیسی، یہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی ۲۱۹ھ میں انتقال کیا، عروضی[1] سمرقندی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ دیوان تھا چند اشعار یہ ہیں،

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند | از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و مجمرہ ناید ہمی بکار | با روی ہمچو آتش و با خال چون سپند

یعنی میرا معشوق نظرِ بد سے بچنے کے لئے، آگ پر سپند جلاتا ہے، لیکن اسکو اس کی کیا حاجت ہے اس کا چہرہ خود آگ اور اُس کا قال خود سپند ہے، حنظلہ نے ۲۱۹ھ میں وفات پائی۔[2]

محمود ورّاق، محمد بن طاہر جو خاندانِ طاہر کا سب سے اخیر فرمانروا تھا، یہ اُس کے زمانہ میں تھا، مجمع الفصحاء میں اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں، ؎

نگارینا بہ نقد جانت ندہم | گرانی در بہا، ارزانت ندہم
گرفتم بہ جان، دامانِ وصلت | نہم جان از کف و دامانت ندہم

فیروز مشرقی، اصل میں یمن کا رہنے والا تھا ۲۸۳ھ میں وفات پائی، اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مرغیست خدنگ او عجب دیدی | مرغے کہ شکار او ہمہ جانا
داده پر خویش کرگس ہدیہ | تا بچہ اش را برد بہ مہمانا

خاندانِ طاہریہ کے اخیر فرماں روا محمد بن طاہر کو ۲۵۹ھ میں یعقوب صفار نے گرفتار کرلیا اور اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا،

---

[1] چہار مقالہ ص ۲۶ [2] یہ تمام حالات اور اشعار مجمع الفصحاء سے ماخوذ ہیں،

خاندان صفاریہ کا عہد

یعقوب صفار ذات کا ٹھٹھیرا تھا، لیکن شاہانہ دل و دماغ رکھتا تھا، یہاں تک کہ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں اُس نے علم بغاوت بلند کیا اور خراسان و فارس پر قابض ہو گیا، سنہ ۲۹۰ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث اور اس کے بعد اس کا پوتا طاہر بن محمد چند روز حکمراں رہ کر سنہ ۲۹۰ھ میں گرفتار ہوا، اور اس سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا، اس چند روزہ خاندان نے بھی متعدد شعرا پیدا کئے جن میں سے **ابو سلیک گرگانی** زیادہ ممتاز ہے، منوچہری دامغانی نے اسکو قدما شعرا میں شمار کیا ہے، مجمع الفصحا میں اسکے یہ اشعار نقل کئے ہیں، ؎

به مژه دل ز من بدزدیدی — اے ملیح قاضی و به مژگاں دزد

مزد خواہی کہ دل ز من بُردی — اے شگفتا کہ دیدہ دزدی و مزد

شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہے کہ رباعی کی ایجاد اسی زمانہ میں ہوئی، یعقوب صفار کا ایک کمسن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا کر گرا، بچہ کی زبان سے بیساختہ یہ مصرع نکلا ع "غلطاں غلطاں ہمی رود تا لبِ گو" یعقوب بھی موجود تھا، اس کو بچہ کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا، لیکن چونکہ اُس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے، شعرا کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے، انھوں نے کہا ہزج ہے، پھر تین مصرع اور لگا کر رباعی کر دیا اور دوبیتی نام رکھا، مدت تک یہی نام رہا، پھر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے،[1]

[1] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی،

لیکن یہ تعجب ہے کہ عربی زبان میں آج بھی ڈیوٹی کہتے ہیں، جس سے اہلِ عرب کی ذہانت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

خاندانِ سامانیہ

خاندان سامانیہ

اس وقت تک جو کچھ ہوا وہ شاعری کی ابجد تھی، لیکن خاندانِ سامانیہ نے دفعتاً زمین کو آسمان بنا دیا، رودکی جو فارسی شاعری کا ابوالآبا سمجھا جاتا ہے، اسی دربار کا دست پرور تھا، شاہنامہ جو عجم کا صحیفۂ آسمانی ہے اس کا عنصر اسی عہد میں تیار ہوا، اس خاندان کا سلسلۂ نسب بہرام چوبیں تک پہنچتا ہے، اس لئے اس خاندان میں حکومت کا آنا جم و کسریٰ کا دوبارہ عالمِ وجود میں آنا تھا، عدل و انصاف، جاہ و جلال، شان و شوکت، تربیتِ علم و فن، کسی بات میں وہ اپنے اسلاف سے کم نہ تھا،

اس سلسلہ کے قائم ہونے کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ مامون الرشید کی جہاں اور شاہانہ فیاضیاں تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ قدیم خاندانوں کی تربیت کا خیال رکھتا تھا، جس زمانہ میں وہ مرو میں تھا، اس سلسلہ کا مورثِ اوّل اسد بن سامان دربار میں پہنچا، اور مامون نے اس کو پایۂ قرب میں جگہ دی، جب مرو سے بغداد روانہ ہوا تو وہاں کے گورنر کو تاکید کرتا آیا کہ اسد کی اولاد کو معزز عہدے دیئے جائیں، اسد کے چار فرزند تھے، نوح، احمد، یحییٰ، الیاس، چنانچہ وہ سمرقند، فرغانہ، بشناس، ہرات کے گورنر مقرر کئے گئے، نوح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد سمرقند کا حاکم مقرر ہوا،

لیکن چند روز کے بعد اپنے بیٹے نصر کو اپنا قائم مقام کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا ۲۶۱ھ میں
خلیفہ معتضد باللہ نے نصر کو ماوراء النہر کی حکومت دی، اس نے اپنی طرف سے اسمٰعیل کو
بخارا کا حاکم مقرر کیا، چند روز کے بعد دراندازوں نے دونوں بھائیوں کو باہم لڑا دیا،
یہاں تک کہ نصر میدانِ جنگ میں گرفتار ہو کر اسمٰعیل کے دربار میں آیا، لیکن اسمٰعیل نے حوصلۂ
شاہانہ سے کام لیا، اور بھائی کو قید سے آزاد کر کے تخت پر بٹھایا آپ دست بستہ اس کے
سامنے کھڑے ہو کر آدابِ دست بوس کی رسمیں ادا کیں اور عرض کیا کہ میں وہی آپکا
ماتحت صوبہ دار ہوں، نصر نے ۲۷۹ھ میں انتقال کیا، اور سمرقند کا صوبہ بھی
اسمٰعیل کے ہاتھ آگیا،

سلسلۂ سامانیہ کی مستقل حکومت اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے، چنانچہ اس سلسلہ کا
پہلا فرمان روا یہی اسمٰعیل تھا، یہ خاندان ایک سو تیس برس تک قائم رہا، اسمٰعیل نے ۲۹۵ھ
میں وفات پائی، اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل اور اس کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا
اور یہی وہ تاجدار ہے جس کے دربار کا ملک الشعراء رودکی تھا، جو فارسی شاعری کا
بانی اول کہا جاتا ہے، وہ نہایت فیاض، عادل اور قدردانِ علم وفن تھا تیس برس کی
حکمرانی کے بعد ۳۳۱ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا نوح فرماں روا ہوا، وہ بھی
باپ کی طرح مربی علم وفن تھا، فلسفہ و حکمت اور دیگر علوم و فنون کا جو کتبخانہ اس نے
مرتب کیا تھا، اسکی نسبت علامہ ابن خلکان نے بوعلی سینا کے حالات کے ذیل
میں لکھا ہے،

كانت عديمة المثل فيها من كل	یہ کتبخانہ بے نظیر تھا، اس میں متداول و مشہور
فن من الكتب المشهورة بايدي	کتابوں کے علاوہ وہ کتابیں تھیں جو اس کتبخانہ
الناس وغيرهم ما لا يوجد في	کے سوا، اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتی تھیں اور
سواها ولا سمع باسمه فضلا عن معرفته	جنکا جاننا تو درکنار کسی نے انکا نام بھی نہیں سنا تھا۱

فلسفہ یونان کی بے شمار تصنیفات خلفاے عباسیہ کی بدولت عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں لیکن اکثر ترجمے نامفہوم اور مشتبہ تھے، اور جن کتابوں کے متعدد ترجمے ہوئے تھے وہ باہم مختلف تھے نوح بن نصر نے حکیم ابونصر فارابی کو بلا کر فرمایش کی کہ ان تمام تراجم کو سامنے رکھکر ایک صحیح اور جامع ترجمہ تیار کرے، چنانچہ فارابی نے اس فرمایش کی تعمیل کی اور اس کتاب کا نام تعلیم الثانی رکھا، اس واقعہ کو تاریخی حیثیت سے یاد رکھنا چاہیے کہ حکماے اسلام میں فارابی نے معلم ثانی کا جو لقب حاصل کیا ہے وہ اسی کتاب کی بدولت تھا، افسوس ہے کہ یہ کتب خانہ جل گیا، اور چونکہ اس کتاب کا اصل مسودہ فارابی کے ہاتھ کا ضائع ہو گیا، اس لئے آج یہ بے نظیر کتاب ناپید ہے۲،

۱ اس کتب خانہ کا حال خود بوعلی سینا کی زبانی طبقات الاطبا میں نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ بہت بڑا کتبخانہ تھا، ہر علم و فن کے لئے الگ الگ مکان تھے اور اسمیں صرف اسی فن کی کتابیں تھیں کتابیں اوپر تلے بہ ترتیب صندوق میں رکھی ہوئی تھیں، بوعلی سینا کا بیان ہے کہ میں نے قدما کی کتابوں کی فہرست دیکھی اور اپنی پسند کے موافق کتابیں نکلوا کر دیکھیں، انمیں اکثر ایسی کتابیں تھیں جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہ تھے اور خود میں نے بھی کبھی انکو نہیں دیکھا تھا ۲ یہ واقعہ اکثر کتابوں میں ہے کشف الظنون (باب تحفہ) میں اس تمام واقعہ کو منصور بن نوح کے عہد سے منسوب کیا ہے، اور مورخوں کو بھی یہ دھوکا ہوا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے، اسلئے کہ فارابی نے ۳۳۹ھ میں انتقال کیا ہے، اور منصور ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا ہے،

نوح نے ۳۴۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد عبد الملک ور عبد الملک کے بعد منصور بن نوح تخت نشین ہوا، اس کے دربار کا وزیر ابو علی بن محمد تھا، جس نے تاریخ طبری کا عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا، منصور نے ۳۶۵ھ میں وفات پائی، اسکے بعد نوح بن منصور ثانی فرماں روا ہوا، دقیقی مشہور شاعر اسی کے دربار کا شاعر تھا، نوح کے بعد منصور بن نوح، اسکے بعد عبد الملک ور اس کے بعد اسمٰعیل بن عبد الملک تخت نشین ہوا اور اسی پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا، جس کی تاریخ ۳۹۵ھ ہے،

شعرائے سامانیہ

سلسلۂ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گذرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے، طاہریہ عربی النسل خاندان تھا، اس لئے فارسی شاعری کو اس کے زمانہ میں عروج نہیں ہوسکتا تھا، صفاریہ نودولت اور کم اصل تھے، اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھکر نہ تھی، لیکن سامانی خاندان نسلِ کیان کا یادگار تھا، انکی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر پائی، قدردان علم وفن ہونے کے ساتھ وہ خود بھی صاحبِ کمال اور سخن سنج تھے، وہ دیکھتے تھے، کہ اہلِ عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں، یہانتک کہ انکی شاعرانہ قوتیں بالکل ایک غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں، خراسان و بخارا میں سینکڑوں ہزاروں شعرا موجود ہیں، جو نسلاً عجم ہیں، لیکن دار الخلافۂ بغداد کے اثر سے جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں، ان اسباب سے اس خاندان نے اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاہانہ توجہ کی، شعرا کی منتیں قرار تنخواہیں مقرر کیں، خاص خاص مضامین پر اشعار لکھوائے، کلیلہ دمنہ

سنسکرت سے اولاً فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی، لیکن جب عبداللہ بن المقفع نے اس ترجمہ کو عربی میں منتقل کیا تو فارسی نسخہ بالکل گمنام ہوگیا، نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ اس کو فارسی میں نظم کردے، عجم کی تاریخ اب تک نامرتب اور پریشان تھی، اس لئے دقیقی کو اس کام پر مامور کیا، چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے، اور یہ شاہنامہ کا پہلا سنگ بنیاد تھا، تفصیل ان واقعات کی آگے آتی ہے،

خاندان سامانیہ کے شعرا

شعرائے سامانیہ کی تعداد اگرچہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے، لیکن عروضی سمرقندی وغیرہ نے جن لوگوں کا نام خصوصیت سے لیا ہے وہ یہ ہیں، ابوالعباس، ابوالمثل، اسحاق جوئباری، ابوالحسن، جبازی نیشاپوری، ابوالحسن کسائی، شہید بلخی، ابوالموید، ابوعبداللہ فرالاوی، رودکی، دقیقی، رابعہ فرداری، ابوذر، ستمر جرجانی، ابوالمظفر نصر بن محمد نیشاپوری، عمارہ مروزی، طخاری، مرادی،

یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ اس دور کا پہلا شاعر کون ہے؟ لیکن جہانتک قرائن سے پتہ چلتا ہے ابوعبداللہ فرالاوی، مرادی، شہید، ابوشکور بلخی، اس قافلہ کے پیشرو ہیں، رودکی کا ایک شعر ہے[1]،

شاعر شہید و شہرہ فرالاوی ۔۔۔ ویں دیگراں بہ جملہ ہمہ راوی

یعنی شاعر اصل میں شہید ہے لیکن فرالاوی مشہور زیادہ ہوگیا ہے، باقی اور شعرا انہی دونوں کے رواۃ ہیں، رودکی نے شہید کا مرثیہ بھی لکھا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

[1] مجمع الفصحا، تذکرہ ابوعبداللہ فرالاوی،

کاروانِ شہید رفت از پیش | وان ما رفتہ گیر و می اندیش،
از شمار دو چشم یک تن کم | وز شمار خرد ہزاران بیش،

رابعہ

اس دور کی یہ خصوصیت یادگار ہے کہ شعر و شاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا، رابعہ فرواری بلخی جو رودکی کی ہمعصر تھی، اعلیٰ درجہ کی شاعر تھی، اس کا باپ کعب اعراب میں سے تھا، لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی اور اس وجہ سے عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی، نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی، بکتاش نام ایک غلام سے اس کو عشق تھا، لیکن پھر مجازی سے گزر کر عشق حقیقی کی نوبت پہنچی چنانچہ اس کا شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے، تاہم چونکہ عورت کا کسی اجنبی مرد سے محبت کرنا اسلامی جماعت میں معیوب تھا اس لئے لوگوں نے اسکو قتل کر ڈالا، مجمع الفصحا میں اس کے بہت سے شعر نقل کئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں،

دعوتِ من بر تو آں شد کایزدت عاشق کناد | بر یکے سنگیں دلے نامہرباں چوں خویشتن
تا بدانی درد عشق و داغ ہجر و غم کشی | چوں بہ ہجر اندر بپیچی پس بدانی قدرِ من

رودکی

اس دور کا مشہور شاعر ہے، تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا،

سامانیوں کے دور میں سینکڑوں شعرا تھے جن میں سے بعض کا تذکرہ آگے آئیگا، لیکن

آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے وہ رودکی ہے، شریف گرگانی نے سچ کہا

ازاں چندیں نعیم جاودانی	کہ ماند از آلِ سامان وآلِ ساماں
ثنائے رودکی ماندست مدحش	نوائے بار بد ماندست دستاں[1]

رودکی کا اصلی نام محمد یا جعفر ہے، رودک نخشب کے ضلع میں جس کو نسف بھی کہتے ہیں ایک گاؤں کا نام ہے، رودکی اسی گاؤں کی طرف منسوب ہے بعضوں کا بیان ہے کہ رودکی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ رود (ایک باجے کا نام ہے) اچھا بجاتا تھا،

یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاقی توافق ہے کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادرزاد اندھا تھا آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، پھر علم قرأت کی تکمیل کی، اسی سن میں شعر کہنا شروع کر دیا، شاعری کے مشغلہ کے ساتھ تمام متداول علوم وفنون حاصل کئے، خوش قسمتی سے نہایت خوش آواز اور طبیعت بذلہ سنج واقع ہوئی تھی، سلاطین وامرا کے دربار میں ایک بڑی خدمت ندیمی کی تھی، تقرب واثر کے لحاظ سے ندیم کا رتبہ وزرا سے بھی بالاتر ہوتا تھا اس عہدہ کے لئے بذلہ سنجی، لطیف الطبعی، حاضر جوابی، ظرافت، وسعتِ معلومات ضروری شرطیں تھیں، رودکی میں یہ سب شرطیں جمع تھیں، اس بنا پر نصر بن احمد سامانی کے دربار میں اسکو رسائی حاصل ہوئی، نصر نے اسکی تربیت پر خاص توجہ مبذول کی، تمام اربابِ تذکرہ کا بیان ہے کہ رودکی کو اس قدر جاہ و دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امرا کو بھی نصیب نہ ہوئی، جب اسکی سواری نکلتی تو دو سو زریں کمر غلام، رکاب کے ساتھ ساتھ

[1] بہارستان جامی،

چلتے، سفر میں اس کا اسباب چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا،

یہ عموماً مسلّم ہے کہ فارسی شاعری عربی کے نمونہ پر قائم ہوئی تھی، لیکن اس زمانہ میں عربی شاعری واقعیت اور حقیقت سے دور ہو کر، ستایش گری اور مداحی کے سوا اور کسی کام کی نہیں رہی تھی، متنبی، ابو تمام، بحتری جو اس دور کے پیغمبرانِ سخن ہیں، انکا تمام تر کارنامہ یہی خوشامد اور ثنا گستری تھا، خلفاء اور امراء شاعری کو صرف تفریح طبع کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے، لیکن خاندان سامانیہ نے شاعری سے اصلی کام لئے، چنانچہ رودکی کو کلیلہ و دمنہ کے نظم کی خدمت دی، اور اس کے صلہ میں چالیس ہزار درہم عطا کئے، عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے،

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش   عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

رودکی کی شاعری کا عام انداز

رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی، پند و موعظت اور حسن تاثیر ہے، عرب جاہلیہ کی شاعری کا اصلی جوہر یہ تھا کہ اس سے بڑے بڑے قومی اور ملکی انقلابات پیدا کر دیتے تھے، فارسی شاعری تفریح طبع کے سوا اور کسی کام کی نہ تھی، یعنی اس سے کبھی کوئی تاریخی واقعہ وجود میں نہیں آیا، لیکن رودکی اس عام اعتراض سے مستثنیٰ ہے،

نصر بن سامانی نے ایک دفعہ ہرات کا سفر کیا، اور بادغیس میں جو ہرات کا مشہور نزہت گاہ ہے، پڑاؤ ڈالا، بہار کے دن تھے، اور تمام دشت و صحرا چمن زار بنگیا تھا، نصر ان دلفریبیوں میں ایسا محو ہوا کہ ساری بہار یہیں گذر گئی، جاڑے آئے تو میووں کی بہتات ہوئی، ان اطراف میں ایک سو بیس[۱۲۰] قسم کے انگور ہوتے ہیں جنمیں ترنیان اور کلنجری نہایت خوش مزہ

شاداب اور نرم ہوتے ہیں، نصر صحرا سے اٹھ کر آبادی میں آیا اور دروازہ میں جو ایک مشہور مقام ہے قیام کیا، یہ مقامات نہایت آباد اور معمور تھے، ہر طرف عالیشان قصر و ایوان، اور ہر ایوان کے ساتھ خانہ باغ اور پائیں باغ ہوتا تھا، اسی زمانہ میں سیستان اور مازندران کے میوہ جات کی آمد ہوئی، نصر نے جاڑے بھی یہیں گذارے، ہر دفعہ قصد کرتا تھا کہ اب کی بہار گذرنے پر روانہ ہو جاؤنگا، لیکن جب ایک موسم گذر جاتا تھا تو دوسرا زنجیر پا بنجاتا تھا، اسی طرح پورے چار برس گذر گئے، امراء اور فوج کے لوگ تنگ آگئے، تاہم بادشاہ سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، آخر رودکی کے پاس گئے اور پانچ ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینی منظور کیں کہ بادشاہ یہاں سے بخارا کو واپس جائے، اگلے دن رودکی دربار میں گیا، نصر شراب پی رہا تھا، رودکی نے ساز کے ساتھ عشاق کی دُھن میں یہ اشعار گائے،

بوے جوے مولیاں آید ہمے — یاد یار مہرباں آید ہمے

ریگ آموی و درشتیہاے او — زیر پایم پرنیاں آید ہمے

یعنی دریاے جیحوں،

آب جیحوں با ہمہ پہناوری — خنگ مارا تامیاں آید ہمے

اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاہ سویت میہماں آید ہمے

شاہ سرو است و بخارا بوستاں — سرو سوے بوستاں آید ہمے

شاہ ماہ است و بخارا آسماں، — ماہ سوے آسماں آید ہمے،

نصر کا یہ حال ہوا کہ پاؤں میں موزے تک نہ پہنے اور اُسی وقت سوار ہو کر بگٹٹ

دوڑتا ہوا پوری ایک منزل پر جا کر دم لیا، سمرقندی نے یہ واقعہ لکھکر حیرت ظاہر کی ہے کہ "یہ ایک سیدھی سادھی نظم ہے، نہ کوئی صنعت ہے نہ مضمون بندی ہے، اس کا اس قدر اثر کیونکر ہو سکتا تھا" دولت شاہ کے زمانہ میں شاعری کی اصلی اور فطری حالت بدل چکی تھی، اس لئے لوگوں کو واقعیت اور اظہارِ فطرت میں مزہ نہیں آتا تھا، لیکن جب تک قوم میں صحیح مذاق باقی رہا شعرا ان اشعار پر سر دھنتے تھے، عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر تھا چار مقالہ میں لکھتا ہے؛

"ہنوز ایں قصیدہ را کسے جواب نگفتہ است کہ مجال آں ندیدہ اند کہ ازیں مضائق بیروں روند"

سلطان سنجر کے ملک الشعرا امیر معزی سے فرمائش کی گئی تھی کہ اس قصیدہ کا جواب لکھے، چنانچہ اس نے جو قصیدہ لکھا اس کا مطلع یہ ہے؛

رستم[1] از مازندراں آید ہمے　　زیں ملک از اصفہاں آید ہمے

(ممدوح کا نام)

امیر معزی مشہور اور کامل الفن شعرا میں سے ہے لیکن رودکی کے کلام کے سامنے اسکے شعر کا جو رتبہ ہے، محتاجِ اظہار نہیں، رودکی نہایت پُرگو تھا، رشیدی سمرقندی[2] نے اسکے اشعار کی

---

[1] جس زمانہ میں میں علی گڈھ کالج میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدرآباد دکن) علی گڈھ میں آئے سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائیگا، وہ تم لکھدو، میں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیشِ نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے،

ہمچناں باشیم گرمِ گفتگو،　　قاصد از درنا گہاں آید ہمے

افگند شورِ مبارک باد و پس　　ایں حدیثش بر زباں آید ہمے

آسماں جاہ از سوا لک دکن　　جانبِ ہندوستاں آید ہمے

[2] مجمع الفصحا ذکر رودکی،

تعداد ایک لاکھ بتائی ہی، چنانچہ کہتا ہی،

شعر او را بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار	ہم فزون تر آید ار چونانکہ باید بشمری
یعنی اسکے اشعار تیرہ دفعہ گنے تو ایک لاکھ ٹھہرے	اور اچھی طرح گنے جائیں تو اس سے بھی زیادہ نکلینگے

اقسامِ سخن میں، رودکی کے ہاں قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ، سب کچھ موجود ہے، مثنوی کا کوئی نمونہ موجود نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کلیلہ ودمنہ جو اُس نے لکھی ہی مثنوی ہی ہوگی، کیونکہ مسلسل واقعات مثنوی کے سوا اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتے،

رودکی کی شاعری کی وسعت،

مضامین کے لحاظ سے بھی اس کی شاعری کا دائرہ نہایت وسیع ہے، یعنی واقعہ نگاری، خیال بندی، موعظت ونصیحت، عشق ومحبت، مدح وثنا، صنائع وبدائع، سب چیزیں پائی جاتی ہیں، اور درجۂ کمال پر پائی جاتی ہیں، ہم مختصراً ہر ایک کا نمونہ پیش کرتے ہیں،

اخلاق وموعظت اخلاق وموعظت میں حسنِ ادا کے ساتھ، اس نے دقیق نکتے بھی بیان کیے ہیں، مثلاً اس کو یہ کہنا ہے کہ تم کو اوروں کی خوشحالی پر رشک اور حسد نہیں کرنا چاہیے، اسکو وہ اس طرح دلنشین کرتا ہے،

زمانہ پندے آزادہ وار داد مرا	زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است
بروزِ نیکِ کساں گفت غم مخور زنہار	بسا کسا کہ بروزِ تو آرزو مند است

یعنی جس طرح تم اوروں کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہو، اسی طرح دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمھاری حالت پر رشک کرتے ہیں، اسلئے تم کو شکایت کا کوئی موقع نہیں،

اکثر آدمی لوگوں کی بخالت کی شکایت کرتے ہیں، لیکن ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی

شخص کی بخالت اور سخاوت پر توجہ کرنا گدا طبعی اور طماعی کی دلیل ہے، رودکی اس نکتہ کو یوں ادا کرتا ہے،

تا کے گوئی کہ اہل گیتی | در ہستی و نیستی لیئمند،
چوں تو طمع از جہاں بریدی | دانی کہ ہمہ جہاں کرمند

زمانہ کی بے ثباتی کو اس طرح ادا کرتا ہے،

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز | نہ بہ آخر بمرد باید باز
ہم بہ چنبر گزار خواہد بود | ایں رسن راا گرچہ ہست دراز
خواہی اندر عنا و محنت زی | خواہی اندر نشاط و نعمت و ناز
خواہی اندک تراز جہاں بپذیر | خواہی از رے بگیر تا بہ حجاز
ایں ہمہ بود و باد تو خواب است، | خواب را حکم نے مگر بہ مجاز
ایں ہمہ روز مرگ اگر بینی | نشناسی ز یکد گرشاں باز

اپیکورس اور عمر خیام کے فلسفہ کو غالباً فارسی میں اول اسی نے روشناس کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

شاد زی، با سیاہ چشماں شاد | کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد
ز آمدہ شادماں نہ باید بود | وزگذشتہ نکرد باید یاد
نیک بخت آں کسے کہ داد و بخورد | شور بخت آں کہ او نخورد و نہ داد
باد، وابر است ایں جہاں افسوس | بادہ پیش آر ہرچہ بادا باد

خواجہ حافظؒ کا سارا دیوان اسی متن کی شرح ہے،

روی بہ محراب نہادن چہ سود　　　دل بہ بخارا و بتان طراز

ایزد تا وسوسۂ عاشقے　　　از تو پذیرد، نہ پذیرد نماز

واقعہ نگاری یعنی کسی واقعہ یا حالت کی تصویر کھینچنا شاعری کا ایک عنصر ہے، رودکی کے کلام میں یہ عنصر ہر جگہ نظر آتا ہے، ایک قصیدہ میں اُس نے جوانی اور بڑھاپے کی کیفیت بیان کی ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں،

مرا بسود و فرو ریخت ہر چہ دنداں بود　　　نہ بود دنداں، لا بل چراغ خنداں بود

یکے نماند کنوں، بل ہمہ بسود و بریخت　　　چہ نحس بود ہمانا کہ نحس کیواں بود

نہ نحس کیواں بود، و نہ روزگار دراز　　　چہ بود؟ راست بگویم، قضائے یزداں بود

ہمی ندانی لے ماہروے غالیہ موے　　　کہ حالِ بندہ ازیں پیش بر چہ ساماں بود

بہ زلف چوگاں نازش ہمی کنی تو بدہ　　　ندیدی او را آنگہ کہ زلف چوگاں بود

شد آں زمانہ کہ رویش بسانِ دیبا بود　　　شد آں زمانہ کہ مویش بسانِ قطراں بود

شد آں زمانہ کہ او شاد بود و خرم بود　　　نشاط او بہ فزوں بود و غم بہ نقصاں بود

ہمیشہ دستش زی زلفگاں خوشبو بود　　　ہمیشہ گوشش زی مردمِ سخنداں بود

ہمیشہ شاد ندانستے کہ غم چہ بود　　　دلم نشاط طرب را فراخ میداں بود

عیال نہ، زن و فرزند نہ، مئونت نہ　　　ازیں ہمہ تنم آسودہ بود و آساں بود

ہمی خرید و ہمی ریخت بے شمار درم　　　بہ شہر ہر چہ ہمی ترک نارپستاں[1] بود

[1] غنیمت ہے کہ ایرانی شاعر ہو کر مرد کے بجائے عورت کا نام لیتا ہے،

بسا کنیزک نیکو کہ میل داشت بدو | بشب ز یارت او نزد او بہ پنہاں بود
شد آں زمانہ کہ شعر و را جہاں بنوشت | شد آں زمانہ کہ او شاعر خراساں بود
تو رودکی را اے ماہرو کنوں بینی | بداں زمانہ ندیدی کہ در خراساں بود
بداں زمانہ ندیدی کہ در چمن رفتے | سرود گویان گوئی ہزار دستاں بود
کہ ابزرگی و نعمت ازین و آن بودے | در ابزرگی و نعمت ز آلِ ساماں بود
بداد میر خراسانش چل ہزار درم | ازو فزونی یک پنج، میر ماکاں بود
کنوں زمانہ دگر گشت و من دگر گشتم | عصا بیار کہ وقتِ عصا و انباں بود

مدحیہ | مدحیہ شاعری کے جو نمونے پائے جاتے ہیں، اعلیٰ درجہ کے ہیں، اور اُن میں خیال آفرینی بھی پائی جاتی ہے،

شاہے کہ بروز رزم از رادی | زرّیں نہد بہ تیر در پیکاں،
تا کشتۂ او ازاں کفن سازد | تا خستۂ او ازاں کند درماں

یعنی "بادشاہ اس درجہ کا سخی ہے کہ لڑائی میں تیر جو استعمال کرتا ہے، اُن کی پیکان سونے کی ہوتی ہیں، جس سے یہ مقصود ہے کہ اگر کوئی شخص زخمی ہو تو پیکاں کو بیچ کر اپنا علاج کر سکے، اور مر جائے تو تجہیز و تکفین کے کام آئے"

مرثیہ | مرثیے متعدد ہیں، اور سب میں مرثیہ کی خالص شان پائی جاتی ہے، ایک مرثیہ میں جو وزیرِ اعظم کے بیٹے کی وفات پر لکھا ہے، حکیمانہ انداز میں وزیر کو صبر کی تلقین کی ہے،

اے آنکہ غمگنی و سزاواری — واندر نہاں سرشک ہمی باری

اے وہ کہ غمزدہ ہے اور غمزدہ ہونا زیبا بھی ہے — اے وہ کہ چپکے چپکے آنسو بہاتا ہی

رفت آنکہ رفت، آمد آنکہ آمد — بود آنچہ بود خیرہ چہ غم داری

جو گیا گیا، جو آیا، آیا، — جو ہونا تھا ہوا، اب فضول کیوں غم کرتے ہو

ہموار کرد خواہی گیتی را؟ — گیتی است کے پذیرد ہمواری

کیا تم زمانہ کو ہموار کرنا چاہتے ہو — یہ زمانہ ہی، بھلا وہ کب ہموار کر سکتا ہی

مستی مکن، نشنود او مستی — زاری مکن کہ نشنود او زاری

جوش ظاہر نہ کرو، وہ جوش کا لحاظ نہیں کرتا — فریاد نہ کرو، وہ فریاد نہیں سنتا

شو تا قیامت زاری کن — کے رفتہ را بہ زاری باز آری

اچھا جاؤ قیامت تک روتے رہو — لیکن جو شخص چلا گیا، کیا وہ رونے سے واپس آجائیگا

شہید بلخی اور مرادی جو اس کے زمانہ کے مشہور شاعر تھے ان کا مرثیہ بھی لکھا ہی جو مجمع الفصحا وغیرہ میں منقول ہے،

غزل | غزل نے اس وقت تک مستقل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، قصائد کی ابتدا میں جو تشبیب کرتے تھے وہی اُس زمانہ کی غزل تھی، اُس کا نمونہ یہ ہے،

اے جان من از آرزوی تو بہ زماں — بنماے یکے روے بہ بخشاے برین جاں

دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس — آسان بربائی دل و آسان ببری جاں

نزدیک من آسانی تو باشد دشوار — نزدیک تو دشواری من باشد آساں

شور است دلم از کرشمۂ سلمیٰ | چنانکہ خاطر مجنوں ز طرۂ لیلےٰ
چو گلشکر و ہیم، در دل شود تسکیں | جو ترش روئے شوی وارہانی از صفرا
ببردہ نرگس تو آب جادوئے بابل | کشادہ غنچۂ تو باب معجز عیسےٰ

والہ داغستانی نے رودکی کی ایک غزل نقل کی ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

زہے فزودہ جمال تو زیب آرا را | شکستہ سنبل زلف تو مشک سارا را

لیکن اس زمانہ کا یہ انداز نہیں ہے، اس کے علاوہ اس غزل کے مقطع میں تخلص بھی مذکور ہے، حالانکہ اُس زمانہ تک غزلوں میں تخلص نہیں لاتے تھے،

رودکی کے ان اشعار کا جو رتبہ ہے ظاہر ہے تاہم عنصری کہتا ہے،

غزل رودکی وار نیکو بود | غزلہاے من رودکی وار نیست

اِس سے ظاہر ہوتا ہے عنصری رودکی کو غزل گوئی میں اُستاد مانتا تھا، اسلئے یا تو ماننا چاہئے کہ رودکی کی عمدہ غزلیں جاتی رہیں، یا یہ کہ عنصری غزل گوئی میں رودکی سے بھی کم تھا،

قصیدہ قصیدہ کا جو طریقہ رودکی نے قائم کیا، آج تک قائم ہے یعنی ابتدا میں تشبیب یا بہاریہ وغیرہ پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز، جود وسخا، عدل وانصاف شجاعت و دلیری کا ذکر، پھر دعائیہ، صنائع شاعری میں ایک صنعت ہے جسکو ترصیع کہتے ہیں، یعنی دونوں مصرعوں میں ہموزن الفاظ لاتے ہیں، مثلاً

ربادرا شرر قہرا و کند شنجرف (عرفی) جمادرا اثر لطف او کند شمشاد

یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہے اور چھٹی صدی تک تمام شعرا کا یہ عام انداز رہا،

قصیدہ میں اگرچہ صرف مداحی ہی ہوتی ہے، لیکن رودکی نے جا بجا نیچرل سین بھی دکھلائے ہیں،

بہار

از بنفشہ مرزہا گسترده دیباہا بچین وز شگوفہ شاخہا بربستہ در شاہوار

(زمین)

باہولے اوست گفتی ہرچہ گفتی در نسیم برزمین اوست گفتی ہرچہ در عالم بہار

از میان جوے آں آبے رواں ہمچو گلاب شاخہاے گل شگفتہ بر کنار جوئبار

بود ہر جا بہر نزہت گاہ بار و نقل و مل گلستاں در گلستان و میوہ اندر میوہ زار

خزاں

کوہ دیگر گوہ سیمیں گشت و زریں شد چمن آب دیگر بارہ روشن گشت و تیرہ شد ہوا

(برف کی وجہ سے) (زرد پتوں کی وجہ سے)

گشت خامش فاختہ تا شد چمن پرداختہ گشت بلبل بے نوا تا بوستاں شد بے نوا

(خالی) (آواز) (بے سامان)

نار چوں برحقہ زریں نگیں ہاے عقیق سیب چوں بر چہرہ سیمیں نشانہاے بکا

(زنار)

باد سرد آمد چو آہ عاشقاں ہنگام صبح بانگ زاغ آمد چو از معشوق پیغام جفا

معرکہ جنگ

بدانگہے کہ دو لشکر بروئے یکدیگر گراں کنند رکاب و سبک کنند عناں

ز گرد اسپان تیرہ شود رخ خورشید ز بانگ مردان خیرہ شود دل کیواں

یکے کشیدہ سناں و یکے کشادہ حسام یکے کشادہ کمند و یکے کشیدہ کماں

قصیدہ کے حسن کا بڑا معیار گریز ہے یعنی تشبیب کہتے کہتے ممدوح کا ذکر اس طرح چھیڑ جائے جس طرح بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے، یہ بالکل نہ معلوم ہو کہ بہ قصد

ارادہ ممدوح کی مدح شروع کی ہے، رودکی کی اکثر گریزیں اسی قسم کی ہیں، مثلاً ایک قصیدہ میں خزاں کا حال لکھتے لکھتے کہتا ہے،

بادِ خوارزمی کنارِ باغ پُر دینار کرد　　چوں کنارِ زائراں را کف دست بادشا

یا مثلاً باغ کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے،

یار من گفتا بہشت است اے شگفت !!! ایں باغ نیست
گفتم ایں باغیست خرم چوں بہشت کردگار
آں بہشت ناپدید است، ایں بہشت استے عیاں
ایں بہ نقد است آں بہ نسیہ آں نہاں ایں آشکار
آں مکافاتِ نماز است، ایں مکافاتِ مدیح
آں عطائے کردگار است، ایں عطائے شہریار

یعنی معشوق نے باغ کو دیکھکر کہا کہ یہ تو بہشت ہے، میں نے کہا بہشت نہیں باغ ہے، لیکن خدا کی بہشت کے ہم پلہ ہے، فرق یہ ہے کہ خدا کی بہشت کا پتہ نہیں اور یہ علانیہ موجود ہے، یہ نقد ہے وہ ادھار، یہ ظاہر ہے وہ مخفی، وہ نماز پڑھنے سے ہاتھ آتی ہے اور یہ مدح کرنے سے، وہ خدا کا عطیہ ہے اور یہ بادشاہ کا،

بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہے جس کی تقلید کسی نے نہیں کی، مثلاً ایک قصیدہ تینتیس شعروں کا کہا ہے جسمیں صرف مطلع ہی ہیں، پہلا مطلع یہ ہے،

خدائی ورد ہجرے بت عرازان ارگردانی　　دگر زارم نگردانی بہ داغِ ہجر گردانی،

ہجو یا شکایت | ہجو فارسی شاعری کے چہرہ کا نہایت بدنما داغ ہے، لیکن رودکی کی ہجو میں بھی متانت اور واقعیت پائی جاتی ہے،

نہ ہے سوار وجہاں و تونگر از رہ دور | بخدمت آید نیکو سگال نیک اندیش
پسند آید مر خواجہ را پس از دہ سال | کہ باز گردد پیر و پیادہ و دل ریش

ممدوح سے کہتا ہے کہ کیا یہ مناسب ہے کہ جو لوگ آپ کے دربار میں جوان، دولتمند اور سواریوں پر آئیں، وہ اس قدر آپ کے ہاں اُمیدواری میں پڑے جھولا کریں، کہ جب واپس جانے لگیں تو دولتمند غریب اور سوار پیادہ اور جوان بوڑھا ہو کر جائے،

جدت مضامین | عام قاعدہ یہ ہے کہ ابتدائے شاعری میں مضمون بندی بالکل نہیں ہوتی، لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ رودکی نے کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے، مثلاً،

گھوڑے کی تعریف

آفتابیکہ زجا بک قدی | بہ سر ذرہ نماید جولاں

شراب کی تعریف

رودکی چنگ بر گرفت و نواخت | بادہ انداز کو سرود انداخت
آں عقیقین مے کہ ہر کہ بدید | از عقیق گداختہ نشناخت

تشبیہ

ہر دو یک گوہر ند لیک بطبع | ایں بفسیرد وآں دیگر بگداخت
نا بسودہ دو دست رنگیں کرد | نا چشیدہ بہ تارک اندر تاخت

یعنی شراب اور عقیق دونوں ایک ہی چیز ہیں، فرق یہ ہے کہ ایک سیال عقیق ہے اور دوسری منجمد، شراب کے رنگ، اور نشہ کی یہ کیفیت ہے کہ بے چھوئے

ہوئے ہاتھ رنگین ہوجاتے ہیں، اور بے چکھے ہوئے دماغ میں دوڑ جاتی ہی،

بنفشہاے طرب خیل خیل سر بر کرد ۔۔۔ چو آتشے کہ بگوگرد بر دوید کبود،

بیار وہاں بدہ آں آفتاب کش بخوری ۔۔۔ زلب فروشود و از دہاں برآرد دود

یعنی بنفشہ دستہ دستہ اگ رہاہے، جس طرح گندھک سے جلانے کے وقت، رنگ کا شعلہ اُٹھتا ہی، اب وہ آفتاب لاؤ یعنی شراب، کہ ادھر ہونٹوں سے اُترے اور اُدھر منہ سے دھواں اٹھنے لگے،

تیراو مانندہ روزی کہ زی مردم رسد ۔۔۔ تیر دشمن باز گردد سوے دشمن چوں صدا

یعنی ممدوح کا تیر، اس طرح نشانے پر لگتا ہی جس طرح انسان کا مقدر، اور دشمن کا تیر اس طرح دشمن ہی کی طرف پلٹ جاتا ہی جس طرح آواز،

موسم بہار

ہر آنچہ بست میان ارم بہم شداد ۔۔۔ ہر آنچہ کرد بزیر زمیں نہاں قارون

سرشک ابر پراگندہ کرد در بستاں ۔۔۔ نسیم باد پدیدار کرد در ہامون

یعنی باغ ارم میں شداد نے جو چیزیں فراہم کی تھیں، بادل کے آنسوؤں نے وہ سب باغ میں پھیلا دیں، اور قارون نے زمین کے اندر جو چیزیں چھپا رکھی تھیں، نسیم نے وہ سب میدان میں کھول کر دکھا دیں،

مہ فیساں شبیخوں کرد، اکنوں بر مہ کانون،

کہ گردوں گشت از و پُر گرد، و صحرا گشت از وپُر خوں

اگر خواہی نشانِ خوں نگہ کن لالہ بر صحرا

اگر خواہی نشانِ گرد بنگر ابر بر گردوں.

یعنی بہار کے مہینہ نے خزاں کے مہینہ پر شبخون مارا جس کی وجہ سے صحرا پر خوں ہو گیا، اور آسمان میں گرد بھر گئی، صحرا میں جو لالہ نظر آتا ہے، یہ وہی خون ہے،

نگارینا شنیدستم کہ گاہ محنت و راحت | سہ پیراہن سلب بودہ ست یوسف را بعمر اندر
یکے از کید شد پر خوں دوم شد چاک از تہمت | سوم یعقوب را از بوے روشن کرد چشم تر
رخم ماند بداں اول، دلم ماند بداں دوم | نصیب من شود در وصل آں پیراہن دیگر

یعنی اے معشوق! میں نے سنا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کے تین پیراہن تھے، ایک خون سے رنگین ہوا، دوسرا زلیخا نے چاک کیا، تیسرے نے حضرت یعقوب ؑ کی آنکھیں روشن کیں، میرا چہرہ پہلے پیراہن کے مشابہ ہے، اور میرا دل دوسرا پیراہن ہے، باقی تیسرا وہ خدا وصل میں نصیب کرے،

زلف ترا جیم کہ کرد آں کہ او | خال ترا نقطۂ آں جیم کرد
از دہن تنگ تو گویا کسے | دانگکے نار بدو نیم کرد

یعنی تیرا دہن ایسا چھوٹا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے انار کے دانہ کے دو حصے کر دیئے ہیں،

رباعیاں | رباعیاں معمولی ہیں، مجمع الفصحا میں ایک رباعی نقل کی ہے،

چوں کار دلم ز زلف او ماند گرہ | در ہر رگ جاں صد آرزو ماند گرہ
امید ز گریہ بود، افسوس افسوس | کانہم شب وصل در گلو ماند گرہ

لیکن یہ ہرگز رودکی کے زمانہ کا کلام نہیں ہو سکتا،

قبولیت عام اور اعتراف شعر | رودکی کے کمال شاعری کو تمام شعرا نے تسلیم کیا ہے،

خود اس کا معاصر اور ہم فن اور ہمپایہ شہید کہتا ہے،

بسخن مانند شعر شعرا، رودکی را سخنش تلونیاست

شاعران راخہ و احسنت مدیح، رودکی راخہ و احسنت ہجاست
بمعنی خواب

عنصری کہتا ہے،

غزل رودکی وار نیکو بود، غزل ہاے من رودکی وار نیست

اگرچہ بکوشم بہ باریک وہم، دریں پردہ اندر مرا بار نیست

معروف بلخی کہتا ہے،

از رودکی شنیدم سلطان شاعران

دقیقی کہتا ہے،

کرا رودکی گفتہ باشد مدیح، امام فنون سخنور بود،

دقیقی مدیح آورد نزد او، چو خرما بسوے ہجیور بود،

نظامی سمرقندی کے زمانہ میں کسی نے رودکی کی شاعری پر اعتراض کیا تھا نظامی نے اس کے جواب میں لکھا ہے،

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی، ایں طعن کردن تو از جہل و کودکی است

کانکس کہ شعر داند، داند کہ در جہاں، صاحب قرآن شاعری استاد رودکی است

رودکی نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی، اس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہے،

دقیقی

سلسلۂ سامانیہ کے ہر فرماں روا کا عہد اگرچہ بامِ ترقی کا ایک نیا پایہ ہے، لیکن نوح بن منصور کا زمانہ آخر المنازل ہے، یہ فخر اسی دور کو حاصل ہے کہ عجم کا سرمایۂ فخر ونازیعنی ”**شاہنامہ**“ جس کو ابن الاثیر قرآن العجم کہتا ہے، اس کا ابتدائی خاکہ اسی عہد میں قائم ہوا، اور اگر ایک اتفاقی واقعہ نہ پیش آجاتا، تو سلطان محمود کے کارناموں کی فہرست شاہنامہ کے نام سے خالی رہجاتی،

(سامانی خاندان ابتدا سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہوکر، عام زبانوں پر چڑھ جائے، لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی، کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ شعر کے قالب میں آجائے، نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، تو پایہ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعرا موجود تھے، ان میں دقیقی خاص پایہ تخت کا رہنے والا تھا، اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے، ابتدائی تربیت امراے چغانیہ یعنی ابو المظفر نے کی تھی، لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلاکر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت[1] سپرد کی، دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کرچکا تھا، اُس نے یہ خدمت قبول کی اور کم وبیش بیس ہزار شعر لکھے بعضوں کا بیان ہے کہ صرف ایکہزار شعر تھے جو آج شاہنامہ میں شامل ہیں، فردوسی نے شاہنامہ کی تاریخ کے بیان میں ان واقعات کو اس طرح اجمالاً لکھا ہے،

شاہنامہ کی ابتدا

[1] تذکرۂ ہفت اقلیم و مجمع الفصحا، روایت اخیر،

جو لفظ بیامد کشادہ زبان | سخنگوی و خوش طبع و روشن روان
بہ شعر آرم این نامہ را گفت من | از و شادماں شد دل انجمن
ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار | بگفت و سر آمد ورا روزگار

کیا عجیب بات ہے کہ اتنے بڑے کامل الفن کا دامن عزت، ایک اخلاقی دھبہ سے داغدار ہے، دقیقی کا ایک خوش رو غلام تھا جس سے اس کو عاشقانہ محبت تھی لیکن افسوس ہے کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا، غلام نہایت غیور تھا، اس نے ننگ کو گوارا نہ کیا اور دقیقی کا خاتمہ کر دیا، فردوسی نے اس ناگوار واقعہ کو ابہام کے پردہ میں ادا کیا ہے،

جوانیش را خوے بد یار بود | ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود،
یکایک از و بخت برگشتہ شد | بدست یکے بندہ کشتہ شد

فردوسی نے فیاض دلی سے اس کے اشعار شاہنامہ میں شامل کر لئے جس کی بدولت آج اس کا نام زندہ رہ گیا، چنانچہ خود کہتا ہے،

کنوں رانہا باز جویم ترا | حدیث دقیقی بگویم ترا،
چناں دید گوینده یک شب بخواب | کہ یک جام می داشتے چوں گلاب
دقیقی ز جاے پدید آمدے | بداں جام مے داستانہا زدے
بہ فردوسی آواز دادے کہ مے | مخور جز بہ آئین کاؤس کے
کہ شاہے گزیدے ز گیتی کہ تخت | بنازد بدو تاج و تخت و بخت

شہنشاہ محمود گیرندہ شہر ‏ ‏ ز شادی بہر کس رسانندہ بہر

بدیں نامہ گر چند بشتافتے ‏ ‏ کنوں ہر چہ جستی ہمہ یافتے

از اندازہ من بیش گفتم سخن ‏ ‏ اگر باز یابی بخیلی مکن،

ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار ‏ ‏ بگفتم سر آمد مرا روزگار

گر آں مایہ نزد شہنشہ رسد ‏ ‏ روان من از خاک بر مہ رسد

بداند کہ پیش از تو آخر کسے ‏ ‏ دریں داستاں رنج بردش بسے

پذیرفتم و داشتم زو سپاس ‏ ‏ مرا در دل آمد ز ہر سو ہراس

کہ روزے مرا ہم بباید گزشت ‏ ‏ ز گفتار او در نشاید گزشت

ز گفتار او بشنو اکنوں سخن ‏ ‏ کہ گفت است ایں داستان کہن

ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں جام شراب ہے، دقیقی کہیں سے آنکلا اور اُس نے کہا کہ شراب کیانی طریقہ سے پیو، تمکو ایسا بادشاہ ہاتھ آگیا ہے جس پر سلطنت کو ناز ہے، تم نے شاہنامہ کیلئے بہت تگ و دو کی، جو تم چاہتے تھے وہ تم کو مل گیا، میں نے بھی گشتاسپ وارجاسپ کے واقعہ میں ہزار شعر لکھے تھے، تم کو اگر یہ اشعار مل جائیں تو اپنی کتاب میں شامل کر دینا کہ بادشاہ تک پہنچ جائیں، اور لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اور بھی کسی نے کچھ محنت اُٹھائی تھی،

یہ سنکر میرا دل کانپ اٹھا کہ مجھکو بھی ایک دن مرنا ہے، اسلئے اُسکی خواہش پوری کرنی چاہیئے، اب تم اس کے اشعار سنو،

فردوسی نے دقیقی کے ساتھ جس ہمدردی اور مردہ پرستی کا اظہار کیا ہے، قدر کے قابل ہے، لیکن داستان کے ختم ہوتے ہوتے نیت بدل جاتی ہے، دقیقی کے اشعار کے بعد کہتا ہے،

نگہ کردم ایں نظم سست آمدم	ہمہ بیتہا نادرست آمدم،
من ایں زاں نوشتم کہ تا شہریار	بداند سخن گفتنِ نابکار
دہاں گر بماند ز خوردن تہی	ازاں بہ کہ ناساز خوانے نہی
دو گوہر بود ہم بہ گوہر فروش	کنوں شاہ دارد بہ گفتار گوش
سخن چوں بدیں گونہ بایدت گفت	مگوی و مکن رنج با طبع جفت،
چو طبعت نباشد چو آب رواں	مبر دست زی نامہ خسرواں

یعنی جب میں نے دقیقی کی یہ نظم دیکھی تو تمام اشعار مجھکو سست اور غلط نظر آئے میں نے یہ اشعار اس لئے نقل کر دیئے کہ بادشاہ ان اشعار کی لغویت سے واقف ہو جائے اگر آدمی کو کھانا نہ دیا جائے تو اس سے بہتر ہے کہ اس کے سامنے بدمزہ کھانے لائے جائیں، میں نے گوہر فروش کے سامنے دو موتی رکھدیئے ہیں، اب بادشاہ خود تمیز کرلے، جب تم کو اسی طرح کا شعر کہنا آتا ہے، تو اس سے تو نہ کہنا ہی اچھا ہے، جب تمھاری طبیعت میں روانی نہیں ہے، تو سلاطین کی تاریخ پر کیوں ہاتھ ڈالتے ہو،

اگر دقیقی کا کلام نقل کرنے سے اپنے اشعار کا چمکانا مقصود تھا، تو اُس غریب پر احسان رکھنے کی کیا ضرورت تھی، اس سے اندازہ کرنا چاہیئے، کہ سلطان محمود کی ہجو میں

کس حد تک واقعیت کا پہلو ہوگا،

فردوسی خدائے سخن ہے، اس کے آگے بندوں کو زبان کھولنے کی کیا جرات ہوسکتی ہے؟ لیکن ع انصاف شیوہ ایست کہ بالائے طاعت است، ہم سرسری طور پر یہاں دقیقی کے چند اشعار بغیر کسی انتخاب کے نقل کرتے ہیں، جس سے دقیقی کے رتبہ کلام کا اندازہ ہوسکے گا، وہ معرکہ آرائی کا سماں اس طرح کھینچتا ہے،

دقیقی کا انداز کلام

زبس بانگ اسپان و جوش و خروش ۔۔۔ ہمی نالۂ کوس نشنیدہ گوش

درفشان بسیار افراشتہ ۔۔۔ سر نیزہ ہا زابر بگذاشتہ

علم

چو دستہ درخت از بر کوہسار ۔۔۔ چو بیشۂ نیستان بوقت بہار

ز تاریکی گرد و بانگ سپاہ ۔۔۔ کسے روز روشن نمی دید راہ

بگردند یک تیرباران نخست ۔۔۔ بسان تگرگ بہاران درست

بپوشیدہ شد چشمۂ آفتاب ۔۔۔ ز پیکانہاے درخشان چو آب

توگفتی ہوا ابر آوردہ ہمے ۔۔۔ وزان ابر الماس بارد ہمے

ہوا زین جہان بود شبگون شدہ ۔۔۔ زمین سربسر پاک در خون شدہ

در و دشتہا شد ہمہ لالہ گون ۔۔۔ بہ دشت و بیابان ہمی ریخت خون

چنان شد زبس کشتہ آن رزمگاہ ۔۔۔ کہ بر شیر نہ تانست رفتن بگاہ

توانست

فردوسی کے کلام کا اصلی جوہر یہی ہے کہ جس واقعہ کو بیان کرتا ہے، اسکی تصویر کھینچ دیتا ہے، انصاف سے کہو، کیا ان اشعار میں یہ بات نہیں؟ بے شبہہ فردوسی کی

نے اس وصف کو کمال تک پہنچا دیا، لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہی شراب ہے جو دوبارہ کھنچکر تیز ہوگئی ہے، دقیقی کے زمانہ تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ دونوں سے مل کر گویا ایک نئی زبان پیدا ہوگئی تھی، عباس مروزی کے کل چار شعر ہیں، لیکن عربی الفاظ، فارسی سے زیادہ ہیں، رودکی وشہید بلخی وغیرہ کا کلام بھی اسی کے قریب قریب ہے، سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو اس آمیزش سے پاک کرکے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہے، وہ دقیقی ہی ہے، اس کے سینکڑوں شعر پڑھتے چلے جاؤ، عربی کا ایک لفظ نہیں آتا، دقیقی کی بدقسمتی دیکھو کہ اس فخر کا تاج شہرت کے ہاتھوں نے اس سے چھین کر فردوسی کے سر پر رکھ دیا، دقیقی نے زبان کو جس طرح صاف کیا، اُس کا نمونہ یہ ہے،

دقیقی کے ہاں عربی الفاظ بہت کم ہیں

چو گشتاسپ را داد لہراسپ تخت — فرود آمد از تخت وبربست رخت

بہ بلخ گزیں شد بداں نوبہار — ق — کہ یزداں پرستاں آں روزگار

مرآں خانہ را داشتندے چناں — کہ مر مکہ را تازیاں ایں زماں

اہل عرب

بداں خانہ شد شاہ یزداں پرست — فرود آمد آں جاو ہیکل ببست

ببست آں در آفریں خانہ را — وزاں خانہ بگذاشت بیگانہ را

عبادت خانہ

بپوشید جامۂ پرستش، پلاس، — خدا را چنیں داشت باید سپاس

بک اضافت گزی

بیفگند یارہ، فرو ہشت موے — سوے روشن داور کرد روے

کنگن

بنائش ہمی کرد خورشید را — چناں بردہ بُد راہ جمشید را

چو گشتاسپ برشد بہ تخت پدر — کہ فرید رداشت بخت پدر

بسر بر نہاد آں پدر داده تاج — کہ زیبنده باشد بہ آزاده تاج

منم گفت یزداں پرستنده شاه — مرا ایزد پاک داد ایں کلاه

بداں داد مارا کلاه بزرگ — کہ بیروں کنم از رمہ میش گرگ

سوے راه وزراں بیاریم جنگ — برآزاده گیتی نداریم تنگ

سافر
پس از دفتر نامور قیصرا — کہ ناہید بُد نام آں دخترا

کتایوں ش خواندی گرانمایہ شاه — دو فرزندش آمد چو خورشید و ماه

یکے نامور فرخ اسفندیار — شہے کارزاری، نبرده سوار

سپاہی
پشوتن دگر گُرد شمشیرزن — شہے نامبردار لشکر شکن

چو یک چند گاہے برآمد بریں — درختے پدید آمد اندر زمیں

از ایوان گشتاسپ بیان کاخ — درختے گشن برگ و بسیار شاخ

ہمہ برگ او پند بارش خرد — کسے کو چنو برخورد کے مردا

خجستہ پے نام او زردہشت — کہ اہرمن بدکنش را بکشت

ان اشعار میں جابجا فک اضافت اور الف اشباع ہے جو آج کل متروک و معیوب ہے، لیکن قدما کے ہاں اس کا عام رواج تھا، فردوسی بے تکلف ان چیزوں کو برتتا ہے،

دقیقی نے مثنوی کے ساتھ قصیده اور غزل کو بھی ترقی دی، یہ دو شعر جو نامعلوم

طور پر لوگوں کی زبانوں پر جاری ہیں، اسی کی غزل کے ہیں،

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد | آرے دہد ولیک بہ عمرِ دگر دہد
من عمرِ خویشتن بہ صبوری گذاشتم | عمرِ دگر بباید تا صبر بر دہد،

اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں، اور یہ اُس زمانہ کے لحاظ سے بالکل نئی بات ہے،

اسکی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رزم و بزم اور عشق و عاشقی کے دائرہ میں محدود نہیں، آج جس چیز کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں، فارسی میں غالبًا سب سے پہلے اسی نے اسکی بنیاد قائم کی، ایک قصیدہ میں بہار کا سماں دکھایا ہے، اس میں خوش رنگ اور رنگ برنگ پھولوں کی تصویر اس طرح کھینچا ہے،

نیچرل شاعری

سحرگاہاں کہ بادِ نرم جنبد | بجنباند درختِ سُرخ و اصفر (زرد)
تو پنداری کہ از گردوں ستارہ | ہمے بارید بر دیبائے اخضر (کمخواب)
نگار اندر نگار و لون در لون | ہزاراں در شدہ پیکر بہ پیکر

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے،

غزل مسلسل

درافگند اے صنم ابرِ بہشتی | زمیں را خلعتِ اُردِ بہشتی
زمیں بر ساں خون آلودہ دیبا | ہوا بر ساں مشک اندودہ دشتی (مانند)
بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک | مثالِ دوست بر صحرا نوشتی (تصویر)
بتے رخسارِ او ہمرنگِ یاقوت | مے بر گونہ جامہ کنشتی،
جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی | بجائے نرمی و جائے درشتی

ز گل بوے گلاب آید بد انساں | کہ پنداری گل اندر گل سرشتی،
دقیقی چار خصلت برگزید است | بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی،
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ | مے خوں رنگ و کیش زردشتی[1]،

شہید بلخی

زمانہ کی ناقدردانی کی شکایت

اس دور کا مشہور شاعر ہے، مختصر تذکرہ اس کا اوپر گذر چکا، اشعار کا نمونہ یہ ہے،

دانش و خواستہ است نرگس و گل | کہ بہ یکجاے نشگفند بہم،
ہر کرا دانش است خواستہ نیست | ہر کرا خواستہ است دانش کم

اگر غم را چو آتش دود بودے | جہاں تاریک بودے جاودانہ
دریں گیتی سراسر گر بگردی | خردمندے نیابی شادمانہ

بر فلک ہر دو شخص پیشہ ورند | ایں یکے درزی، آں دگر جولاہ
ایں نہ دوزد مگر کلاہ ملوک | واں نہ بافد مگر پلاس سیاہ،

تشبیہات

ابر ہمی گرید چوں عاشقاں | باغ ہمی خندد معشوق وار
رعد ہمی نالد مانند من | چونکہ بنالم بہ سحر گاہ زار

چوں جلیپاے روم زاں شد باغ | کاب ریزنے است باغ راز جلی
ابر چوں چشم ہند بن عتبہ است | برق مانند ذو الفقار علیؓ

[1] یعنی زردشتی، کیونکہ زردشت کے مذہب میں شراب حلال ہی،

موعظت و نصیحت

عیب باشد بہ کار بینک زنگ | گر شتاب آید ای رفیق ملام
عاقبت را ہم از نخستین بین | تا بہ غفلت گلو نہ گیرد دام

ابو شکور بلخی

۳۳۶ھ میں تھا، اس کا کلام بہت کم ملتا ہے، لیکن جس قدر موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کا ہر قدم آگے بڑھ رہا ہے، سقراط سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو اس قدر تحقیقات و تدقیقات کے بعد کیا معلوم ہوا؟ اس نے کہا یہ" معلوم ہوا کہ کچھ نہیں معلوم ہوا" اس فلسفیانہ خیال کو کس قدر عمدہ اور شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے،

تا بدانجا رسید دانشِ من | کہ بدانم ہمے کہ نادانم

یعنی میرا علم اس حد تک ترقی کر گیا کہ اب میں نے جان لیا کہ میں کچھ نہیں جانتا، اس کی مثنوی کے چند اشعار جو منقول ہیں ان میں صاف شاہنامہ کا رنگ نظر آتا ہے،

بہ دشمن برت مہربانی مباد | کہ دشمن درختے است تلخ از نہاد
درختے کہ تلخش بود گوہرا | اگر چرب و شیرین دہد مرورا
ہماں میوۂ تلخت آرد پدید | از و چرب و شیریں نخواہی مزید

اسی مضمون کو فردوسی نے زیادہ بلند کر دیا ہے،

درختے کہ تلخ است ویرا سرشت | گرش برنشانی بہ باغِ بہشت
ور از جوئے خلدش بہنگامِ آب | بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سر انجام گوہر بہ کار آورد | ہماں میوۂ تلخ بار آورد

جنازی نیشاپوری

دولت سامانیہ کا نامور شاعر ہے ۳۴۲ھ میں وفات پائی، اس کا کلام بالکل نیا ہے، ایک قصیدہ کی گریز کے دو شعر مشہور ہیں جن میں متاخرین کی جدتِ مضمون کیساتھ نیچرل رنگ بھی موجود ہے،

می بینی آں دو زلف کہ بادش ہمی برد | گوئی کہ عاشقی است کہ ہیچش قرار نیست
یا نہ کہ دست حاجب سالار لشکر است | کز دور می نماید کامروز بار نیست

یعنی معشوق کی زلف جو ہوا سے ہل رہی ہے گویا ایک بےچین عاشق ہے یا نقیب شاہی کا ہاتھ ہے، جو دور سے اشارہ کر رہا ہے کہ آج دربار نہ ہوگا،

عمارۂ مروزی

مرو کا رہنے والا تھا ۳۷۵ھ میں انتقال کیا، کلام کا نمونہ یہ ہے،

آتش اگر ندیدی با آب ممتزج | اینک نگاہ کن تو بدیں جام واں شراب
جام بلور و مُل سے صاف اندرو | گوئیکہ آتشے ست برآمیختہ بہ آب

ان شعرا کے علاوہ اس دور میں اور بہت سے خوشگو اور خوش فکر تھے، مثلاً اعجمی، طلحی، ابو العباس زنجی، جوئباری، ابو المثل بخاری، طلحہ وغیرہ لیکن چونکہ اُن کے حالات اور اشعار بہت کم ملتے ہیں اس لئے ہم اُن کے نام قلم انداز کرتے ہیں،

غزنویہ

شاعری اگرچہ ابتدائے ظہور سے روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی لیکن غزنویہ دور میں انتہائے کمال تک پہنچ گئی، فردوسی، اسدی طوسی، عنصری، فرخی، حکیم سنائی، منوچہری، دامغانی، جن میں ہر شخص اقلیم سخن کا صاحب تاج و تخت ہے، اسی عہد کی یادگار ہیں،

غزنوی خاندان کا اجمالی تذکرہ

سلسلہ غزنویہ حقیقت میں سامانی حکومت کی ایک شاخ ہے، عبد الملک بن نوح سامانی المتوفی ۳۵۰ھ کے زمانہ میں الپتگین جو اسی خاندان کا غلام تھا، ترقی کر کے امارت کے درجہ تک پہنچ گیا، عبد الملک نے اسکو خراسان کا حاکم مقرر کر دیا، عبد الملک کے بعد جب اس کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا تو الپتگین خراسان چھوڑ کر غزنیں چلا گیا اور یہاں ۱۶ برس تک حکومت کر کے وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق قائم مقام ہوا لیکن چند روز کے بعد مر گیا، الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا، اس نے الپتگین کے عہد میں ایسی قابلیت کے جوہر دکھائے کہ ابو اسحٰق کے بعد لوگوں نے ۳۶۵ھ میں اسی کو غزنیں کا حاکم مقرر کر دیا، یہی غلام (در غلام) سلطنت غزنویہ کا بانی اول ہے، اور سلطان محمود فاتح ہندوستان اسی نامور کا فرزند ہے سبکتگین پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا، اور

جیپال کو بار بار سخت شکستیں دیں، سامانی دربار سے اسکو ناصر الدین کا خطاب ملا ۳۸۷ھ
میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جو البتگین کی دختر کے بطن سے تھا بلخ
میں تخت نشین ہوا، محمود غزنیں میں تھا، اس نے بھائی کو لکھا، کہ آپ بلخ میں حکومت
کیجئے، لیکن غزنیں میرے قبضہ میں رہنے دیجئے، اس نے نہ مانا، اس پر جنگ ہوئی
اور اسمٰعیل نے شکست کھائی، محمود باپ کی زندگی ہی میں نوح سامانی کے دربار
سے سیف الدولہ کا خطاب حاصل کرچکا تھا، تخت نشینی کے بعد اس کو بغداد کے دربار
سے یمین الدولہ کا لقب ملا،

محمود کی شاہانہ فتوحات اور معرکہ آرائیاں ایک دلچسپ داستان ہے جس کی
آواز بازگشت آج بھی ہندوستان کے در و دیوار سے آرہی ہے، لیکن شعر العجم کی زبان
سے اسکی ملکی فتوحات کے بجائے، علمی فتوحات کا ترانہ زیادہ موزوں ہوگا،

سلطان محمود کے علمی کارنامے

محمود جس طرح فاتح و کشورستان تھا اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا جواہر
مضیئہ جو فقہاے حنفیہ کے حالات میں ایک نہایت مستند کتاب ہے، اسمیں اس کو فقہا
میں شمار کیا ہے، فقہ میں خود اسکی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے، غزنیں میں اس نے
ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا، جس میں
تمام دنیا کے نوادر موجود تھے[1]، ملک میں جو بڑے بڑے مشاہیر فن تھے اکثروں کو ملاکر
دربار میں جگہ دی تھی، ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی بھی تھا جو متعدد فنون میں

[1] تاریخ فرشتہ،

بو علی سینا کا ہمپایہ وہمسر تھا، بو علی کو بھی اس نے خوانِ کرم پر دعوت دی تھی، لیکن اسکو کچھ وہم پیدا ہوا اور نہ آیا،

شعراء کی تربیت اور فیاضی

شاعری پر اس نے حوصلۂ شاہانہ سے توجہ کی، ایک مستقل محکمہ قائم کیا اور عنصری کو ملک الشعرار کا خطاب دیکر اس کا افسر مقرر کیا، تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ محمود کے خوانِ کرم سے چار سو شاعر بہرہ یاب تھے، جنکو حکم تھا کہ جو کچھ کہیں پہلے عنصری کو دکھلا کر پھر دربار میں لائیں، ایک موقع پر جب شہزادہ مسعود خراسان سے غزنین میں آیا اور شعرا ئے دربار عام میں قصائد پیش کئے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کئے[1] عضاری کو دو شعروں پر دو توڑے دیئے چنانچہ عضاری خود کہتا ہے،

مرا دو بیت بفر مود شہر یار جہاں ... بر آں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال

دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم ... برغم حاسد و تیمار بدسگاں بکال

عنصری کو ایک رُباعی پر حکم دیا کہ اس کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے،

ان واقعات کو ایک نکتہ چیں محمود کے فضائل کے بجائے اس کے معائب کے دفتر میں لکھے گا، اور واقعی مداحوں اور خوشامد گویوں کی ایک فوج کثیر بہم پہنچانا اور ان پر زر و جواہر کا مینھ برسانا، فیاضی نہیں بلکہ اسراف اور سبک سری ہی، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ محمود کی یہ فیاضیاں، مدح پسندی کی غرض سے نہیں بلکہ فن ادب تاریخ

[1] مجمع الفصحا، تذکرہ زینتی،

کی ترقی کی غرض سے تھیں، اس نے فردوسی سے شاہ نامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا، کہ عجم گو خود مٹ گیا، لیکن اُس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے، اسلامی فتوحات مسلمانوں کے مذہبی ترانے ہیں، لیکن مسلمان خالدؓ و ضرارؓ کے بجائے، رستم و سہراب کے نام سے زیادہ آشنا ہیں، عبدالملک، ولید، مقتدر، معتضد، معتصم، مستعصم کو کتنے آدمی جانتے ہیں؟ لیکن جم و کیخسرو، کیکاؤس و فریدوں، افراسیاب و اسفندیار کو بچہ بچہ جانتا ہے،

عنصری نے ۱۸۰ شعروں کا قصیدہ لکھا جس میں محمود کی تمام لڑائیاں نہایت تفصیل سے بیان کیں[1]، بدایعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم کیا، اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی اور بدائع و صنائع فارسی پر ایک کتاب لکھی، تاریخ و اخلاق کے علاوہ محمودی شعرا نے اصل فن کو ترقی دی، اور شاعری کو اس قابل کر دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں، واقعہ نگاری، معاملہ بندی، اظہار جذبات، قدرتی مناظر کی تصویر، غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں، سب ان کے ہاں سے پائے جاتے ہیں، غزل البتہ رہ گئی لیکن ابھی اسلام کی ترقی کا شباب تھا، ابھی اس فتنۂ خوابیدہ کے جگانے کی کیا ضرورت تھی،

محمودی شعرا اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کر لیا تھا اور جو آسمان سخن کے سبعہ سیارے تھے یہ ہیں، عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غضائری، فرخی، منوچہری،

عنصری

حسن بن احمد نام، ابو القاسم کنیت، عنصری تخلص، بلخ کا رہنے والا تھا، آغاز شباب میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چونکہ آبائی پیشہ تجارت تھا، خود بھی تجارت شروع کی، ایک دفعہ اسی ضرورت سے سفر کو نکلا، راہ میں ڈاکہ پڑا، اور جو کچھ کائنات تھی، سب جاتی رہی،

عنصری نے تجارت کا خیال چھوڑ کر علم کی طرف توجہ کی، اس زمانہ میں تحصیل علم کے لئے فیس وغیرہ کا کچھ جھگڑا نہ تھا، ہر جگہ، ہر طرف بڑی بڑی درس گاہیں کھلی ہوئی تھیں، اور جو شخص جس آزادی سے پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ سکتا تھا، عنصری نے تمام متداول علوم و فنون حاصل کئے، لیکن طبیعت کو قدرتی لگاؤ شاعری سے تھا، اس لئے شاعری کو اپنا فن قرار دیا، اور اسی ذریعہ سے سلطان محمود کے چھوٹے بھائی نصر بن سبکتگین کے دربار میں پہونچا، نصر نے جوہر قابل دیکھ کر محمود کے دربار میں تقریب کی، رفتہ رفتہ **ملک الشعراء** کا خطاب ملا، سلطان محمود نے حکم دیا کہ دربار کے تمام شعراء جن کی تعداد چار سو تھی، اپنا کلام عنصری کو اصلاح کی غرض سے دکھائیں، اور جس کا کلام پیش ہو عنصری کی اصلاح کے بعد پیش ہو، بڑے بڑے شعراء عنصری کی مدح میں قصائد لکھ کر پیش کرتے تھے، اور گراں بہا صلے پاتے تھے، محمود کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو دولت و مال سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ چار سو زریں کمر غلام، رکاب میں ساتھ چلتے تھے، اور جب سفر کرتا تو اس کا ساز و سامان جو عموماً طلائی و نقرئی ہوتا تھا، چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا، انتہا یہ کہ

ملک الشعرائی کا خطاب

عنصری کی دولت و ثروت

دیگیں بھی طلائی اور نقرئی ہوتی تھیں ؎، اکثر شعرا نے عنصری کی دولت مندی کا ذکر حسرت ورشک کے ساتھ کیا ہے، خاقانی کہتا ہے،

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان　　　　ز زر ساخت آلات خوان عنصری

محمود کے دربار میں چار سو شعرا تھے جن میں فرخی، عسجدی، عضاری، منوچہری، جیسے قادر الکلام بھی شامل ہیں، لیکن یہ بات اسی کو حاصل ہوئی کہ سلطان محمود کا بقاے نام اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، نظامی سمرقندی کہتا ہے،

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد　　　　کہ از رفعت ہمی با مہ مرا کرد

نہ بینی زاں ہمہ یک خشت بر پاے　　　　مدیح عنصری ماندست بر جاے

عنصری نے سلطان محمود کی وفات کے تقریباً دس برس بعد ۴۳۱ھ میں وفات پائی اس کے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار بیان کیجاتی ہے جن میں اب صرف تین ہزار موجود ہیں، قصائد کے سوا متعدد مثنویاں بھی لکھی تھیں، مثلاً وامق وعذرا، سرخ بت وخنگ بت، شاد بہر وعین، لیکن آج بالکل ناپید ہیں، اس زمانہ تک شاعری کا بڑا لازمہ ندیمی یعنی فن مجلس تھا، جو شاعر جس قدر زیادہ اس فن میں کمال رکھتا تھا، اسی قدر زیادہ کامیاب ہوتا تھا، اس کے لئے سب سے مقدم چیز بدیہہ گوئی تھی، عنصری اس وصف میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، وہ نہایت پرگو تھا اور برجستہ کہتا تھا آتشکدہ میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر رات بھر میں ہزار شعر کہہ ڈالے، اسکی بدیہہ گوئی کے واقعات تذکرہ

؎ عنصری کے حالات زیادہ ترمجمع الفصحا، و تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی سے لئے گئے ہیں،

میں کثرت سے ملتے ہیں،

عنصری کی بدیہہ گوئی

سلطان محمود کو ایاز سے جو محبت تھی اگرچہ حد سے متجاوز تھی لیکن ہوس کا شائبہ نہ تھا، ایک دن بزم عیش میں بادہ و جام کا دور تھا، محمود خلاف عادت معمول سے زیادہ پی کر بدمست ہو گیا، اسی حالت میں ایاز پر نظر پڑی، اُس کی شکن در شکن زلفیں چہرہ پر بکھری ہوئی تھیں، محمود نے بے اختیار اس کے گلے میں ہاتھ ڈالدیئے، لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوش تقوی میں آکر ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکھدے، ایاز نے فوراً حکم کی تعمیل کی[1]۔ صبح کو جب محمود سو کر اُٹھا تو ایاز کی صورت دیکھکر سخت مکدر ہوا، بار بار اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، ندما اور مقربین دم بخود تھے، آخر علی قریب نے جو حاجب خاص تھا، عنصری کو بُلا کر صورت واقعہ بیان کی، عنصری نے محمود کے سامنے جاکر یہ رُباعی پڑھی،

گر عیب سرِ زلف بت از کاستن است | نہ جائے بہ غم نشستن و خاستن است
وقت طرب و نشاط و مے خواستن است | کار استن سرو ز پیراستن است،

یعنی اگر معشوق کی زلفیں ترش گئیں تو یہ رنج و غم کی کیا بات ہے، یہ تو اور خوشی کا موقع ہے، اس لئے کہ سرو جب چھانٹ دیا جاتا ہے تو اور زیادہ وہ موزوں ہو جاتا ہے، محمود نے حکم دیا کہ عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے، چنانچہ تین دفعہ ایسا کیا گیا، چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ منہ کے بجائے دامن بھرا گیا تھا، فیاضی کے مبالغہ کے لحاظ سے شاید یہی روایت صحیح ہو، لیکن منہ بھرنے میں جو بات ہے وہ دامن میں نہیں،

[1] شعرا نے اس واقعہ سے مضامین پیدا کئے مرزا صاحب کہتے ہیں" یا از نگہم خویش بباید درازکرد ، تیغ ستم بہ پیچ چہ زلف ایاز کرد

ایک دفعہ سلطان نے فصد لی، عنصری نے برجستہ کہا،

آمد آں رگ زنِ مسیح پرست | نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشتِ زرّیں و آبدستاں خواست | بازوے شہریار را بر بست
نیش بگرفت و گفت عزّ علیک | ایں چنیں دست را کہ یارد خست
سر فرو برد و بوسہ بر داد | وز تمن شاخ ارغوان برجست

پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اوج ترقی کے زمانہ میں بھی جرّاحی و فصادی کا کام عیسائی کرتے تھے، ایک دفعہ محمود چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گر پڑا خفیف سا زخم آیا عنصری نے فی البدیہہ کہا،

شاہا! ادبے کن فلک بدخو را | کاسیب رسانید رخ نیکو را
گر گوی خطا رفت بہ چوگانش زن | در اسپ غلط کرد بمن بخش اورا

آخیر مصرع دو پہلو رکھتا ہے، ایک یہ کہ گھوڑے نے اگر غلطی کی تو میری خاطر اس کو بخش دیجئے، دوسرے یہ کہ گھوڑا اگر غلط رو ہے تو مجھے دے ڈالئے، محمود نے اس حسن طلب کے صلہ میں گھوڑا عنصری کو دیدیا، عنصری نے ایک اور رباعی گھوڑے کی طرف سے معذرت میں لکھی،

رفتم بر اسپ تا بزارش بکشم | گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم
نے گاو زمینم کہ جہاں برگیرم | نے چرخ چہارم کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینے کا قصد کیا، گھوڑے نے کہا پہلے میرا عذر تو سُن

لیجئے، کچھ میں گاؤ زمیں تو نہیں ہوں کہ عالم کا بار اٹھا لوں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں،

شاعری کے متعلق عنصری نے جو کام کئے ان کی تفصیل یہ ہے،

(۱) قصیدہ میں تخلص اور گریز سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز سمجھی جاتی ہے یعنی غزلیہ مضامین کہتے کہتے بادشاہ کی مدح کی طرف کیونکر رجوع کریں، متاخرین کو ناز ہے کہ یہ نکتہ آفرینیاں انہی کے ساتھ مخصوص ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ عنصری کے مخلص بھی متاخرین سے کم نہیں، ایک قصیدہ میں ابتدا سے انتہا تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے، اس میں لکھتا ہے،

عنصری کی شاعری کی خصوصیت

غنودستند آں ماہ منور، | خط و زلفیں آں امۂ شے دلبر
یکے را سنبل نو رستہ بالیں | یکے را لالۂ خود روے بستر
بہ روی و موی او بنگر کہ بینی | بے آذر، ہر دواں را فعلِ آذر
(آگ)
یکے بے دود سال و ماہ تیرہ | یکے بے نور روز و شب منور،
مرا بہرہ دو چیز آمد ز گیتی | دل پاک و زبان مدح گستر
یکے بر مہر جاناں وقف کردم | یکے بر مدح شاہنشاہ کشور

ایک اور قصیدہ ہے،

گہ آں آراستہ زلفش گرہ گردد گہے چنبر | گہ آں پیراستہ جعدش بیارد مشک گہ عنبر
شگفتہ لالہ رخسارہ، حجابِ لالہ حیرارہ | براند عاج و دل زخارہ تن از شیر و لب از شکر
(زلف)

سمن بوئے شبہ موئے بلا جوئے جفا گوئے ۔۔۔ پریزادے پری شے پری چہرے پری پیکر

ہر دارای دل از روے کہ گاہ آمد گہ حق جوئے ۔۔۔ غزل چندیں چرا گوئی ز عشق آں بت دلبر

ثنا جوے از غزل پاسخ کہ تا (کہ ترا) ایں ہر دو بود فرخ ۔۔۔ غزل بر ماہ زیبا رخ، ثنا بر شاہ نیک اختر

ایک قصیدہ سوال وجواب سے شروع کیا ہے، اور اخیر تک یہ انداز قائم رکھا ہے اس میں نہایت خوبی سے مدح کی طرف رجوع کی ہے،

ہر سوالے کز آں گل سیراب ۔۔۔ دوش کردم مرا بداد جواب

گفتم آتش بر آں رخت کہ فروخت ۔۔۔ گفت آں کہ دل تو کرد کباب

گفتم اندر عذاب عشق تو ام ۔۔۔ گفت عاشق نکو بود بہ عذاب

گفتم از چیست شے راحت من ۔۔۔ گفت ہر دم ز روئے خسرو شاب

گفتم آں میر نصر ناصر دین ۔۔۔ گفت آں مالک قلوب رقاب

گفتم اندر جہاں چو او دیدی ۔۔۔ گفت نے و نخواندہ ام بکتاب

گفتم اعدائے او دروغ زن اند ۔۔۔ گفت ہمچوں مسیلمہ کذاب

گفتم از مدح او ثنا سازیم ۔۔۔ گفت زیشاں کنند اولو الالباب

گفتم او را چہ خواہم از ایزد ۔۔۔ گفت عمر دراز و دولت شاب

ایک قصیدہ کو تشبیب سے شروع کیا ہے، معشوق کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے

او و من ہر دو ہمی نازیم و نازم من بہ آں ۔۔۔ کو بہ حسن خویش نازد من بہ مدح شہریار

ایک قصیدہ زلف کی تعریف سے شروع کیا ہے،

ای شکستہ زلفِ یارا از بسکہ تو دستاں کنی | دست دستِ تست گر با ساحراں یکساں کنی
ہم زرہ پوشی دہم چوگاں نمی بر ارغواں | خویشتن را گہ زرہ سازی وگہ چوگاں کنی
نیستی دیوانہ، بر آتش چرا غلطی ہمی؟ | نیستی پروانہ، گردِ شمع چوں جولاں کنی؟

زلف سے خطاب کرتے کرتے اپنے آپ سے خطاب کرتا ہی،

دل نگہدار اے تن از درش کہ دل باید ترا | تا ثنائے کدخدائے کشور ایراں کنی

(۳) قصیدہ اگرچہ مداحی اور بھٹئی کے لئے مخصوص ہوگیا تھا، اسی بنا پر عرفی نے کہا ہے، قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی

ایک اور شاعر کہتا ہے،

گر نہ گویم قصیدہ باکے نیست | من خوشامد نمی توانم گفت

لیکن عنصری نے اکثر قصائد سے واقعہ نگاری کا کام لیا ہی اس نے اکثر قصیدوں میں محمود کی لڑائیاں اور فتوحات نظم کی ہیں، ایک قصیدہ میں جو ۱۰۲ شعروں کا ہی محمود کے تمام معرکے اجمالاً لکھے ہیں[1]، اس کے چند اشعار یہ ہیں،

شنیدہ خبر شاہِ ہندواں جیپال | کہ بر سپہر بلندش ہمی بسود افسر
بداں صنعت سپہے چوں شب سیاہ بزرگ | بدست ایشاں شمشیرہائے ہمچو سحر
چو دود تیرہ، درو آتشے زبانہ زناں | تو گفتئی کہ پراگندہ شد بدشت سقر
خدایگان خراساں بدشتِ پیشاور | بہ حملۂ بپراگند آں ہمہ لشکر

---

[1] تذکرۂ دولت شاہ میں لکھا ہی کہ اس قصیدہ میں ۱۰۰ شعر ہیں لیکن دیوان مروجہ میں اس سے کم ہیں،

حکایت سفر مولتاں ہے وانی   وگر ندانی تاج الفتوح پیش آور

اگر ز دجلہ فریدوں گذشت بے کشتی   بہ شاہنامہ بر آں ہر حکایت ست سمر

ازاں سپس کہ در رود ہم رانبد پایاب   وزاں سپس کہ براں باد رانہ بود عبر

بہ مولتاں شد و در رہ دو بیست قلعہ کشاد   کہ ہر یکے را صد بندہ بود چوں خیبر

بلاد و بت کدہ شاں کشاد و سوخت ہمہ   بیرو باد ہمہ تودہاے خاکستر

چو بازگشت بہ یک تاختن بہ یمینہ شد   ازاں کہ بود خراساں ز رنجہا مضطر

خوارزم کی فتح میں لکھتا ہے،

بوقت آں کہ زمیں تفتہ بد ز باد سموم   ہوا چو آتش وگردند رو بجاے شرار

فرو گذاشت با موبہ شہریار جہاں   بہ فال اختر نیک و بہ نصرت داوار

ہمہ زمیں شدہ آز روے بندگان کشمیر   ہمہ ہوا شدہ از عکس چاؤشاں فرخار

در آب در ہمہ غرقہ شدند چوں فرعون   چو برگذشت آں آب شاہ موسیٰ وار

فراخ جیحوں چوں کوہ شد ز بسکہ در و   کلاہ و ترکش و زیں بود و جامہ و دستار

کسے کہ زندہ بماند است ازاں ہزیمیاں   اگرچہ تنش درست است ہست چوں بیمار

بہ مغزش اندر تیغ است اگر بود خفتہ   بہ چشمش اندر تیر است اگر بود بیدار

اگر بہ جنبد بند قباے او از باد   گماں کند کہ ہمی بر جگر خورد مسمار

اگر سوال کند گویدا اے سوار مزن   وگر جواب دہد گوید اے ملک زنہار

اخیر شعروں میں شکست یافتہ فوجوں کی بدحواسی اور خوف زدگی کی تصویر کس خوبی

سے کھینچی ہے، کہتا ہے کہ جب یہ سوتے ہیں، تو خواب میں ان کو ہر طرف تلواریں نظر آتی ہیں، اور آنکھ کھلتی ہے، تو تیر ہی تیر دکھائی دیتے ہیں، قبا کا بند اگر ہوا سے جنبش کرتا ہے تو گمان کرتا ہے کہ کوئی شخص کلیجے میں کیل ٹھونک رہا ہے، اگر کچھ درخواست کرتا ہے تو یہ کہ میاں سوار! اب نہ مارنا، اور کچھ جواب دیتا ہے تو یہ کہ اے بادشاہ، پناہ دے!"

(۳) مناظر قدرت اور خاص خاص چیزوں کے اوصاف بھی اُس نے نہایت خوبی سے لکھے ہیں،

بہار

ابر نوروزی ہمی دُربار دو بت گر شود | تا ز صنعش ہر درختے لعبتے دیگر شود

باغ ہمچوں کلبۂ بزاز پر دیبا شود | باد ہمچوں طبلۂ عطار پُر عنبر شود

روے بند[1] ہر زمینے حُلۂ چینی شود | گوشوارِ ہر درختے رشتۂ گوہر شود

زمین کا ہر تختہ چینی کپڑے کی نقاب پہن لیتا ہے | درخت کانوں میں سونے کے بندے ڈال لیتے ہیں

چوں حجابی لعبتاں خورشید را بینی کہ باز | گہ بروں آید ز میغ، وگہ ز میغ اندر شود

آفتاب، بھان متی کی پتلی بن گیا ہے | کہ کبھی بادل سے نکل آتا ہے اور کبھی بادلوں میں گھس جاتا ہے

افسرِ سیمیں فرو گیرد، ز سر کوہِ بلند | باز مینا چشم و دیبا روے و مشکیں سر شود

پہاڑ نے چاندی کا تاج (برف) سر سے اُتار کر رکھ دیا | اور اسکی آنکھیں سبز، چہرہ پر نگار، اور سر مشکیں ہو گیا

مقصد یہ کہ پہاڑ پر سبزہ، بنفشہ اور طرح طرح کے پھول پیدا ہو گئے،

[1] نقاب کو کہتے ہیں،

نارنج کی تعریف،

درخت نارنج، از خامہ گوئیا شنگرف — برنجیت است کیسے مشت مشت درزنگار

زبرگ و بار ہمہ طوطیانِ پرانند — کہ برگ شاں ہمہ پرلست و بارشاں منقار

نہر کی تعریف

مجرہ وار یکے جوئے اندرو گزرد — برآبِ خضر شبہ کردہ، آب او بازار

کہکشاں — آبِ حیات

اگر بجنبد گوئی ہمے بجنبد جاں — وگر بہ پیچد گوئی ہمے بہ پیچد مار

بسان قارون گاہے فرو شود بزمیں — گہے شود بہ ہوا بر چو جعفرِ رضؓ طیار

ہاتھی کی تعریف

نہ چرخ اند، لیکن ہمہ چرخ گردش — نہ کوہند، لیکن ہمہ کوہ پیکر

چو اندر ہوا، کوہ بر قومِ موسیٰؑ — چو بر قومِ عاد آیتِ بادِ صرصر

چناں گردد، از عرضِ شاں دشت گوئی — بہ موج اندر آید ہمی بحرِ اخضر

بہ تک راہ گیرند بر آب و آتش — بدنداں بدرّند پولاد و مرمر

سیلاب

زمیں کوہ باشد چو آیند پیدا — چو اندر گذشتند، چاہ مقعّر

صنائع بدائع | یہ بدعت عنصری سے پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن خال خال تھی، اور اس قدر نمایاں نہ تھی کہ لوگوں کا خیال اس طرف رجوع ہوتا، عنصری نے اکثر صنعتیں مثلاً لف و نشر، ترصیع، تقسیم، سوال و جواب، کثرت سے برتیں، اور چونکہ بعض صنعتیں نہایت خوبی سے استعمال کیں، اور شعرار نے بھی تقلید کی، اور ایک عام شاہراہ پیدا ہو گئی، چنانچہ ترصیع یعنی دونوں مصرعوں میں تمام الفاظ کا باہم مساوی الوزن ہونا یا ہم قافیہ ہونا، اس قدر عام ہوا کہ قدمار کے اخیر دور یعنی ساتویں صدی تک تمام قصائد اسی انداز پر لکھے جاتے تھے اور نصیدی، بشعروں میں یہ

صنعت پائی جاتی تھی، لف و نشر، تقسیم سیاقۃ الاعداد کو بھی رواج ہوا، لیکن نہ
اس قدر کہ قصائد کے گلے کا ہار بن جائیں، عنصری نے جس طرح ان صنعتوں کو برتا
اُن کی مثالیں درج ذیل ہیں،

ترصیع

درختے است گویا بہ مینا منقش — پرندے ست گویا بہ لولو مشجر
روندہ است و رفتنش و مغز شیراں — خورندہ است و خوردنش از مغز کافر
نہ وہم ست و گستنش چوں وہم بر دل — نہ مغز است و بودنش چوں مغز در سر

گہ آں آراستہ زلفش گرہ گردے گہے چنبر — گہ آں پیراستہ جعدش بیار دو مشک گہ عنبر
رخ چوں تو شگفتہ گل ہمہ گلبن بہ بگ گل — ہمہ شمشاد پر سنبل ہمہ بجادہ پر شکر
بہ رو از نیکوے معنی بہ غمزہ از جادوے دعوی — بہ چہرہ حجت مانی، بہ خوبی حاجت آذر
سمن بوئے، اشبہ موئے، بلا جوئے، جفا گوئے — پری روئے، پری بوئے، پری چہرے، پری پیکر
دل آرامی، دل آرا غم انجامے، غم افزائے — نکو روئے و نکو رائے، بہ حسن اندر جہاں سرور

تمام قصیدہ اسی صنعت میں ہے، اور اس قدر مقبول ہوا کہ تمام شعرائے مابعد نے التزاماً
اس کے تتبع میں قصائد لکھے، سلمان ساوجی، امیر خسرو اور قاآنی نے بعض اور خوبیاں
اس میں اضافہ کیں، اور زیادہ حسن پیدا کر دیا، مثلاً قاآنی کہتا ہے،

کنوں کز بستہ بلید وار خواں یاسمن ارد — چمن تزئیں دمن تمکیں زمیں آئیں، زماں زیور
بہ صحن باغ و طرف راغ و زیر سرو و لب جو — بزن گام و بجو کام و بدہ جام و بکش ساغر

لف و نشر اور تقسیم کو اگرچہ عنصری نے بہت کم برتا ہے، لیکن نہایت خوبی او

مضمون آفرینی

سادگی سے برتا ہے،

یا بہ بندد یا کشاید یا ستاند یا دہد … تا جہاں باشد ہمی مرشاہ را این یادگار

انچہ بستاند ولایت، انچہ بدہد خواستہ … انچہ بندد دوست دشمن انچہ بکشاید حصار

مبالغہ، اس میں بھی عنصری نے کچھ کمی نہیں کی، لیکن اُس وقت تک تکلف اور بناوٹ کو اس قدر ترقی نہیں ہوئی تھی، اس لئے متاخرین کے مقابلہ میں اس کے مبالغے پھیکے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً وہ گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے،

شگفت آید از مرکب تو خرد را … کش از باد طبع ست از خاک منظر

بہ گام سپس بر رود گر برانے … بہ تقریبش از باختر تا بہ خاور

نہ جستن کند کم ز دریا بہ دریا … نہ منزل کند کم ز کشور بہ کشور

بہ نور و ظلمت ماند زمین و ابر ہمی … بہ در و مینا ماند سرشک ابر و گیا

فریفتہ است زمین ابر تیرہ را کہ ازو … ہمی ستاند در و ہمی دہد مینا

یعنی زمین اور بادل نور و ظلمت کے برابر ہیں، اور قطرۂ باراں، اور گھاس گویا موتی اور سبز شیشے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بادل زمین کے فریب میں آگئے ہیں، کیونکہ زمین سبز شیشہ دیکر اس کے عوض بادلوں سے موتی لیتی ہی،

گھاس … قطرۂ باراں

ہمانا کہ خورشید رنگ رخش را … بدوزد کہ بخشد بہ یاقوت احمر

عام خیال یہ ہے کہ آفتاب، جب کسی پتھر پر چالیس برس تک متصل طلوع ہوتا رہتا ہے تو وہ یاقوت بنجاتا ہے، عنصری کہتا ہے، کہ آفتاب دراصل معشوق کے

گھوڑے کی تعریف

چہرے کا رنگ چراتا ہے، اور یاقوت کو دیدیتا ہے،

زمانِ گذشتہ است کش درنیابی — چو بگذشت از پیش چشم تو دیگر

برجعت برآں گونہ باشد کہ گوئی — ہمے باز گردد زمانہ مکرر

یعنی جب یہ گھوڑا، سامنے سے نکل جاتا ہے، تو گویا گذرا ہوا زمانہ ہے، جس کو تم پا نہیں سکتے، اور جب چکر لگا کر آجاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ زمانہ نے پلٹا لیا،

—— ๏ ——

فرخی

علی نام، ابوالحسن کینت، فرخی تخلص، سیستان وطن، باپ کا نام قلوغ تھا، جو امیر خلف بن احمد حاکم سیستان کے دربار میں ملازم تھا، بچپن میں ادب اور موسیقی کی تعلیم پائی، چنانچہ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا، معاش کی یہ صورت تھی کہ ایک زمیندار کی ملازمت کرتا تھا جسکے معاوضہ میں سالانہ دوسو کیل غلہ اور سو درہم مقرر تھے، یہ مختصر سی آمدنی اسکی سادہ زندگی کیلئے کافی تھی، لیکن چند روز کے بعد اس نے امیر خلف کی ایک لونڈی سے شادی کی جسکی وجہ سے خرچ بڑھ گیا، آقا سے تحریری درخواست کی کہ تنخواہ میں ۵۰ درم کا اضافہ کر دے اور غلہ کی مقدار دوسو کیل کے بجائے تین سو کر دیجائے، آقا نے عرضی کی پشت پر لکھدیا کہ اسقدر حاضر ہے اور اس سے زیادہ کا مجھکو مقدور نہیں،

فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا، اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی، شاعری کی قدردانی کے قصے ہر جگہ مشہور تھے، اسلئے اسکو خیال ہوا کہ اس ذریعہ سے یہ مشکل حل ہوگی، چنانچہ لوگوں سے پوچھتا رہتا تھا کہ اس فن کا کون بڑا قدردان ہے،

ابوالمظفر چغانی اس زمانہ میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا، اور نہایت فیاض طبع اور قدردان سخن تھا، فرخی اسکی فیاضی اور قدردانی کا شہرہ سنکر چغان میں آیا، چنانچہ ایک قصیدہ کی ابتدا اس واقعہ سے کی ہے،

باکاروانِ حلّہ برفتم زسیستاں   باحلّۂ تنیدہ زدل بافتہ زجاں

ابوالمظفر کو گھوڑوں سے بہت شوق تھا، اور بڑے اہتمام سے انکی پرداخت و تربیت کرتا تھا، اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیڑے ہمیشہ چراگاہ میں رہتے تھے، سال میں ایک دفعہ ان بچھیروں کا جائزہ لیتا تھا، اور ان کو داغ کرتا تھا، فرخی جب بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابوالمظفر داغگاہ میں گیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے عمید اسعد جو ابوالمظفر کا مختارِ کل تھا، موجود تھا، فرخی اسکی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی کہ شاعر ہوں، عمید نے نظر اٹھا کر دیکھا تو فرخی کے چہرہ مہرہ ہیئت وضع قطع کسی چیز کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، بھدا ڈیل ڈول، ڈھیلا ڈھالا کرتا جس کے دونوں طرف چاک، سر پر بڑا سا پگڑ، سخت متعجب ہوا، تاہم حسنِ اخلاق کے لحاظ سے کہا کہ میں تمکو امیر کے دربار میں لے چلونگا، لیکن پہلے داغگاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ لاؤ، اسکے ساتھ داغگاہ کی صورت کا نقشہ کھینچکر دکھایا کہ کوسوں تک سبزہ زار ہوتا ہی، جابجا چشمے بہتے ہیں، بے تکلف احباب مل بیٹھتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں شراب پیتے جاتے ہیں، بادشاہ ایک ہاتھ میں پیالہ دوسرے میں کمند لیکر بیٹھتا ہے، شراب پیا جاتا ہی، اور لوگوں کو گھوڑے انعام دیا جاتا ہے،

فرخی نے رات بھر میں قصیدہ تیار کرکے صبح کو عمید کے سامنے پڑھا،

چوں پرند نیلگوں بررُوے پوشد مرغزار	پرنیانِ ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک راچوں نافِ آہو مشک زاید بیقیاس	بید راچوں پرطوطی برگ روید بے شمار
دوش وقت نیمشب بوے بہار آورد باد	حبذا باد شمال و فرخا بوے بہار
باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستیں	باغ گوئی لعبتانِ جلوہ دارد درکنار

نسترن لولوے بیضا دارد اندر مرسلہ　　　ارغواں لعلِ بدخشاں دارد اندر گوشوار

باغ بوقلموں لباس و شاخ بوقلموں نمائے　　　آب مروارید گوں و ابر مروارید بار

داغگاہِ شہریار اکنوں چناں خرم شود　　　کاندرو از خرمی خیرہ بماند روزگار

سبزہ اندر سبزہ بینی چوں سپہر اندر سپہر　　　خیمہ اندر خیمہ بینی چوں حصار اندر حصار

ہر کجا خیمہ است خفتہ عاشقے با دوست مست　　　ہر کجا سبزہ است شاداں یارے از دیدار یار

سبزہ ہا با بانگ چنگ مطرباں چرب دست　　　خیمہا با بانگ نوش ساقیانِ مے گسار

عاشقاں بوس و کنار و نیکواں ناز و عتاب　　　مطرباں رود و سرود و خفتگاں خواب و خمار

بر در پردہ سرائے خسروِ پیروز بخت　　　از پے داغ آتشے افروختہ خورشید وار

داغہا چوں شاخہائے بسّد یاقوت رنگ　　　ہر یکے چوں ناردانہ گشتہ اندر زیر نار

ریدکانِ خواب نادیدہ مصاف اندر مصاف　　　مرکبانِ داغ ناکردہ قطار اندر قطار

روئے ہاموں سبزہ چوں گردونِ ناپیدا کراں　　　روئے صحرا سادہ چوں دریائے ناپیدا کنار

اندراں دریا سماری واں سماری جانور　　　اندریں گردوں ستارہ واں ستارہ بیمدار

خسروِ فرخ سیر بر بارہ، دریا گذر　　　با کمند اندر میان دشت چوں اسفندیار

گردنِ ہر مرکبے چوں گردنِ قمری بطوق　　　از کمند شہریارِ شہرگیرِ شہردار

ہر کرا اندر کمند شصت بازی، درفگند　　　گشت نامش بر سرین و شانہ و رویش نگار

روز یک نیمہ کمند و مرکبان تیز تگ　　　نیم دیگر مطربان و بادۂ نوشیں گوار

عمید نے فرخی کو ساتھ لیا، اور ابو المظفر کے پاس جا کر اِس تقریب سے پیش کیا کہ دقیقی

کے بعد آج تک اس پایہ کا شاعر نہیں پیدا ہوا، یہ کہکر سارا واقعہ بیان کیا، ابوالمظفر نے فرخی کو دربار میں مناسب موقع پر جگہ دی، شراب کا دور چل رہا تھا، دو تین دور ہوچکے تو فرخی اٹھا، اور درد آمیز لہجہ میں یہ قصیدہ پڑھا ع باکاروانِ حلّہ بر فتم ز سیستان، ابوالمظفر خود شاعر تھا، حد سے زیادہ مسرور ہوا، اور فرخی سے کہا کہ ہزار کمیت بچھیرے سامنے ہیں، جس قدر تم سے پکڑے جاسکیں سب تمہارے ہیں، فرخی شراب سے بدمست تھا فوراً اٹھا، دستار سر سے پھینک بچھیروں کی قطار میں گھس گیا، وہ بھاگ کر ادھر ادھر پھیل گیے، فرخی ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، تھک کر چور ہو گیا، اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا، صبح کو دن چڑھے اٹھا، ابوالمظفر نے صبح کی نماز سے فارغ ہو کر فرخی کو دربار میں طلب کیا، اور اسپ خاصہ، ایک خیمہ، تین شتر، پانچ غلام، اور پہننے کے کپڑے انعام دیئے، دریافت سے معلوم ہوا کہ فرخی نے جس گلہ پہ ہاتھ ڈالا تھا، اس میں بیالیس بچھیرے تھے، ابوالمظفر نے وہ بھی انعام میں دے دیئے، چند روز کے بعد فرخی بڑے سر و سامان سے سلطان محمود کے دربار میں پہونچا، سلطان نے نہایت قدردانی کی اور شعرائے خاص میں داخل کیا[1]، ایک موقع پر اسپ خاصہ عنایت کیا، تو فرخی نے یہ اشعار شکر گذاری میں لکھے،

اسپے کہ چناں شاہ وہد اسپ نباشد ‏ ‏ ‏ ‏ تاجے بود آراستہ از لولوے شہوار

---

[1] یہ تمام واقعہ اگرچہ تمام تذکروں میں منقول ہے لیکن سب سے زیادہ تفصیل چار مقالہ میں ہے، اور ہم نے گویا اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے،

دشمن کہ بریں ابلقِ رہوار مرا دید ‌‌‌‌‌‌‌‌ بے صبر شد و کرد غمِ خویش پدیدار

اس وقت تک باوجود تقرب اور منصب ندامت کے فرخی کو دربار میں کمربند باندھنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ یہ لباس امرائے فوج کے ساتھ مخصوص تھا، فرخی نے نہایت خوبی سے اس قصیدہ میں اس عہدہ کی آرزو کی ہے،

گفتا کہ بہ میران و بہ سرہنگان مانی ‌‌‌‌‌‌‌‌ امروز کلاہ و کمرت باید ناچار

گفتم کہ چہ دانی کہ شب تیرہ چہ زاید ‌‌‌‌‌‌‌‌ بشکیب و صبوری کن تا شب بہ نہد بار

من تنگدلی پیشہ نگیرم کہ بزرگاں ‌‌‌‌‌‌‌‌ کس را بہ بزرگی نرسانند بیک بار

یعنی دشمن نے مجھ سے کہا کہ اب تو تمہارا ٹھاٹھ امرا کا سا ہے، اب کمربند و کلاہ بھی ملنا چاہئے، میں نے کہا تجھکو کیا خبر ہے کہ کل کیا ہوگا؛ جس نے مجھکو اسپ خاصہ کے قابل سمجھا وہ اسکا مستحق بھی سمجھے گا، میں دل گرفتہ نہیں ہوتا کیونکہ سلاطین کا یہ دستور نہیں کہ کسی کو ایک دم سے بڑے رتبہ پر پہنچادیں، بالآخر فرخی کی دولت و جاہ کی یہ نوبت پہنچی کہ جب اسکی سواری نکلتی تھی تو بیس زریں کمر غلام رکاب میں چلتے تھے،

ایاز جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا، فرخی کا نہایت قدردان تھا، اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا، ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہوا یہانتک کہ فرخی کا دربار بند کر دیا، فرخی نے متعدد قصیدے معذرت میں لکھے، بالآخر سلطان صاف ہوگیا، اور فرخی بدستور دربار میں جانے آنے لگا،[1]

---

[1] مجمع الفصحاء،

اس زمانہ کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے، کہ شعرا محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے، اس میں علانیہ ایاز کے حسن و معشوقی کا ذکر کرتے تھے اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا، فرخی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

امیر جنگجو ایاز او یماق،	دل و بازوے خسرو روز بیکار
زنانِ پارسا از شوق گردند	بہ کابین کردنی او را خریدار
نہ برخیرہ بدو دل داد محمود	دلِ محمود را بازی مپندار
جز او در پیش سلطان نیز کس بود	جز او سلطان غلاماں داشت بسیار
اگر چوں میر یک تن بود آنجا	نہ چندیں بد مرا و را گرم بازار

عضاری نے محمود کی فرمایش سے ایاز کی تعریف میں دو شعر لکھکر پیش کئے تو محمود نے دو ہزار اشرفیاں انعام میں دلوائیں، چنانچہ عضاری ایک قصیدہ میں کہتا ہے،

مرا دو بیت بفرمود شہریارِ جہاں	بر آں صنوبرِ عنبر عذارِ مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم	برغمِ حاسد تیمار بد سگال نکال

فرخی نے صنائع و بدائع شعری میں ایک کتاب بھی لکھی جس کا ترجمان البلاغۃ ہے رشید الدین وطواط نے حدائق السحر میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "لغو کتاب ہے"، بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ ایران کے شعرا ابتدا ہی سے صنائع و بدائع کی طرف کیونکر مائل ہوئے، لیکن حقیقت میں یہ تعجب کی بات نہیں، شاعری کا جو نمونہ فارسی شعرا کے پیش نظر تھا وہ عربی شاعری تھی، عرب میں خود اس زمانہ میں صنائع و بدائع کی بدعت ایجاد ہو چکی

تھی، اور عبداللہ بن معتز کی کتاب البدیع جو اس فن کی پہلی کتاب تھی، گھر گھر پھیلی ہوئی تھی، تاہم فرخی کی سلامت روی دیکھو کہ اس نے صنائع و بدائع پر کتاب لکھی لیکن خود ان تکلفات سے آزاد ہے، فرخی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی،

کلام پر رائے

فرخی کا کلام کا عام جوہر، زبان کی صفائی، اور سلاست و روانی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں اُس نے زبان کو اس قدر صاف کر دیا کہ ہزار برس گذر چکے لیکن آج کی زبان معلوم ہوتی ہے، قاآنی کا بڑا اعجاز یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قصائد میں ہر قسم کے واقعات اس طرح بے تکلف ادا کرتا جاتا ہے گویا دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں، فرخی سے اس کا موازنہ کرو، صاف نظر آئیگا کہ جو بات قاآنی کو ہزار برس کے بعد حاصل ہوئی فرخی کو اس وقت حاصل تھی، رمضان اور عید کے ذکر میں قاآنی کا ایک مشہور قصیدہ ہے،

دلبرا ہیچ خبر داری کاں ترک پسر / با من از ناز دگر بارچہ آورد بہ سر

بلب نوشیں آمد شب دوشیں ببرا / حلقہ بر در زد و برجستم و بکشودم در

گفت قاآنیکا! تا کے خسپی بہ سرا / خیز کز روزہ شد آزاد جہانی یکروند

غالباً مست چناں خفتہ اندر رمضاں / کز مہ روزہ و از روزہ ترا نیست خبر

گفتم اے ترک دلآرام مگر باز آمد / رمضان آں مہ شاہد کش و زاہد پرور

گفت آرے رمضاں مرد و گوید کہ بہ خلق / رحم از بار خدا داد ہم و از پیغمبر

وقت آں آمد کاں واعظک انبعد نماز / ہیچو بوزینہ بہ یکبار جہد از منبر

اسی بحر و قافیہ میں فرخی کا قصیدہ دیکھو،

رمضاں رفت و رہے دور گرفت اندر بر　　خنک آں کس رمضاں را بہ سزا برد بسر

بس گرامی بود ایں ماہ و لیکن چہ کنم　　رفتنی رفتہ بہ و روے نہادہ بہ سفر،

رمضاں گر بشد از راہ فراز آمد عید　　عید فرخندہ ز ماہِ رمضاں نیکوتر،

گاہ آں آمد کز شادی پر گردد دل　　وقت آں آمد کز بادہ گراں گردد سر

بادۂ روشن و آسودہ و صافی چو گلاب　　ساقی دلبر و شایستہ و شیریں چو شکر

مطربا آں غزلِ نغز دلاویز بیار　　ور نہ دانی بشنو تا غزلِ گویم تر

اے دریغا دلِ من کاں صنمِ سیمیں بر　　دلِ من برد و مرا از دلِ او نیست خبر

او ولے داشت گرامی و دلِ دیگر یافت　　کاشکے من دلکے یافتمی نیز دگر،

اسی بحر اور قافیہ میں اس کا ایک اور قصیدہ ہے، جو سراپا محاورہ اور روزمرہ ہے،

ترک بت روے من از خواب گراں وارد سر　　دوش مے دادہ است از اول شب تا سحر

میرا بت چہرہ معشوق نیند سے سرگراں ہے،　　کل شام سے صبح تک شراب پلاتا رہا ہے

من بچشم او را دو بار نمودم کہ بخسپ　　او ہمی گفت بسر تا برم ایں دور بسر

میں نے دو دفعہ آنکھ سے اشارہ کیا کہ سو رہو　　لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ یہ دور تو ختم ہونے دو

شب بسر برد بہ مے دادن و ننشست و نخفت　　دل من جست کہ ننشست و نخفت آں دلبر

ساری رات شراب پلانے میں گذاری نہ بیٹھا نہ سویا　　یہ میری خاطر داری تھی کہ سویا نہیں اور کھڑا رہا

حیلہ سازد کہ می افزوں خورد از نوبت خویش	ور تواند بخورد نوبت یاران دگر ،
چالاکی کرکے چاہتا ہو کہ اپنے حصہ سے زیادہ پی لے	اور اسکے امکان میں ہو تو اوروں کا حصہ بھی اڑالے
کیست آں کو؟ ندہد دل بچنیں خدمت دوست	کیست آں کو؟ نکشد بار چنیں خدمت گر

مدح کی تشبیب میں فتوحات کا ذکر کرتا ہے،

خسرو ما بہ شکار ملکان تاختہ بود	ما ز اندیشۂ او خستہ دل و خستہ جگر
خسرو از راہ در آمد با نہمت کام	ملک از جنگ عراق آمد با فتح و ظفر
قلعہ ہا کندہ و بکشادہ بہر شہر سپاہ	جنگہا کردہ و بنمودہ بہر جائے ہنر

دیگر

اے پسر! گر دلِ من کردہ ہمی خواہی شاد	از پس بادہ بمن بوسہ ہمی باید داد
نقل با بوسہ بود، بادہ دہی نقل بدہ	دیر گاہ است کہ ایں رسم نہاد آں کہ نہاد
گر ہمی گوئی بوس از دگرے نیز بخواہ	تو مرا از دگراں بردہ اے حور نژاد

یہ بھی فرخی کے خصوصیات میں ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف یا کسی واقعہ کی حالت اور کیفیت بیان کرتا ہے، تو اُس کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے، ایک قصیدہ میں مجلس عیش کی خیالی تصویر کھینچی ہے،

سرو ساقی و ماہ رود نواز	پردہ بستہ در رہ شہناز
باجا	وطن، ایک راگنی کا نام ہے
زخمہ رود زن نہ سست و نہ تیز	زلف ساقی نہ کوتہ و نہ دراز
یعنی سر نہ بہت اونچے نہ بہت نیچے	
مجلسے خوب خسروانی وار	از سخن چین، تہی و از غماز
بادشاہانہ	
بوستانے ز لالہ و سوسن	ہمچو روئے تدرو و سینۂ باز

دوستاں مساعد و یک دل | کہ تواں گفت پیش ایشاں راز
ماہ روے نشاندہ اندر پیش | خوش زبان و موافق و دمساز
جعد او بر پرند کشتی گیر، | زلف او بر حریر چوگاں باز
زلف یعنی چہرہ
بادہ چوں گلاب و شن و تلخ | ماندہ در خم ز گاہِ آدم باز
وقت
از چنیں مجلس و چنیں بادہ | ہیچ زاہد مراند ارد باز

سلطان محمود نے ایک باغ بڑے سرو سامان سے تیار کرایا تھا، گلہاے رنگ رنگ کے تختہ زار، جا بجا جدولیں، دو طرفہ سرو و شمشاد، ایک طرف مصنوعی خوش نما جھیل اس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں کانوں میں موتی کے آویزے پہنے پیرتی پھرتی تھیں، تصویر خانہ میں محمود کی مجسم تصویریں، کہیں برچھا ہاتھ میں لئے ہوے شکار کھیل رہا ہے، کہیں بزمِ عیش میں بیٹھا ہے اور شراب کا دور چل رہا ہے، فرخی اس باغ کا نقشہ دکھاتا ہے،

بہ فرخندہ فال و بہ فرخندہ اختر | زنو باغ میخواست شاہِ مظفر
درو مسکنِ ماہرویانِ مجلس | درو خانہ شیر گیرانِ لشکر
کجا جاے بزم است گلہاے بیحد | کجا جاے صید است مرغانِ بیمر
انجم | بے شمار
رواں گرد بر گرد رعنا درختاں | تذرواں، آموختہ مادہ و نر
یکے کاخ شاہانہ اندر میانش | سرِ کنگرہ برکنارِ دو پیکر
بہ کاخ اندروں صفہاے مصفا | در صفہا ساختہ سوے منظر

یکے ہمچو دیبائے چینی منقّش — یکے ہمچو ارژنگ مانی مصوّر

نگارندہ در چشمہ جام مصوّر — شہ شرق را اندراں کاخ پیکر

بہ یکجائے در صید در دشت و بیشہ — بہ یک جائے در بزم بر دستِ ساغر (سلطان محمود)

ازاں کاخ فرخ چو اندر گذشتی (تیزی) — یکے رود (نہر) آب اندرو ہمچو شکر

نہ چرخ است لیکن اجزاے او چوں ستارہ — نہ ابرست لیکن آوائے (آواز) او ہمچو تندر

اگر بگذرد بر سرش مرغ وحشی — بیالاید اندر ہوا مرغ را پر

بدخشیاں بہ بلغ اندراں تیز رودے (نہر) — یکے ژرف دریا مراں را برابر

بدو اندراں ماہیاں چوں عروساں — بگوش اندروں پُر گہر حلقۂ زر

مکانے برآوردہ پہلوے دریا — بداں تا براں می خورد شاہ صفدر

یمینِ دُوَل شاہ محمود غازی — امینِ مِلل خسرو بندہ پرور

ابوالمظفر چغانی کے دربار میں جب اس نے جانا چاہا ہے تو راہ میں بہت صعوبتیں پیش آئیں، قصیدہ میں تمام حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں، اور دیکھو مدح کی تمہید کا پہلو کس خوبصورتی سے پیدا کیا ہے،

رخے صبح و شبے تاریک تیرہ — ہوا چوں قیر و زہ ہاموں مقیّر

ہوا اندرو دو رخسارہ بدودہ — سپہر آراستہ چہرہ بہ گوہر

گماں بردی کہ باد اندر پراگند (سیاہی) — بروئے سبز دریا برگ عبہر

مجرہ (کہکشاں) چوں بہ دریا (رود نیل) راہ موسے — کہ اندر قعر (یعنی آسمان) او بگذشت لشکر (یعنی ستارے)

زمانے رفت سر بر زد مہ از کوه ۔۔۔ برنگ روے مہجوراں مزعفر

بہ ریگ اندر ہمی شد بارہ تازاں ۔۔۔ چو در غرقاب مرد آشنا (تیراک) را

تکم بالاں (گھوڑا) بہ ہاموں در ہمی رفت ۔۔۔ شده ہاموں بزیر آں مقعر

دمنده اژدہاے پیشیم آمد ۔۔۔ خروشان و بے[1] آرام و زمیں در

گرفتہ دامن خاور (مشرق) بدنبال (یعنی دریا) ۔۔۔ نہاده بر کرانِ باختر سر

بہ بارانِ بہاران گشتہ فربہ ۔۔۔ بگرماے حزیراں (مہینہ کا نام) گشتہ (بچھم) لاغر

بدیح شاه بر جیحوں بخواندم ۔۔۔ برآمد بانگ از آب الله اکبر

کہ من شاگرد کف را دادیم ۔۔۔ کہ تو مدحش ہمی برخوانی از بر

بفر شاه از جیحوں (بیابانی) گذشتم ۔۔۔ یکے موے از تنِ من ناشده تر

وزاں جا تا بدیں درگاه گفتی ۔۔۔ کشادستند مر فردوس را در

ہمہ بالا پر از دیباے رومی ۔۔۔ ہمہ پستی پر از کالاے ششتر (نام شہر)

تو گفتی ہیکل (بلندی) زر دشت گشتہ ست ۔۔۔ ز بس لالہ ہمہ صحرا سراسر

فرخی نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی، اس سے پہلے بھی یہ صفت موجود تھی؛ لیکن سینکڑوں گوناگوں واقعات کو نہایت بے تکلفی اور برجستگی سے ادا کر کے اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاہراه قائم کر دی، اور آینده نسلوں کے لئے راستہ صاف کر دیا، اکثر قصیدوں میں فتوحات کے حالات لکھتا ہے؛ اور معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] بے کی ی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ قدما کی زبان ہے۔

که ایک مؤرخ بے کم و کاست ٹھیک ٹھیک حالات لکھتا جاتا ہے۔ سومنات کی فتح
میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں ایک ایک مقام کا نام اور اُس کا حال بیان کیا ہے،

گمان که برد؟ که هرگز کسے ز راه طراز
به سومنات برد لشکر و چنیں لشکر

یہ کس کو خیال تھا کہ کوئی شخص طراز کی راہ سے
سومنات پر فوج لیجا سکتا ہے اور فوج بھی ایسی فوج

هوائے آں و دژم و باد آں چو دود جحیم
زمین آں سیه و خاک آں چو خاکستر

راستہ میں ہوا ایسی خراب جیسے دوزخ کا دھواں
زمین بالکل سیاہ اور خاک جیسے راکھ

همه درخت و میان درخت خار کشن
نه خار بلکه سنان خلنده و خنجر

تمام جھاڑیاں اور جھاڑیوں کے کانٹے
کانٹے نہیں بلکہ چبھنے والی برچھیاں اور خنجر

نه مرد را سر آں کاندراں نهادے پے
نه مرغ را دل آں وازاں کشادے پر

نہ آدمی کو یہ جرأت ہوتی تھی کہ قدم رکھے
نہ پرند کو یہ ہمت ہوتی تھی کہ اُڑ سکے،

عجب تر اینکه ملک را همی چنیں گفتند
که اندریں ره مار دو سر بود بیمر

سب سے بڑھکر عجیب بات یہ کہ لوگوں نے بادشاہ سے کہا تھا
کہ اس راہ میں دو مونہے سانپ بے شمار ہیں

به شب چو خفته بود مرد سر بر آرد مار
همی کشد نفس خفته تا بر آید خور

آدمی جب رات کو سو جاتا ہے تو یہ سانپ نکلتے ہیں
اور دھوپ نکلنے تک پھنکار مارتے ہیں

چو خور بر آید و گرمی به مرد خفته رسید
بیک نه گردد ازاں خواب تا گه محشر

جب آفتاب نکل آتا ہے اور آدمی کے بدن کو گرمی پہنچتی ہے
تو آدمی ٹھنڈا ہو کر رہجاتا ہے اور قیامت تک اٹھ نہیں سکتا

بدیں درشتی و زشتی رہے که گردم یاد
گذشت شاه بتوفیق خالق اکبر

ایسے سخت اور خراب استہ سے جس کا میں نے بیان کیا ۔ بادشاہ خدا کی توفیق سے گذر گیا

بزدز و بہر پس ماندگان و گم شدگان ۔ میانِ بادیہ ہا حوضہاے چوں کوثر

پیچھے رہ جانے والوں کے لئے ۔ جنگل میں حوض تیار کرا دئے تھے

بداں رہ اندر چنیں حصار و شہر بزرگ ۔ خراب کرد، وکند اصل ہر یک از بن و بر

سینکڑوں قلعے اور شہر جو راہ میں پڑے ۔ برباد کر دیئے، اور انکی جڑ کھود کے پھینک دی

نخست لار دہ کز روے برج و بارۂ او ۔ چو کوہ کوہ فرو ریخت آہن و مرمر

پہلا قلعہ لاردہ تھا جس کے برج اور دیوار سے ۔ پہاڑوں کے برابر لوہا اور پتھر برستا تھا

چہ مندھر کہ در مندھر حوضے بود ۔ چنانکہ خیرہ شدے اندرو دو چشم فکر

اور مندھر کا کیا کہنا، جسمیں ایک ایسا حوض تھا ۔ جسکو دیکھکر عقل کی آنکھوں کو چکا چوند لگجاتی تھی

فراخ پہنا حوضے بہ صد ہزار عمل ۔ ہزار بتکدہ خرد گرد حوض اندر،

نہایت چوڑا حوض جسمیں ہزاروں کاریگریاں کام میں آئیں ۔ ایک ہزار چھوٹے چھوٹے بتخانے اسکے اندر تھے

یکے حصار قوی بر کرانِ شہر و درو ۔ ز بت پرستاں گرد آمدہ یکے محشر

شہر کے کنارے پر ایک قلعہ تھا، ۔ جس میں بت پرست ٹھٹ کے ٹھٹ اکٹھے تھے،

فریضہ ہر روز آں سنگ را بشستندے ۔ بہ آب گنگ و بہ شیر و بزعفران و شکر

اُس بت کو لازمی طور پر ہر روز ۔ گنگا کے پانی اور دودھ اور زعفران اور شکر سے دھوتے تھے

شکار میں قمرغہ کا طریقہ ایک مدت سے چلا آتا ہے، یعنی کسی بڑے جنگل میں جہاں کثرت سے شکاری جانور ہوتے تھے، چاروں طرف آدمیوں کی صفوں کو پھیلا کر، ایک

بڑا حلقہ قائم کر لیتے تھے، پھر حلقہ کو بتدریج چھوٹا کرتے جاتے تھے یہانتک کہ دو چار میل کی وسعت رہجاتی تھی، اور تمام جانور سمٹ کر اتنے ہی دور میں آجاتے تھے پھر ہر طرف سے اس پر حملے ہوتے تھے، اکثر مارے جاتے، بہت سے زندہ بھی گرفتار ہوتے، سلطان محمود بھی اس طریقہ سے اکثر شکار کھیلا کرتا تھا، فرخی نے ایک قصیدہ میں اسکا سماں دکھایا ہے۔

اے زجنگ آمدہ وروے نہادہ بہ شکار ۔۔۔ تیغ و تیر تو سیر نگر دیدہ زکار

ہر چہ در ایراں پرندہ ودد دامی بود ۔۔۔ ہمہ را گرد بہم کردی در یک دیوار

گر وایشاں پرہ بربستی مانند عقاب ۔۔۔ زاں بروں رفت ندانست یک از ہیچ کنار

در دوید ند سوے تو بہ قطار از سر کوہ ۔۔۔ باز گسترده در دامن کہ شاں بہ قطار

بامداداں ہمہ کہسار پر از وحشی بود ۔۔۔ شامگاہاں ہمہ پرداختہ بود از کہسار

در زمانے ہمہ آں دشت زخون دد و دام ۔۔۔ لعل کردے چو گلستانے ہنگام بہار

خواہمی من کہ بجا بیستے بہرام امروز ۔۔۔ تا بدیدے و بیاموختے از شاہ شکار

واقعہ نگاری کا اندازہ فرخی پر اس قدر غالب ہے کہ قصائد کی تشبیب میں جو در اصل غزل ہوتی ہے، یہ انداز قائم رہتا ہے، مثلاً ایک قصیدہ کی تشبیب میں لکھتا ہے،

دوش متواریک بہ وقت سحر ۔۔۔ اندر آمد بہ خیمہ آں دلبر

چنگ در بر گرفت و خوش بنواخت ۔۔۔ واز دو لب فرو فشاند شکر

پنج شش جام خورد و پر گل گشت ۔۔۔ روے آں ترے نیکواں یکسر

مست گشت و بہر خفتن ساخت ۔۔۔ خویشتن را کنار من بستر

زلفِ مشکیں بروے در پوشید | دستِ من زیر کرد و زلف زبر
زلف او را بدست بگرفتم | زنخ گرد او بدستِ دگر
راست گفتی، گرفته بُد چاکر | گوی و چوگان شہ بدست اندر

دیکھو تشبیب سے مدح کی تمہید کس خوبی سے پیدا کی ہے،

فرخی سے پہلے مرثیہ کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں، اور جس قدر ہیں معمولی درجہ کے ہیں، لیکن فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا، وہ نہ صرف پُر درد اور پُر تاثیر ہے، بلکہ اس فن کے تمام اُصول اور آئین اس سے قائم ہو سکتے ہیں،

مرثیہ گوئی کے بڑے اصول تین ہیں،

۱۔ ممدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے تاکہ اُس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اس پایہ کا شخص اُٹھ گیا،

۲۔ اسکے مرنے سے مُلک میں جو رنج و ماتم برپا ہے اس کا ذکر کیا جائے،

۳۔ اس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں جس سے یہ ثابت ہو کہ انتہائے وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ کہنے والے کو اس کے مرنے کی بھی خبر نہیں، اور وہ ابتک اسکو اسی طرح مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جس طرح زندگی میں کرتا تھا،

فرخی کے مرثیہ میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، اس کے ساتھ الفاظ، بندش اور طرز ادا اس قدر موثر ہے کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ہے،

شہر غزنیں نہ ہمان است کہ من دیدم پار | چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شد کار

غزنیں اب وہ نہیں ہے جو میں نے پار سال دیکھا تھا
اس سال کیا پیش آیا کہ وہ حالت بالکل بدل گئی

کو بہا بینم پُر شورش و سر تا سر کوے
ہمہ پر جوش و جوشن در و پُر خیل و سوار

دیکھتا ہوں کہ تمام گلیوں میں شور برپا اور اس سرے سے اس سرے تک
جوشن پوش گھوڑوں اور سواروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہیں

مہتران بینم بر روے زناں ہمچو زناں
چشمہا کردہ ز خوں نابہ برنگ گلنار

بڑے بڑے سردار عورتوں کیطرح منہ پیٹ رہے ہیں
اور انکی آنکھیں خون سے رنگین ہو گئی ہیں،

ملک امسال دگر باز نیامد ز غزا
دشمنے روے نہاد ست دریں شہر و دیار

شاید اس سال بادشاہ جہاد سے واپس نہیں آیا
اس وجہ سے ملک میں کوئی دشمن آپہنچا ہے؟

سیر مے خوردہ مگر دی، کہ بخفت ست امروز
دیر تر خاست مگر رنج رسیدش ز خمار

غالباً رات بہت شراب پی گیا، اسلئے ابتک سو رہا تھا
چونکہ خمار کی تکلیف ہے، اسلئے آج دیر میں اٹھیگا

خیز شاہا! کہ رسولان شہاں آمدہ اند
ہدیہا دارند و دادہ فراوان و نثار

اے بادشاہ اٹھ! بادشاہوں کے قاصد آئے ہیں
جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیے اور تحفے لائے ہیں،

کہ تواند؟ کہ برانگیزد ازیں خواب ترا
خفتنی خفتنی، کز خواب نگردی بیدار

کس کی طاقت ہے کہ تجھکو اس نیند سے جگا سکے
تو ایسی نیند سویا کہ اب پھر نہ جاگے گا،

خفتن بسیار اے خواجہ خوے تو نبود
ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار

اے آقا! دیر تک سونا تو تیری عادت نہ تھی
کسی نے اسی طرح تجھ کو سوتے نہیں دیکھا تھا

یکدمک بایدے در خانہ بایست نشست
تا بدیدندے روے تو عزیزان و تبار

ذرا دیر تو تجھکو دربار میں آکر بیٹھنا چاہیئے تھا
کہ عزیز اور قریب تیرا چہرہ دیکھ لیتے،

به حصار از فزع و بیم تو رفتند شهان | تو شها از فزع و بیم که رفتی به حصار؟
تیرے ڈر سے تو تمام سلاطین قلعوں میں بھاگ کر چھپ گئے | تو کس کے ڈر سے قلعہ میں بھاگ کر چھپا ہی
شعرا را به تو بازار برافروخته بود | رفتی و با تو به یکباره برفت آں بازار
تیرے دم سے شاعروں کا بازار گرم تھا | تو گیا، اور وہ بازار بھی جاتا رہا،

صنائع شاعری میں ایک چیز تلمیح یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا ایک لطیف صنعت ہے، فرخی اس صنعت کا استعمال نہایت خوبی سے کرتا ہے،

مشہور ہے کہ حضرت آدمؑ نے جب بہشت میں گیہوں کھا لیا تو ان کے بدن کے کپڑے خود بخود اتر گئے اور وہ بالکل برہنہ رہ گئے، فرخی نے اس واقعہ سے خزاں کی تعریف میں مضمون پیدا کیا،

مگر درخت شگوفہ گناہِ آدم کرد | کہ از لباس چو آدم ہمی شود عریاں

نوشیرواں نے زنجیر عدل قائم کی تھی، یعنی ایوانِ شاہی میں ایک زنجیر لٹکا دی تھی کہ جس کسی کو کچھ شکایت ہو وہ زنجیر آکر ہلا دے، زنجیر کے ہلنے کے ساتھ وہ کسی حالت میں ہوتا، باہر نکل آتا تھا، دیکھو فرخی اس سے مضمون پیدا کرتا ہے،

من چو مظلوماں، از سلسلہ نوشیرواں | اندر آویختہ زاں سلسلۂ زلفِ دراز

مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کے تخت پر بیٹھ کر سیر کیا کرتے تھے، فرخی نے اس سے تشبیہ کا کام لیا،

پے بازیِ گوے شد خسرو | بر یکے تازی اسپ کہ بیکرا

راست گفتی بہ باد بر جسم بود ‏ ‏ ‏ گر بود باد را ستام بہ زر

حضرت موسیٰؑ جب رودِ نیل پر پہنچے تو دریا بیچ میں سے پھٹ کر سیدھی سڑک نکل آئی جس سے تمام بنی اسرائیل پار اُتر گئے، فرخی کہکشاں کی تعریف میں کہتا ہے،

مجرّہ چوں بدریا راہ موسیٰ ‏ ‏ ‏ کہ اندر قعر او بگذشت لشکر

صنائع و بدائع، عارضِ سخن کے داغ ہیں تاہم چونکہ اس زمانہ میں اس کا رواج عام ہوچکا تھا، فرخی کے کلام میں بھی یہ داغ پائے جاتے ہیں، لیکن چنداں بدنما نہیں معلوم ہوتے، لف ونشر اور صنعت تقسیم کو ایک قصیدہ میں جمع کیا ہے،

در رگ و اندر تن و اندر دل و اندر دو چشم

خواب و صبر و روح و خواں را بے ما افتاد انقلاب

رنج دارد جاے خون رود دارد جاے روح

عشق دارد جاے صبر و آب دارد جاے خواب

ہشت چیز او برد از ہشت مایہ ہشت چیز

سال و مہ این ہشت چیزش را ہمین است اکتساب

حلم او سنگِ زمین و طبعِ او لطفِ ہوا

روے او دیدار ماہ و دستِ او جودِ سحاب

رسم او حسنِ بہار و لفظ او قدرِ شکر

خلقِ او بازار مشک و خوے او بوے گلاب

ل یعنی بربادا

ہشت چیزش را برابر یافتم با ہشت چیز
ہر یکے زاں ہشت سوے فضل او ردار د مآب
تیغ او را با قضا و تیر او را با قدر
اسپ او را با سپہر و خشت او را با شہاب
حزم او را با امان و عزم او را با ظفر
لفظ او را با قرآن و حفظ او را با کتاب

صنعتِ سوال و جواب،

بر بخیت کہ؟ گل سوری، چہ ریخت؟ برگ چرا؟
ز ہجر لالہ کجا رفت لالہ؟ شد پنہاں
ازاں چہ خیزد؟ دُرِّ و ازیں چہ خیزد؟ زر
سخا کہ ورزد؟ این و عطا کہ بخشد؟ آں،

فردوسی

حسن بن اسحاق بن شرف نام، اور فردوسیؔ تخلص تھا، دولت شاہ کا بیان ہے کہ کہیں کہیں وہ اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہے، مجالس المومنین میں بعض مؤرخوں کے حوالہ سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہے، وطن میں بھی اختلاف ہے، چہار مقالہ میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باژ نام ایک گاؤں تھا فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا، دیباچہ شاہنامہ میں گاؤں کا نام شاداب لکھا ہے، بہرحال اس قدر عموماً مسلم ہے کہ فردوسی کا وطن طوس کے اضلاع میں تھا، اور یہ وہی خرم صوبہ ہے جس کی خاک نے امام غزالی اور محقق طوسی پیدا کئے،

فردوسی کا وطن

سنہ ولادت معلوم نہیں، البتہ سال وفات ۴۱۱ھ ہے، اور چونکہ عمر کم از کم ۸۰ برس کی تھی جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے،

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد — امیدم بہ یکبارہ برباد شد

[1] فردوسی کا حال تمام تذکروں میں بہ تفصیل مذکور ہے، لیکن سب میں باہم سخت اختلاف ہے، ان میں سب سے زیادہ قابل اعتبار چہار مقالہ ہے، جس کا مصنف خود نامور شاعر اور فردوسی سے قریب العہد ہے، تاہم اس میں بھی سخت غلطیاں ہیں، تیمور کے پوتے بایسنقر نے فضلا سے شاہنامہ پر جو دیباچہ لکھوایا تھا، اس میں فردوسی کی مفصل سوانح عمری ہے، لیکن بعض واقعات ایسے لغو لکھے ہیں کہ اعتبار اٹھ جاتا ہے، دولت شاہ سمرقندی نے بھی کسی قدر تفصیل سے حالات لکھے ہیں، اور وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں، عربی مصنفین میں سے صرف قزوینی نے آثار البلاد میں اس کا حال لکھا ہے، میں نے ان سب میں سے واقعات لئے ہیں، لیکن جا بجا ان کی غلطیوں کی بھی تصریح کر دی ہے،

اس لئے سالِ ولادت تقریباً ۳۲۹ھ سمجھنا چاہئے،

فردوسی کی ولادت

فردوسی جب پیدا ہوا تو اس کے باپ نے خواب میں دیکھا کہ نوزائیدہ بچے نے کوٹھے پر چڑھ کر نعرہ مارا، اور ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں، صبح کو جا کر نجیب الدین سے جو اُس زمانہ کے مشہور معبّر تھے، تعبیر پوچھی، اُنھوں نے کہا "یہ لڑکا شاعر ہوگا، اور اس کی شاعری کا غلغلہ تمام عالم میں پھیلے گا، سنِ رشد کو پہنچکر تحصیلِ علوم میں مشغول ہوا اور تمام درسی علوم حاصل کئے، چونکہ آبائی پیشہ زمینداری تھا، اور جس گاؤں میں سکونت تھی خود اسکی ملک میں تھا، اسلئے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا، وہ اطمینان کے ساتھ علمی مشغلوں میں بسر کرتا تھا، اور کتب بینی کیا کرتا تھا،

شاہنامہ کی ابتدا اور دربار میں رسائی

یہ واقعہ جس قدر قطعی ہے اسی قدر اس کی تفصیل میں اختلاف ہے، عام روایت یہ ہے کہ فردوسی دادرسی کیلئے محمود کے دربار میں گیا، یہاں اسکی شاعری کا جوہر کھلا اور شاہنامہ کی تصنیف پر مامور ہوا، لیکن یہ قطعاً غلط ہے، فردوسی نے خود بیان کیا ہے کہ شاہنامہ کی تصنیف میں ۳۵ برس صرف ہوئے،

سی و پنج سال از سرائے سپنج	بسے رنج بردم بہ امیدِ گنج
چو بر باد دادند گنج مرا	نبُد حاصلے سی و پنج مرا

اور سلطان محمود کی کل مدتِ سلطنت ۳۱ برس ہے،

شاہنامہ کے دیباچہ میں فردوسی نے خود جو سببِ تصنیف بیان کیا ہے اُس سے

لہ چہار مقالہ ص۴۷،

بھی اس روایت کی تکذیب ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کے دربار میں پہنچنے سے بہت پہلے وہ شاہنامہ شروع کر چکا تھا، تفصیل ان واقعات کی شاہنامہ کے سبب تصنیف میں آگے آئیگی۔

شاہنامہ کی ابتدا

بہرحال اس قدر یقینی ہے کہ فردوسی نے وطن ہی میں شاہنامہ کی ابتدا کی، اور ابومنصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا، اسکی سرپرستی کی، ابومنصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل ارسلان خاں مقرر ہوا، چونکہ شاہنامہ کا اب ہر جگہ چرچا پھیلتا جاتا تھا، سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی، ارسلان خاں کے نام حکم پہنچا کہ فردوسی کو دربار میں بھیجدو، فردوسی نے پہلے تو انکار کیا، لیکن پھر شیخ معشوق کی پیشین گوئی یاد آئی، اسلئے راضی ہوگیا، اور طوس سے چل کر ہرات میں آیا، لیکن ادھر درباری اندازیاں شروع ہوگئیں، دربار کا میر منشی بدیع الدین دبیر تھا، اُسی نے عنصری سے کہا بادشاہ کو مدت سے شاہنامہ کی تصنیف کا خیال تھا، لیکن دربار کے شعراء میں سے کسی نے اس کی حامی نہیں بھری، اب اگر فردوسی سے اگر یہ کام بن آیا تو تمام شعرائے دربار کی آبرو خاک میں مل جائیگی، عنصری نے کہا بادشاہ سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ فردوسی کو الٹا پھیر دیجئے، لیکن اسکی اور تدبیر کر لی چاہئے، چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ یہاں کا قصد بے فائدہ ہے، سلطان کو یوں ہی ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا، لیکن اس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا، اسلئے حقیقت واقعہ سے آپ کو اطلاع دیدی گئی، فردوسی نے ہرات سے واپس جانا چاہا، لیکن سات

ۓ دیباچہ نویسوں نے عنصری کیساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے، لیکن رودکی اس سے پہلے ۳۰۴ھ میں مرچکا تھا۔

ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو، اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکر رنجی پیدا ہوئی، عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا، بدیع الدین ہی کے مشورہ سے لکھا تھا، اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً ادھر کا عزم کیجئے، عنصری نے جو لکھا، خود غرضی سے لکھا تھا، فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں، یہ اشعار بھی خط میں درج کئے،

بگوشم از سروشم بسے مژدہ ہاست | دلم گنج گوہر زبان اژدہاست
چہ سنجد بہ میزان من عنصری | گیا چوں کشد پیش گلبن سرے

غرض ہرات سے چل کر غزنین میں آیا اور ایک باغ کے قریب ٹھہرا، وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی، شہر میں جن لوگوں سے راہ ورسم تھی ان کو اپنے آنے کی اطلاع دی، چلتا پھرتا باغ میں جا نکلا، حسن اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا یعنی عنصری، فرخی، عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے، اور بادہ وجام کا دور چل رہا تھا، فردوسی ادھر جا نکلا، حریفوں نے اس کو مخل صحبت سمجھ کر روکنا چاہا، ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ آکر چلا جائیگا، عنصری نے کہا، یہ تہذیب اور آدمیت کے خلاف ہے، آخر طے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرع طرح کیا جائے، سب اس پر طبع آزمائی کریں، اگر یہ بھی مصرع لگائے تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ خود شرمندہ ہو کر اٹھ جائیگا،

عنصری نے ابتدا کی اور کہا ع "چوں عارض تو ماہ نباشد روشن"

شعرا کا معرکہ

فرخی نے کہا ع " مانند درخت گل نبود در گلشن "

عسجدی نے کہا ع " مژگانت ہمی گذر کند از جوشن "

قافیوں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہیں رہا تھا، فردوسی نے برجستہ کہا ع " مانند سنان گیو در جنگ پشن "

سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی، فردوسی نے تفصیل بیان کی، اُس وقت تو سب نے اس کو شریک صحبت کر لیا لیکن رشک و حسد ایشیائی قوموں کا خاصہ ہے، سب نے سازش کی کہ فردوسی دربار تک نہ پہنچنے پائے،

بعض روایتوں میں ہے کہ یہ مشاعرہ خود سلطان محمود کے دربار میں ہوا تھا، سلطان محمود کے ندیموں میں ماہک نام ایک شخص صاحب مذاق تھا، اُس سے یہیں باغ میں ملاقات ہو گئی تھی، فردوسی کی شیریں زبانی اور قابلیت دیکھکر گرویدہ ہوا اور اپنے گھر میں لا کر رکھا، کھانے کے بعد فردوسی سے اس کا حال دریافت کیا، اس نے اپنی ساری داستان بیان کی،

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان نے شاہنامہ کی تصنیف کا حکم دیا تھا، اور سات شاعر یعنی عنصری، فرخی، زینبی، عسجدی، منجیک، چنگ زن خرمی، ابو بکر، اسکاف، ترمذی اس کام کے لئے انتخاب ہوئے تھے،

ماہک نے فردوسی سے شاہنامہ کی تصنیف اور شعراء کے انتخاب کا ذکر کیا

[1] یہ دیباچہ شاہنامہ کی روایت ہے، دولت شاہ کا بیان ہے کہ اس امتحان کے بعد عنصری نے فردوسی کی تحسین کی، اور خود دربار شاہی میں اسکو لیجا کر پیش کیا،

فردوسی نے کہا میں بھی شعر کہتا ہوں موقع ہو تو دربار میں میرا بھی ذکر کر دینا، ماہک نے اسی دن دربار میں جا کر فردوسی کی تقریب کرنی چاہی لیکن موقع نہ ملا اس طرح ایک ہفتہ گذر گیا، ایک دن ماہک نے دربار سے آکر بیان کیا کہ آج تمام شعرا دربار میں حاضر تھے اور شاہنامہ کی مختلف داستانیں سنائی جا رہی تھیں، عنصری نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی تھی، جب یہ دو شعر پڑھے،

هر آنگه که تشنه شدی تو بخون / بیالودی این خنجر آبگون

زمانه بخون تو تشنه شود / بر اندام تو موی دشنه شود

دربار میں پہنچنے کی تقریب

تو سلطان محمود نے نہایت پسند کیا، اور حکم دیا کہ عنصری ہی اس خدمت کے لئے مقرر کیا جائے، فردوسی اُس وقت چپکا ہو رہا، اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی، رات کو جب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا عنصری سے پہلے شعرائے نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی ہے، چنانچہ خود میرے پاس ایک نظم موجود ہے جس کے آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت نہیں، یہ کہکر نظم حوالہ کی، سرنامہ تھا،

کنون خورد باید مے خوشگوار / که می بوے مشک آرد از جویبار

هوا پر خروش و زمین پر ز جوش / خنک آنکه دل شاد دارد به نوش

همه بوستان زیر برگ گل است / همه کوه پر لاله و سنبل است

ماہک نے سلطان محمود کی خدمت میں جا کر تمہید کے ساتھ پیش کی، محمود نے پوچھا کہ یہ جواہر کہاں سے ہاتھ آئے، ماہک نے فردوسی کا نام لیا، اس وقت طلبی ہوئی، محمود نے نام و نشان

پوچھا فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں، محمود نے اس کے حالات پوچھے، اور اسی سلسلہ میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہے، اور کس نے آباد کیا، فردوسی نے تمام واقعات بیان کئے محمود نے شعرائے سبعہ کو بلوایا اور فردوسی کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ رستم و سہراب کی داستان اسی نے نظم کی ہے فردوسی نے اس کے اشعار سنائے تو سب حیرت زدہ رہ گئے، محمود نے خلعت عطا کیا، شعراء نے تحسین کی صدا بلند کی عنصری نے بڑھ کر، فردوسی کے ہاتھ چوم لئے، اس زمانہ میں امردپرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، محمود نے فردوسی سے فرمائش کی کہ ایاز کے سبزہ و خط کی تعریف میں کچھ کہے، فردوسی نے برجستہ کہا،

بدیہہ گوئی کا امتحان

مست است بتا! چشم تو و تیر بدست | بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ، عذرش است | کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ زمست

یعنی معشوق کی آنکھیں مست اور تیر بکف ہیں، ان تیروں نے ہزاروں کے دل چھلنی کر دیئے ہیں، اس لئے ان سے بچنے کے لئے رخساروں نے زرہ پہن لی ہے (خط کو زرہ سے تشبیہ دی ہے) کیونکہ مست سے سبھی ڈرتے ہیں، خصوصاً جب اس کے ہاتھوں میں تیر ہو،

شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد ہوئی،

محمود نہایت محظوظ ہوا اور شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی، ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا کہ فردوسی کو دیوانِ شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ ہو، اور آلاتِ جنگ، اسلحہ عرب، شاہانِ عجم اور بہادروں اور

پہلوانوں کے مرقعوں اور تصویروں سے سجا دیا جائے، ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا، اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دیدی جایا کریں، لیکن فردوسی نے متفرق رقم سے انکار کیا، اور کہا کہ جب کتاب پوری ہو جائیگی تو ایک ساتھ لونگا،

فردوسی جب وطن میں تھا تو اکثر ایک چشمہ کے کنارے بیٹھا کرتا، اور آب رواں کی سیر سے لطف اٹھاتا، چشمہ کے اوپر بند تھا، جو برسات کے زمانہ میں ٹوٹ جاتا تھا، اور اس وجہ سے پانی گدلا ہو جاتا تھا، فردوسی کی طبیعت اس سے مکدر ہوتی تھی؛ قصد کیا کہ بند کو پختہ کرائے، لیکن اتنا مقدور نہ تھا، شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو نیت کی کہ جو کچھ صلہ ملے گا بند کی تیاری میں صرف کروں گا، یہ وجہ تھی کہ اُس نے شاہنامہ کا صلہ متفرق طور پر لینا پسند نہ کیا،

فردوسی نے متصل ۴ سال تک غزنین میں قیام کیا، اور شاہنامہ کی تصنیف میں مصروف رہا، پھر وطن گیا اور کئی برس رہ کر واپس آیا[1]، اس اثنا میں جو حصہ تیار ہو چکا تھا محمود کے حضور میں پیش کیا اور تحسین و آفریں کے صلے حاصل کئے،

اثنائے تصنیف میں بیٹے کا انتقال

شاہنامہ کی تصنیف کے بیسویں سال جب کہ اسکی عمر ۶۵ برس کی تھی، اس کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا، فردوسی کو سخت رنج ہوا، چنانچہ اس واقعہ کا ذکر شاہنامہ میں کیا ہے،

نگہ بہرہ گیرم از پند خویش — بہ اندیشم از مرگ فرزند خویش

[1] دولت شاہ،

زبدہا تو بودی مرا دستگیر | چرا راہ جستی نہ ہمراہ پیر
مگر ہمرہان جواں یافتی | کہ از پیش من تیز بشتافتی
جوان را چو شد سال برسی و ہفت | نہ بر آرزو یافت گیتی و رفت
ہمی بود ہموارہ با من درشت | بر آشفت و یکبار بنمود پشت
مرا شصت و پنج و ورا سی و ہفت | نپرسید ازیں پیر و تنہا برفت

علمی تاریخ کا یہ نہایت ناگوار واقعہ ہے کہ فردوسی کو اس کی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی، یعنی جب شاہنامہ تیار ہوا تو اس کو اشرفیوں کے بجاے روپے دلوائے گئے،

فردوسی کی ناکامی اور اُسکا سبب

یہ واقعہ عموماً مسلّم ہے، لیکن اسباب مختلف بیان کئے گئے ہیں، اور سب باہم متناقض ہیں،

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی رخ نہیں کیا، اس لئے اُس نے درا اندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہے، نظامی عروضی کا بیان ہے کہ دربار کا بڑا گروہ وزیر اعظم حسن میمندی کا مخالف تھا، اور چونکہ فردوسی کا مربی اور سرپرست وہی تھا، اس لئے اسکی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا، دیباچہ میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے تباہ کیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنیں اور اطراف و جوانب کے امرا فردوسی کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے، فردوسی بھی اشعار کے ذریعہ سے اُنکا شکریہ ادا کرتا تھا، حسن کو یہ ناگوار

معلوم ہوتا تھا، لیکن فردوسی کچھ پروا نہیں کرتا تھا، اور کہتا تھا،

من بندہ کز مبادی فطرت نبوده ام | مائل به مال هرگز و طامع بجاه نیز
سوے در وزیر چرا ملتفت شوم | چوں فارغم ز بارگه بادشاه نیز

حسن میمندی مذہبًا خارجی تھا اور فردوسی شیعہ اسلئے بھی اس نے فردوسی کی مخالفت کی، ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے[1]،

دیباچہ نویسوں نے ایک اور نکتہ بیان کیا ہے اور اس پر انکو ناز ہی، وہ یہ کہ فردوسی نے شاہنامہ میں جابجا شرافتِ نسب کو بڑی آب و تاب سے لکھا ہی، اور یہ سلطان محمود کو اس وجہ سے ناگوار ہوتا تھا کہ وہ غلام زادہ تھا، اس لئے شرافت کی خوبی پر زور دینا گویا در پردہ اس پر چوٹ تھی،

[1] سلطان محمود کی مدتِ حکومت میں تین شخصوں کو وزارت کا رتبہ ملا، سب سے پہلے فضل بن احمد اس منصب پر ممتاز ہوا، وہ ابتدا میں سامانی خاندان کا نائب میر منشی تھا، پھر سبکتگین کے دربار میں وزارت کے رتبہ پر پہنچا، سبکتگین کے بعد سلطان محمود نے اس کا عہدہ بحال رکھا، علم و فن سے عاری تھا لیکن مہمات سلطنت کے انتظام میں خداداد ملکہ رکھتا تھا، دس برس وزارت کرنے کے بعد سلطان محمود نے رقابت کی بنا پر معزول کر دیا، اس کے بعد حسن میمندی وزیر مقرر ہوا، اٹھارہ سال کے بعد وہ بھی معزول ہوا اور حسن بن محمد کو وزارت[2] کی سند ملی، فردوسی نے فضل بن احمد کی مدح شاہنامہ میں لکھی ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد کے دربار میں اسی نے فردوسی کی تقریب کی ہوگی، اور بالآخر جس نے محمود کو فردوسی کی ناکامی پر متوجہ کیا، وہ حسن بن محمد ہوگا،

[2] حبیب السیر میں ان وزراء کے حالات کسی قدر تفصیل سے مذکور ہیں،

تذکرہ نویسوں کا فیصلہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کے شیعہ پن کی وجہ سے اس کی قدردانی میں کمی کی، لیکن اولاً تو محمود کے دربار میں بہت سے شیعی علما و فضلا تھے جو نہایت قدر و عزت سے بسر کرتے تھے، ابوریحان بیرونی جو علانیہ شیعہ تھا محمود نے خود فرمان بھیج کر اُس کو بلایا تھا اور نہایت قدردانی کرتا تھا، دربار میں ہندو، عیسائی، یہودی ہر مذہب و ملت کے اہلِ کمال تھے، فردوسی نے کیا قصور کیا تھا،

دیباچہ میں ایک اور وجہ بیان کی ہے، اور وہ قرینِ قیاس ہے،

سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متعصب شیعہ تھے، (دیباچہ میں رافضی کا لفظ تھا جس کو ہم نے بدل دیا) اس خاندان کا تاجدار فخر الدولہ تھا، وہ فردوسی کا نہایت قدردان تھا، جب فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اس نے صلہ کے طور پر ہزار اشرفیاں بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائیگا، یہ خبر تمام غزنین میں پھیل گئی، محمود نے سنا تو اُس کو ناگوار گذرا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلاطینِ دیلم عموماً سخت متعصب شیعہ تھے، ۳۵۱ھ میں معز الدولہ دیلمی کے حکم سے بغداد کی تمام مسجدوں کی دیواروں پر یہ عبارت لکھی گئی، "امیر معاویہ اور غاصب فدک پر لعنت ہے" رات کو لوگوں نے یہ عبارت مٹا دی، معز الدولہ نے دوبارہ لکھنے کا حکم دیا، لیکن وزیر مہلبی نے رائے دی کہ صرف اس قدر لکھوا دیا جائے "ظالمینِ آلِ محمد پر لعنت ہے" البتہ معاویہ کا نام بہ تصریح لکھا جائے، چنانچہ ایسا ہی

حکم کی تعمیل ہوئی[1] یہ تعصب روز بروز بڑھتا گیا، سیوطی ۴۲۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:-

وفی ہذہ السنۃ وبعدہا غلا الرفض وفاد بمصر والشام والمغرب (کذا)

اس سنہ میں اور اس کے بعد مصر، شام، اور مشرق ومغرب میں رفض ابل پڑا،

فرقہ باطنیہ جو مسلمانوں کو چھپ چھپ کر قتل کرتا رہتا تھا، انکی بڑی جمعیت دیلمیوں ہی کے زیر حمایت تھی، چنانچہ جب ۴۲۰ھ میں سلطان محمود نے مجد الدولہ دیلمی کو گرفتار کیا تو باطنیوں کا ایک گروہ عظیم اس کے ساتھ تھا، ان اسباب سے محمود کو دیلمیوں کے ساتھ نہ صرف مذہبی بلکہ پولیٹکل دشمنی تھی، اس لئے وہ فردوسی کے ساتھ فخر الدولہ دیلمی کی خط وکتابت کو مصالح ملکی کے لحاظ سے بھی گوارا نہیں کرسکتا تھا،[2]

بہرحال وجہ کچھ ہو، واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدردانی کا حق ادا نہ کیا، فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامہ کا صلہ پہنچا، فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں، فردوسی نے بڑی بیتابی سے دستِ شوق بڑھایا، لیکن سونے کے پھول کے بجائے چاندی کے پھول تھے، فردوسی کے دل سے بیساختہ آہ نکلی، تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹادیں، اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ "میں نے یہ خونِ جگر ان سفید دانوں کے لئے نہیں کھایا تھا، ایاز نے محمود سے ساری کیفیت بیان کی، محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی، اور کہا کہ تیری دراندازی نے مجھ کو بدنام کر دیا،

---

۱ ابن الاثیر واقعات ۳۵۱ھ ۲ ایضاً واقعات ۴۲۰ھ،

میمندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیجدیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا، انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے، اس چبھتے ہوئے فقرہ نے محمود کے دل میں بھی اثر کیا، اور برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا، فردوسی کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا، صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر رکھدیا اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے،

چو در ملک سلطان کہ چرخش ستود ۔۔۔ بسے ہست ترسا و گبر و یہود

گرفتند در ظل عدلش قرار ۔۔۔ شدہ ایمن از گردشِ روزگار

چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ ۔۔۔ رہے را شمارد یکے زاں گروہ
غلام

سلطان محمود کو رحم آیا، اور اس کی تقصیر معاف کی،

سلطان محمود کی ہجو،

غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سربمہر دیا اور کہا کہ میرے جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا، فردوسی ہرات کو روانہ ہوا، محمود نے لفافہ کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے،

یکے بندگی کردم اے شہریار ۔۔۔ کہ ماند ز تو در جہاں یادگار

پے افگندم از نظم کاخ بلند ۔۔۔ کہ از باد و باراں نیابد گزند

بسے رنج بردم دریں سال سی ۔۔۔ عجم زندہ کردم بدیں پارسی

چو بر باد دادند گنجِ مرا ۔۔۔ نہ بُد حاصلے سی و پنج مرا

اگر شاہ را شاہ بودے پدر ۔۔۔ بسر بر نہادے مرا تاج زر

دگر مادرِ شاہ بانو بُدے،	مرا سیم و زر تا بزانو بُدے،
پرستار زادہ نیاید بکار	دگر چند دارد پدر شہریار
سرِ ناسزایاں برافراشتن	وز ایشاں اُمید بہی داشتن
سرِ رشتۂ خویش گم کردن است	بہ جیب اندروں مار پروردن است
درختے کہ تلخ است ویرا سرشت	گرش بر نشانی بہ باغ بہشت
ور از جوی خلدش بہ ہنگام آب	بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سرِ انجام گوہر بہ کار آورد	ہماں میوۂ تلخ بار آورد
ز بد اصل چشم بہی داشتن	بود خاک در دیدہ انباشتن
ازاں گفتم ایں بیتہاے بلند	کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا	بماند ہجا تا قیامت بجا

کلام کی جہانگیری دیکھو، محمود نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں، ملک کے ملک غارت کر دیئے، عالم کو زیر و زبر کر دیا، لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے آج تک قائم ہیں، اور قیامت تک نہیں مٹ سکتے،

فردوسی کا غزنیں سے نکل کر آوارہ پھرنا،

فردوسی غزنیں سے نکلا تو اس بے سروسامانی سے نکلا کہ ایک چادر اور عصا کے سوا، کچھ پاس نہ تھا، احباب اور قدر دانوں کی کمی نہ تھی لیکن معتوب شاہی کو کون پناہ دے سکتا تھا، تاہم ایاز نے یہ جرأت کی کہ جب فردوسی شہر سے باہر نکل گیا تو مخفی طور پر کچھ نقدی اور سامانِ سفر بھجوا دیا، فردوسی ہرات میں آیا اور اسمٰعیل وراق کے ہاں

مہمان ہوا، چونکہ سلطان محمود نے ہر طرف فرمان بھیجدیئے تھے کہ فردوسی جہاں ہاتھ آئے گرفتار کرکے بھیجدیا جائے چھ مہینے تک روپوش رہا، شاہی جاسوس ہرات میں آئے لیکن فردوسی کا پتہ نہ لگا سکے، اب اُس نے ہرات سے طوس کا رُخ کیا، طوس سے قہستان گیا، ناصر لک یہاں کا حاکم تھا، اسکو خبر ہوئی تو ندیمانِ خاص کو استقبال کے لئے بھیجا اور نہایت اخلاص کے ساتھ پیش آیا، فردوسی نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی جسمیں حاسدوں کی دراندازی، اپنی مظلومی اور سلطان محمود کی بدعہدی و ناقدردانی کا ذکر تھا،

سلطان محمود کی شکایت کے اشعار

بہ غزنیں مرا اگرچہ خوں شد جگر	ز بیدادِ آں شاہِ بیدادگر
کزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام	شنید از زمیں آسماں نالہ ام
ہمی خواستم تا فغاں ہا کنم	بہ گیتی از و داستاں ہا کنم
بگویم ز مادرش و ہم از پدرش	نہ ترسم بجز از خداوندِ عرش
چو دشمن نمیداند از دوست باز	بہ تیغِ زبانش کنم پوست باز
ولیکن ز فرمودۂ محتشم	ندانم کزیں پیش چوں سر کشم
فرستادم ار گفتہ داشتم	بہ نزدیکِ خود ہیچ نگذاشتم
اگر باشد ایں گفتہا ناصواب	بسوزاں در آتش بشوآں در آب
گزشتم ایا سرورِ نیک رائے	ازیں داوری تا بدیگر سرائے

سلہ چہار مقالہ،

رسد لطف یزداں بفریاد من | ستانند بہ محشر از و داد من

فردوسی نے مثنوی کے اشعار ناصر لک کو سنائے تو اُس نے سمجھایا کہ بدگوئی اہلِ کمال کی شان نہیں، میں لاکھ روپے ان اشعار کے معاوضہ میں دیتا ہوں، اشعار کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں، فردوسی نے منظور کیا، ناصر لک نے سلطان محمود کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ فردوسی کے حق میں بڑا ظلم ہوا،

فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا،

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریا است	چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست
چو غوطہ ہا زدم و اندرو ندیدم دُر	گناہ بختِ من ست ایں گناہ دریا نیست

اتفاق یہ کہ جس دن ناصر لک کا عریضہ پہنچا، سلطان نماز جمعہ پڑھنے کیلئے جامع مسجد میں آیا تھا، اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی، نہایت متاسف ہوا، مسجد سے آکر ناصر لک کا عریضہ دیکھا اور بھی مکدر ہوا، جن لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے اُن کو بلا کر سخت توبیخ کی کہ تم نے دنیا میں مجھکو بدنام کردیا،

ناصر لک نے گو فردوسی کی بہت کچھ خاطر مدارات کی تاہم سلطان محمود کے

---

[1] یہ دیباچہ کی روایت ہے، چہار مقالہ میں قہستان کے بجائے طبرستان اور ناصر لک کے بجائے سپہبد شیرزاد کا نام ہی، دولت شاہ نے طبرستان کے بجائے رستمدار لکھا ہی، طبرستان اور رستمدار در اصل ایک ہی ہیں لیکن سپہبد اور ناصر لک دو شخص ہیں، دولت شاہ نے ان میں سے ایک کو چھوڑ دیا ہے،

ڈر سے اپنے پاس نہ ٹھہرا سکا، فردوسی یہاں سے بھی نکلا اور مازندران میں آیا یہاں وہ شاہنامہ کی نظر ثانی میں مشغول ہوا،

مازندران کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانہ میں سپہبد فرماں روا تھا، اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بلایا، فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا، سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے، لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا، ایک گراں بہا صلہ بھیجکر کہلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہے، اسلیے میں آپکو ٹھہرا نہیں سکتا، آپ اور کہیں تشریف لے جائیے،

دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے کہ "فردوسی یہاں سے بغداد گیا خلیفہ عباسی نے اس کی بڑی قدر کی، فردوسی نے عربی میں قصیدے لکھ کر پیش کئے اور اہل بغداد کی فرمائش سے یوسف زلیخا لکھی، سلطان محمود کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو خلیفہ عباسی کو تہدید کا خط لکھا، کہ فردوسی کو فوراً یہاں بھیجدیجئے، ورنہ بغداد ہاتھیوں کے پاؤں کے نیچے ہوگا، وہاں سے تین حرف الف لام میم لکھ کر آئے کہ سورہ الم ترکیف کی طرف اشارہ تھا، لیکن یہ تمام بے سروپا مزخرفات ہیں،

ایک دفعہ سلطان محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آرہا تھا، راستہ میں دشمن کا قلعہ تھا، وہیں ٹھہر گیا، اور قاصد بھیجا کہ حاضر خدمت ہو کر اطاعت بجالائے دوسرے دن قاصد جواب لایا، لیکن ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ محمود نے وزیر اعظم

سے کہا کہ دیکھو کیا جواب لایا ہے،

وزیر نے برجستہ کہا،

اگر جز بکامِ من آید جواب | من و گرز و میدانِ افراسیاب

سلطان محمود نے تلافی مافات کا ارادہ کیا

محمود بھڑک اٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے؟ وزیر نے کہا اُس بدقسمت کا جس نے ۲۵ برس خونِ جگر پیا اور کچھ نہ حاصل ہوا[1]، محمود نے کہا مجھ کو سخت ندامت ہے، غزنیں پہنچکر یاد دلانا، غرض پایۂ تخت پر پہنچکر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے، ادھر شہر کے ایک دروازہ سے جس کا نام رودبار تھا صلہ پہنچا، اُدھر دوسرے دروازہ سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا،

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر | یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

طوس میں ایک واعظ صاحب تھے اُنھوں نے فتویٰ دیا کہ چونکہ فردوسی رافضی تھا، اس کا جنازہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا، ہر چند لوگوں نے منت سماجت کی لیکن بدنفس واعظ نے ایک نہ مانی، مجبوراً شہر کے باہر ایک باغ میں کہ فردوسی کی مِلک تھا، دفن کیا، سلطان محمود کو یہ خبر گذری تو حکم

---

[1] یہ واقعہ مختلف طریقوں سے مروی ہے، میں نے جو روایت لکھی ہے، نظامی سمرقندی سے مروی ہے اور اس لئے زیادہ معتبر ہے کہ اس نے سنہ ۵۱۲ھ میں امیر معزی (ملک الشعرا سلطان سنجر) سے سنی تھی اور امیر معزی سے میر عبدالرزاق نے بیان کی تھی، (دیکھو چہار مقالہ واقعات فردوسی)

دیا کہ واعظ شہر سے نکال دیا جائے۔

فردوسی نے اولاد ذکور نہیں چھوڑی تھی صرف ایک لڑکی تھی۔ شاہی صلہ اسکی خدمت میں پیش کیا گیا لیکن اُسکی بلند ہمتی نے گوارا نہ کیا کہ باپ جس چیز کی حسرت میں مرگیا اولاد اس سے تمتع اُٹھائے۔ سلطان محمود کو اسکی اطلاع دی گئی، حکم دیا کہ اشرفیاں امام ابوبکر اسحق کے حوالہ کی جائیں کہ اس سے فردوسی کے نام پر ایک کاروان سرائے بنادی جائے، ناصر خسرو نے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ۴۳۷ھ میں جب میں طوس میں پہنچا تو ایک بڑی کاروان سرا دیکھی۔ لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہے۔ فرہنگ رشیدی اور چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ اس کا نام چاہہ ہے، اور مرو اور نیشاپور کے راستہ میں ہے،

عام تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ فردوسی نے ۴۱۱ھ میں وفات پائی لیکن فردوسی نے شاہنامہ کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ شاہنامہ ۴۰۰ھ میں انجام کو پہنچا؛

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار — کہ گفتم من این نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ اسوقت اسکی عمر اسّی برس کی تھی،

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد — امیدم بہ یکبارہ برباد شد

شاہنامہ کے ختم ہونے کے بعد، وہ دو چار برس سے زیادہ زندہ نہیں

---

۵ چہار مقالہ۔

رہا، اس لئے اس کی وفات سنہ ۴۱۱ھ سے چند برس پہلے ہوئی ہوگی،

فردوسی کا مزار مدت تک آباد اور بوسہ گاہ عالم رہا، نظامی سمرقندی نے سنہ ۵۱۰ھ میں اس کی زیارت کی تھی، دولت شاہ نے لکھا ہے کہ آج اس کا مزار مرجع عام ہے، قاضی نوراللہ شوستری مجالس المومنین میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ خاں ازبک کی توجہ سے فردوسی کا مقبرہ معمور اور پر رونق ہے، عام لوگ عموماً اور شیعہ خصوصاً زیارت کو جاتے ہیں، میں نے بھی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے"!

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق | ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شاہنامہ

سنہ تصنیف
سبب تصنیف

کیا عجیب بات ہے، جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوتا ہے اسی قدر اکثر غلط اور بے سروپا ہوتا ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچکر اس کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا، اکثر تذکروں میں بھی یہی لکھا ہے، لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے،

فردوسی نے خاتمہ میں خود تصریح کی ہو کہ یہ کتاب سنہ ۴۰۰ھ میں تمام ہوئی،

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار | کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ پینتیس برس کتاب کی تصنیف میں صرف ہوئے

سی و پنج سال از سرائے سپنج | بسے رنج بردم بامید گنج

لے پانچ کو اسی میں ضرب دیں تو چار سو ہوتے ہیں،

اس بنا پر تصنیف کا آغاز ۳۶۵ھ سمجھنا چاہئے، اور چونکہ سلطان محمود ۳۸۸ھ میں تخت نشین ہوا، اس لئے اس کی تخت نشینی سے مدتوں پہلے شاہنامہ کی ابتدا ہو چکی تھی،

عام خیال یہ ہے کہ شاہنامہ سلطان محمود کی فرمایش سے لکھا گیا، لیکن یہ بھی محض غلط ہے، فردوسی نے خود سببِ تالیف لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکو صرف اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا مقصود تھا،

همی خواهم از داور یک خدای ۔۔۔ که چندان بمانم به گیتی به جای
که این نامهٔ شهریاران پیش ۔۔۔ به پیوندم از خوب گفتار خویش
بسے رنج بردم دریں سال سی ۔۔۔ عجم زنده کردم بدین پارسی
همه مرده از روزگار دراز ۔۔۔ شد از گفت من نام شان زنده باز
چو عیسیٰ من این مردگان را تمام ۔۔۔ سراسر همه زنده کردم بنام
پے افگندم از نظم کاخ بلند ۔۔۔ که از باد و باران نیابد گزند

تیسرے دفتر میں جہاں دقیقی کے اشعار نقل کئے ہیں، خاتمہ پر لکھتا ہے،

من این نامه فرخ گرفتم به فال ۔۔۔ همی رنج بردم به بسیار سال
ندیدم سرافراز بخشندهٔ ۔۔۔ به گاه کیان بر نشینندهٔ
سخن را نگهداشتم سال بست ۔۔۔ بدان تا سزاوار این گنج کیست
جهاندار محمود با فر و جود ۔۔۔ که اورا کند ماه و کیوان سجود

ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں پہنچنے سے بیس سال پہلے شاہنامہ شروع ہو چکا تھا،

دیباچہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آغازِ کتاب اس نے خود اپنے شوق سے کیا، قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، فردوسی فطرۃً شاعر تھا، اس کے ساتھ نسل کا مجوسی یعنی شاہانِ ایران کا ہم قوم تھا، دقیقی نے شاہنامہ کی جو بنیاد ڈالی تھی اور جس قدر شعر لکھ لئے تھے، اس کے چرچے ہر جگہ پھیل گئے تھے اور اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کتاب میں قبولیت کا کس قدر مادہ ہے، یہ اسباب اس بات کے لئے کافی تھے کہ فردوسی نے خود اپنے شوق سے شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن چونکہ ایک عظیم الشان کام تھا، اور اعانت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا، سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ تاریخ کا مستند سرمایہ ہاتھ آئے، حسنِ اتفاق یہ کہ فردوسی کے وطن ہی میں ایک شخص کے پاس یہ سرمایہ موجود تھا، اور وہ فردوسی کا مخلص دوست تھا، اسکو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے یہ کتاب لاکر فردوسی کو دی، چنانچہ فردوسی دیباچہ میں لکھتا ہے

بہ شہرم یکے مہربان دوست بود	تو گفتی کہ با من بیک پوست بود
مرا گفت خوب آمد ایں رائے تو	بہ نیکی خرامد مگر پائے تو
نوشتہ من ایں نامۂ پہلوے	بہ پیش تو آرم مگر نغنوی
شو ایں نامۂ خسرواں باز گوے	بدیں جوے نزد مہاں آبروے
چو آورد ایں نامہ نزدیک من	برافروخت ایں جانِ تاریک من

فردوسی اگرچہ جیسا کہ نظامی سمرقندی نے لکھا ہے رئیس زادہ اور خوش حال تھا تاہم جب اس نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو علم دوست امرا نے قدردانی کا اظہار کرنا چاہا لیکن منصور بن محمد نے جو طوس کا حاکم تھا ایسی فیاضی کا اظہار کیا، کہ فردوسی تمام لوگوں سے بے نیاز ہوگیا،

بدیں نامہ چوں دست کردم دراز ... یکے مہترے بود گردن فراز

جواں بود و از گوہر پہلواں ... خردمند و بیدار روشن رواں

مرا گفت کز من چہ آید ہمے ... کہ جانت سخن برگراید ہمے

بچیزے کہ باشد مرا دسترس ... بکوشم، نیازت نہ آرم بکس

شاہنامہ کے قدردان

افسوس کہ منصور چند روز کے بعد مرگیا، فردوسی نے اس کا بہت پرزور مرثیہ لکھا، حسین قتیب، علی دیلم، بودلف اور فضل بن احمد کا نام بھی فردوسی کے قدردانوں کی فہرست میں داخل ہے، نظامی سمرقندی نے لکھا ہے کہ حسین قتیب طوس کا عامل تھا، (غالباً منصور کے مرنے کے بعد مقرر ہوا ہوگا) اس نے فردوسی کے دیہات کی مالگذاری معاف کردی تھی[1]،

فضل بن احمد سلطان محمود کا وزیر تھا جس کے مرنے کے بعد حسن میمندی اس منصب پر ممتاز ہوا، فضل کا تذکرہ بھی فردوسی نے شاہنامہ میں کیا ہے،

نظامی عروضی کا بیان ہے کہ علی دیلمی شاہنامہ کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا،

[1] چہار مقالہ نظامی سمرقندی،

اور بو دلف راوی تھا یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا، اور جلسوں اور صحبتوں میں لوگوں
کو سناتا تھا، لیکن شاہنامہ میں فردوسی نے ان دونوں کا نام اس انداز سے لیا ہے جس سے
ظاہر ہوتا ہے، کہ فردوسی کے سرپرست اور مربی تھے، کاتب اور راوی نہ تھے،

ازاں نامور نامداران شہر — علی دیلم و بو دلف است بہر

بو دلف کی نسبت قاضی نور اللہ شوستری کا قیاس ہے کہ یہ وہ بو دلف ہے
جو ایک محتشم رئیس تھا، جس کے نام پر اسدی طوسی نے گشتاسپ نامہ لکھا ہے،
اور دیباچہ میں اسکی مدح و ثنا کی ہے،

ملک بو دلف شہریار زمین — جہاندار از آنی پاک دیں
بزرگی کہ با آسماں ہمسر است — زنسل براہیم پیغمبر است

خوش اعتقاد دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے، کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنے
کا ارادہ کیا تو شیخ محمد معشوق طوسی کی خدمت میں جو ایک مشہور صاحبدل تھے،
حاضر ہوا، اور ان سے اپنا خیال ظاہر کیا، اُنھوں نے کہا تم اس کام کو شروع
کرو، خدا تم کو کامیاب کریگا، فردوسی تو کامیاب نہیں ہوا، لیکن شاہنامہ کی
کامیابی میں کس کو شک ہو سکتا ہے،

شاہنامہ کا ماخذ

شاہنامہ کا تاریخی مواد

سرجان مالکم[2] صاحب اپنی تاریخ ص۲۵ میں لکھتے ہیں،

[1] سرجان مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں انگریزی سرکار کیطرف سے سفیر تھے اُنھوں نے ایران کی تاریخ قدیم جلد ۱

"قرنِ اوّل کے تمام مورخین لکھتے ہیں کہ چونکہ ایرانیوں نے عرب کے حملے کے روکنے میں نہایت پامردی دکھائی تھی، اس لئے پیروانِ اسلام اس قدر برافروختہ تھے کہ انھوں نے ایران کی تمام قومی یادگاروں کو برباد کر دیا، شہروں کو آگ لگا دی، آتشکدے برباد کر دیئے موبدوں کو قتل کرا دیا، ہر قسم کی کتابیں عموماً برباد کر دیں، کتبخانوں کے مالکوں کو قتل کرا دیا، یہ متعصب عرب قرآن کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے موبدوں کو مجوس کہتے تھے اور ان کو جادوگر سمجھتے تھے یونان اور روم کی کتابوں سے قیاس ہو سکتا ہے کہ اس طوفان میں ایران کی کس قدر کتابیں بچی ہونگی، قریباً چار سو برس گذر گئے اور کسی نے ایرانیوں کی تاریخ لکھنے پر توجہ نہیں کی، سب سے پہلی کوشش اسکے متعلق جو کی گئی وہ سامانیوں نے کی، مورخین کو اس میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ منصور ثانی نے ابتدا کی بعض کہتے ہیں کہ دقیقی نے شاہنامہ لکھنا اسمٰعیل کے زمانہ میں شروع کیا جو سلسلہ سامانیہ کا پہلا تاجدار تھا، غرض چونکہ سلاطین سامانی اپنے آپ کو بہرام چوبین کے خاندان سے سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا چاہا۔"

مالکم صاحب کی مستعصبانہ رائے

مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں رہے ہیں، فارسی زبان میں انکو پوری مہارت تھی، اسلامی تاریخ کی طرف خاص توجہ تھی ان سب باتوں کے ساتھ انکی تحقیقات کا یہ عالم ہے کہ اتنی لمبی چوڑی عبارت میں ایک حرف بھی صحیح زبان سے نہ نکلا۔

(بقیہ حاشیہ صلا) ایک کتاب انگریزی میں لکھی، مرزا حیرت ایرانی نے اسکا ترجمہ کیا جو بمبئی میں ۱۲۷۳ھ میں چھاپا گیا

مالکم صاحب کے تعصب کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں، البتہ تاریخی حیثیت سے یہ امر قابلِ بحث ہے کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنا چاہا تو ایران کا تاریخی ذخیرہ کس قدر موجود تھا، عام خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں علوم و فنون کی تدوین ۱۴۳ھ سے شروع ہوئی اور درحقیقت اسلامی علوم و فنون کے متعلق اس سے پہلے کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ غیر قوموں کے علوم و فنون کا ترجمہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا، ہشام بن عبدالملک جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا، اور جو سلاطین بنی امیہ کا گلِ سرسبد تھا، سب سے پہلے اس نے غیر قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ کی، اس کا میر منشی جبلہ بن سالم تھا، اس نے فارسی زبان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں، جن میں سے جنگ رستم و اسفندیار اور داستان بہرام چوبیں بھی تھی[1]، شاہانِ عجم کے علمی ذخیرے جو فتوحات میں ہاتھ آئے تھے، اُن میں ایک کتاب تاریخ تھی، یہ ایران کی نہایت مفصل اور مبسوط تاریخ تھی، جس میں سلطنتوں کے حالات کے ساتھ حکومت کے قواعد اور آئین، عہد بعہد کے علوم و فنون، تعمیرات وغیرہ کے مفصل حالات تھے، ایک خاص جدت یہ تھی کہ تمام سلاطین کی تصویریں بھی تھیں اور تصویروں میں اُنکی خاص وضع قطع، لباس، زیورات اور تمام خصوصیات کو بعینہ دکھایا تھا، ہشام نے اس کتاب کا ترجمہ کرایا، چنانچہ ۱۱۳ھ میں یہ ترجمہ طیار ہوا، مورخ مسعودی نے کتاب الاشراف[2] میں لکھا ہے کہ میں نے ۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر یہ

ایران کی قدیم تاریخیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں،

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۷ [2] کتاب مذکور مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۰۶،

کتابیں لکھی سلطنت فارس کے متعلق جس قدر کتابیں فارسی میں موجود ہیں یہ سب سے زیادہ مفصل ہے، دولت عباسیہ نے آغاز ہی سے ایران کے علوم و فنون کے ترجمہ کی طرف توجہ کی، ان میں سے تاریخی کتابیں حسب ذیل ہیں،

خدائی نامہ[1]، یہ نہایت مفصل تاریخ تھی اور اس قدر مقبول عام تھی کہ بہرام بن مروان شاہ نے جو دولت عباسیہ کا مترجم تھا، جب اس کتاب کو بہم پہنچانا چاہا تو بیس مختلف نسخے اس کو ہاتھ لگے، عبد اللہ بن المقفع نے اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا اور اس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا،

آئین نامہ، یہ بھی نہایت مفصل کتاب ہے، علامہ مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف (صفحہ ۱۰۴ میں) لکھا ہے، کہ یہ بہت ضخیم کتاب اور کئی ہزار صفحوں میں ہے، عبد اللہ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا،

سیر ملوک الفرس	مترجمہ عبد اللہ بن المقفع،
سیر ملوک الفرس	مترجمہ محمد جہم البرمکی
سیر ملوک الفرس	مترجمہ زادویہ بن شاہویہ الاصفہانی
سیر ملوک الفرس[2]	مترجمہ محمد بن بہرام الاصفہانی،

سکیران، پہلوی زبان میں تھی مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ اہل عجم اس

---

[1] خدائی نامہ کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۶، ۲۴، ۶۴ اور کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۸ میں ہے،

[2] ان چاروں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۸ میں ہے،

کتاب کی نہایت عزت کرتے تھے، عبداللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا،

تاریخ دولت ساسانی — مترجمہ ہشام بن قاسم الاصفہانی

اصلاح دادہ بہرام بن مردان شاہ موبد نیشاپور[۱]

کارنامۂ نوشیروان

شہرزاد و پرویز — اردشیر نے اپنے حالات اور واقعات خود لکھے[۲]

کارنامۂ اردشیر بن بابک

کتاب التاج

بہرام و نرسی نامہ

کارنامہ — نوشیروان کے حالات،

مزدک نامہ

ان کتابوں کے علاوہ سلاطینِ ایران کے عہد نامے، توقیعات اور فرامین مہیا کئے گئے اور اُن کا ترجمہ کیا گیا، مثلاً وصیت نامۂ نوشیروان بنام ہرمز، عہد نامۂ اردشیر بابکاں بنام شاپور، کسریٰ و مرزبان کا مکالمہ، نوشیروان کا خط سردارانِ فوج کے نام، نوشیروان اور جواسپ کے مراسلات[۳]،

جب تاریخ ایران کا اس قدر ذخیرہ فراہم ہو چکا تو مورخینِ اسلام نے انکی مدد سے خود مستقل تصنیفیں کیں چنانچہ محدث طبری، علامہ مسعودی، ابو حنیفہ دینوری، یعقوبی،

[۱] ان دونوں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی ص۹ میں ہے، [۲] مروج الذہب مسعودی مطبوعہ یورپ ص۲۶۲ جلد اوّل، [۳] ان چاروں کتابوں کا ذکر فہرست ابن الندیم ص۳۱۵ میں ہے،

حمزہ اصفہانی وغیرہ نے ایران کی بسوط اور مفصل تاریخیں لکھیں جو یورپ کی بدولت آج چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یہ تمام کتابیں فردوسی کے زمانہ سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں، ان واقعات کے بعد مالکم صاحب کی رائے کو پڑھو کہ "مسلمان چارسو برس تک ایران کی تاریخ سے ناواقف تھے، اور سب سے پہلی کوشش سامانیوں کے دور میں ہوئی"؛

یہ تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں، فارسی میں اسوقت تک ترجمہ کے سوا کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی گئی تھی، غالباً سب سے پہلی کتاب جو تاریخ ایران پر لکھی گئی، وہ ابو علی محمد بن احمد البلخی کی تصنیف تھی جس کا نام اس نے شاہنامہ رکھا تھا، اسی بنا پر کشف الظنون میں اسکو شاہنامۂ قدیم لکھا ہے؛

ابوریحان بیرونی نے آثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے[1] کہ میں نے اس کتاب کا سرمایہ کتب مندرجۂ ذیل سے فراہم کیا، سیرالملوک عبداللہ ابن المقفع، سیرالملوک محمد بن جہم البرمکی، سیرالملوک ہشام بن القاسم، سیرالملوک بہرام شاہ بن مردان شاہ، سیرالملوک بہرام اصفہانی، تصانیف بہرام مجوسی،

غرض جب دقیقی نے شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو تاریخ عجم کا بہت بڑا ذخیرہ عربی و فارسی میں تیار ہو چکا تھا، دقیقی نے سامانیوں کی فرمائش سے یہ کام شروع کیا تھا، سامانیوں کا کتب خانہ اس زمانہ میں تمام عالم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا شیخ بو علی سینا جب اول اول اس کتب خانہ میں داخل ہوا تو اس پر حیرت چھا گئی؛

[1] دیکھو کتاب مذکور مطبوعۂ یورپ صفحہ ۹۹؛

چنانچہ اُس نے اقرار کیا ہے کہ میں نے اتنا نادر اور عظیم الشان کتب خانہ نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا؛ دقیقی کے لئے یہ تمام تاریخی ذخیرہ مہیا کیا گیا ہوگا، اور چونکہ سلطان محمود غزنوی سامانیوں ہی کا دست پرور اور ان کو مٹا کر انکا جانشین بنا تھا اسلئے ہر طرح قرین قیاس ہے کہ وہ سب سامان محمود کو ہاتھ آیا ہوگا اور فردوسی کو اس سے فائدہ اُٹھانیکا موقع دیا ہوگا، یہ محض قیاس نہیں بلکہ مورخین کی تصریح سے اس کی تائید ہوتی ہے کشف الظنون میں ہے،

تاریخ الفرس لبعض قدماء اهل فارس	تاریخ ایران بعض قدماے ایران کی تصنیف ہے
وقد کان معظما عند العجم لما فیہ	عجمی اس کتاب کی اسلئے بہت عزت کرتے تھے
من اخبار اسلافهم وسیر ملوکهم وهو	کہ اسمیں انکے آبا و اجداد اور سلاطین کے حالات
اصل الشهنامه وغیرها ونقله ابن	تھے اور یہی کتاب شاہنامہ وغیرہ کا ماخذ ہے
المقفع من الفهلویة الی العربیة	ابن المقفع نے اسکو پہلوی زبان سے ترجمہ کیا،

غالبًا یہ وہی خدائی نامہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوچکا،

صاحب مجمع الفصحا لکھتے ہیں،

" از جملہ نامہاے قدیم جاسپ نہاد، کتاب لے دست کہ در ذکر خسروان ایران بودہ دیگر آئین بہمن است، در احوال بہمن، دیگر داراب نامہ است، دیگر دانش افزاے نوشیروانی کہ جامع آں بزرگ مہر حکیم بودہ، و باستان نامہ و انشور نامہ وخرد نامہ و حکیم ابو القاسم محمد بن منصور فردوسی آثار افعال ملوک عجم، را ازان نامہا بدست

آورده؛

ان تمام قرائن اور تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہوگئی تھیں لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارا نہیں کرتا، فردوسی کا دعوا ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک نہایت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی لیکن مرتب و مدوّن نہ تھی، موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا رہتے، ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڈھے بڈھے پرانے موبد جمع کئے اور اُن پراگندہ اجزا کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب تیار کرائی،

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق خود فردوسی کا بیان

یکے نامہ بُد از گہ باستاں	فراواں بدو اندراں داستاں
پراگندہ در دست ہر موبدے	ازو بہرۂ بردہ ہر بخردے
یکے پہلواں بود دہقاں نژاد	دلیر و بزرگ و خردمند و راد
ز ہر کشورے موبدے سالخورد	بیاورد و ایں نامہ را گرد کرد
بہ پرسید شاں از نژاد کیاں	وزاں نامداران فرخ گواں
بگفتند پیشش یکایک مہاں	سخنہاے شاہان و گشت جہاں
چو بشنید از یں شاں سپہبد سخن	یکے نامور نامہ افگند بُن

فردوسی کا بیان ہے کہ اسی کتاب کو دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن چونکہ ناتمام چھوڑ گیا میں نے اسکی تکمیل کی،

فردوسی کے بیان کے مطابق شاہنامہ کی اصلی بنیاد اسی کتاب پر قائم کی گئی لیکن جستہ جستہ داستانیں اور ذریعوں سے بھی فراہم ہوئیں، رستم و شغاد کا قصہ جہاں شروع کیا ہے تمہید میں لکھا ہے کہ احمد بن سہل کے دربار میں ایک بڈھا تھا جو سام و نریمان کی اولاد سے تھا، اس کے پاس سلاطین ایران کی تاریخ تھی، اور رستم کی اکثر داستانیں اسکو زبانی یاد تھیں، شغاد کا قصہ میں نے اس سے لیکر نظم کیا،

یکے پیر بُد نامش آزاد سرو | کہ با احمد سہل بودے بہ مرو
کجا نامۂ خسرواں داشتے | تن و پیکر پہلواں داشتے
بہ سام نریماں کشیدش نژاد | بسے داشتے رزم رستم بیاد
بگویم سخن انچہ زو یافتم | سخن را یک اندر دگر بافتم

فردوسی کا دعویٰ ہے ہم کو انکار کی کوئی وجہ نہیں، لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ فردوسی نے خود تیسری جلد میں دقیقی کے اشعار کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے،

یکے نامہ دیدم پُراز داستاں | سخنہائے آں پُر منش راستاں
فسانہ کہن بود و منشور بود | طبائع زپیوند او دور بود
گذشتہ برو سالیان دو ہزار | گرایدوں کہ برتر نیاید شمار
گرفتم بگوئیند بر آفریں | کہ پیوند را راہ داد اندریں

تیسرے شعر میں صاف تصریح ہے کہ کتاب مذکور دو ہزار برس کی تصنیف تھی، یہ ظاہر ہے کہ دو ہزار برس پہلے ایران کی جو زبان تھی وہ فردوسی کے زمانہ کی

زبان نہ تھی بلکہ ژندی یا اس کے قریب قریب ہوگی جو سنسکرت سے ملتی جلتی ہے، اور جو پہلوی زبان سے بھی بہت مختلف ہے، اس لئے یہ بات ثابت ہونا ضرور ہے کہ فردوسی اس زبان سے واقف تھا یا کوئی شخص ترجمہ کرتا جاتا تھا، لیکن تذکروں اور خود فردوسی کے بیان میں اسکی کوئی شہادت موجود نہیں،

شاہ نامہ کے ماخذ کے متعلق دیباچہ میں اور چند روایتیں مذکور ہیں، واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ہم اُن کو بھی نقل کرتے ہیں، لیکن جہاں ان میں بدیہی غلطی ہے ہم اسکی تغلیط کر دیں گے،

سامانیوں کو ایران کی تاریخ کے مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا، ان میں سے نوشیروان کو سخت شغف تھا، چنانچہ تمام دیار و اطراف میں قاصد بھیجکر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کئے، یزدگرد نے اپنے زمانہ میں ان سب کو دانشور دہقان کے حوالہ کیا کہ کیومرث سے لیکر خسرو پرویز کے زمانہ تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کر دے، دانشور مذکور مدائن کے روسا میں تھا اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا، اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب دیکر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی،

عربوں کے حملہ میں یہ کتاب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی گئی آپنے اس کا ترجمہ سنا اور فرمایا کہ یہ مزخرفات کا مجموعہ دیکھنے کے قابل نہیں، غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہو کر حبش پہنچی، بادشاہ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا، وہاں سے ہندوستان

پہنچی، یعقوب لیث نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگوا کر ابو منصور عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے، چنانچہ تاج بن خراسانی ہروی، یزدان داد شاہ سیستانی، ماہوی بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی، ان سب نے مل کر ۳۶۰ھ میں اس کا ترجمہ کیا، یہی کتاب سامانیوں کو ہاتھ آئی، اور ان کے حکم سے دقیقی نے اسکو نظم کرنا شروع کیا،

اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب حبش گئی، وہاں ترجمہ ہوکر پھر ہندوستان پہنچی ہندوستان سے ایران میں آئی، صریح غلط اور بیہودہ ہے، باقی واقعات صحیح ہوں تو تعجب نہیں یعنی ایران کی کوئی قدیم تاریخ جو یزدگرد کے عہد میں تیار ہوئی تھی یعقوب لیث کے زمانہ میں پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہو،

دیباچہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ نوشیرواں کے خاندان کا ایک شخص سلطان محمود کے زمانہ میں تھا اس کا نام خور فیروز تھا، اور فارس میں سکونت رکھتا تھا، زمانہ کے انقلاب سے آوارہ وطن ہوکر، غزنیں پہنچا، یہاں آکر چرچا سنا کہ سلطان محمود تاریخ عجم کا شیفتہ و دلدادہ ہے، اس کے وطن میں یہ کتاب موجود تھی، چنانچہ وہاں سے منگوا کر سلطان کی خدمت میں پیش کی، اور مورد انعام ہوا،

تیسری روایت یہ ہے کہ جب تمام ملک میں سلطان محمود کے شوق کے چرچے پھیلے تو بادشاہ کرمان نے ایک شخص کو جس کا نام آذر برزین تھا، اور شاپور ذوالاکتاف کے خاندان سے تھا، اور اس وجہ سے تاریخ ایران کا بڑا سرمایہ اس کے

پاس تھا، اس کو سلطان محمود کی خدمت میں بھیجا،

شاہنامہ کی وقعت تاریخ کے لحاظ سے

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں نے شاہنامہ کو عام نظروں میں تاریخی درجہ سے گرا دیا ہے، تاہم ایران کی کوئی مفصل قدیم تاریخ اس سے زیادہ صحیح نہیں مل سکتی،

ملکم صاحب بھی تاریخ ایران میں اعتراف کرتے ہیں،

"کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ وخیالات شاعری بسیار دارد، لکن تقریبًا جمیع اخبارے کہ در تاریخ قدیم ایران وتوران در ملک آسیا (ایشیا) یافت می شود دراں مندرج است"!

مالکم صاحب نے نہایت تفصیل کے ساتھ شاہنامہ کے واقعات کا یونانی مورخین کے بیان سے مقابلہ کیا ہے، اور اکثر جگہ دونوں میں تطبیق دی ہے، علامہ ثعلبی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، ایران کی قدیم تاریخ پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، اس نے بھی جا بجا شاہنامہ کا حوالہ دیا ہے، تاریخی حیثیت سے شاہنامہ کے متعلق مفصل بحث کرنا ہمارا موضوع نہیں، البتہ اس قدر جتانا ضروری ہے کہ شاہنامہ کی بے اعتباری کی بڑی وجہ جو آج کل خیال کیجاتی ہے، وہ اس کے دور از کار افسانے ہیں، مثلاً دیو سفید، مار ضحاک، جام کیخسرو وغیرہ وغیرہ لیکن اولاً تو چند واقعات کی بنا پر تمام کتاب کو غلط نہیں کہہ سکتے، ہیروڈوٹس کو تمام یورپ تاریخ کا آدم مانتا ہے، لیکن اسکی تاریخ میں ہزاروں واقعات فرضی اور وہمی ہیں، اور خود

یورپ کو اس کا اعتراف ہے، دوسرے ایرانیوں کی قدیم تاریخ میں واقعات اسی طرح مذکور تھے، اس لئے فردوسی کا صرف یہی فرض تھا کہ ان واقعات کو بعینہ نقل کر دے علامہ ثعلبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ تمام افسانے گو بالکل بے سروپا اور خلاف عقل ہیں، لیکن چونکہ ایران کی تاریخ میں بہ تواتر بیان ہوتے چلے آتے ہیں، اس لئے ہمارا صرف اس قدر فرض ہے کہ جوں کا توں انکو نقل کر دیا جائے، علامہ موصوف کے یہ الفاظ ہیں، (ذکر قصہ زال وسیمرغ)

وانا ابرء من عهدة هذه الحكاية ولولا سهر تها بكل مكان وفي زمان وعلى كل لسان وجريها يجري ما يستطاب ويلهي به الملوك عند الارق لما كتبتها وقد كانت العجائب كثيرة في ذلك الزمان الاول كبلوغ عمر الواحد من هلل الف سنة و كطاعة الجن والشياطين للملوك... وغيرها مما يطول ذكره (جلداول صفہ مطبوعہ یورپ)

اسی طرح ہفت خوان رستم کے ذکر میں لکھا ہے، کہ یہ سب لغویات ہیں،

ابوریحان بیرونی آثار الباقیہ میں لکھتا ہے:

ولهم في التواريخ القسم الاول	ایرانیوں نے پہلے زمانہ کی تاریخ لکھی ہے، انمیں سلاطین
اعمار الملوك وافعالهم المشهورة	کی عمروں اور انکے کارناموں کے متعلق ایسی باتیں
عنهم ما يستنفر عن سماعه القلوب	بیان کرتے ہیں جنکے سننے سے دل اجنبا ہی کانن
وتمجه الاذان ولا تقبله العقول	انکو برداشت نہیں کر سکتے عقل انکو قبول نہیں کرتی

۱؎ مطبوعہ یورپ صفہ،

بعض یوروپین مورخین کے نزدیک شاہنامہ کی بے اعتباری کی وجہ یہ ہے کہ اس کے واقعات یونانیوں کی تاریخ سے اکثر جگہ مخالف ہیں لیکن اس عقدہ کو علامہ ثعلبی نے بہت پہلے حل کر دیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے پاس ایران کی تاریخ کے متعلق دو ماخذ ہیں، ایرانی اور یونانی ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے لیکن یہ مسلم مسئلہ ہے کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے، اسلئے ہم نے یونانیوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا"

محققین یورپ کی رائے

یورپ نے نہایت جد و جہد سے اسلام کے قبل کی ایرانی تصنیفات کثرت سے ڈھونڈھ نکالیں، اور اُن میں سے اکثر کو چھاپ کر شائع کیا، چنانچہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں ایک خاص عنوان قائم کیا ہے "پہلوی لٹریچر" اس کے ذیل میں اُن تمام کتابوں کی فہرست اور اُن کے حالات لکھے ہیں، ان میں بعض کتابیں اسلام سے پانْ پانْ سو، چھ چھ سو برس پہلے کی تصنیف ہیں، ان میں سے جو کتابیں شاہانِ عجم کی تاریخ ہیں، اُن کا بیان حرف بحرف فردوسی سے مطابق ہے، انہی میں ایک کتاب کارنامک ارتخشتر ہے جو پہلوی زبان میں ہے، اور ۶۰۰ء یعنی زمانۂ اسلام سے کسی قدر پہلے کی تصنیف ہے، یہ کتاب اصل پہلوی زبان میں مع جرمنی ترجمہ کے شائع کی گئی ہے، اسکی نسبت براؤن صاحب لکھتے ہیں،

"جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ

فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے، اور ہماری نظر میں اسکی وقعت یہ دیکھکر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے، اُن سے ترتیب اور مطابقت پائی جاتی ہے، جرمن کے مشہور فاضل پروفیسر نولدکی نے شاہنامہ کے ماخذ اور اسکی تاریخی حیثیت پر ایک مستقل کتاب جرمن زبان میں لکھی ہے، اسکے اقتباسات کا ترجمہ مسٹر براؤن نے انگریزی میں کیا ہے، اور اپنی کتاب کی جلد اول میں شامل کیا ہے ہم اس کے بعض ضروری مقامات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں،

تاریخ و قدامت | "اوستا میں شاہنامہ کی فصلوں کا اتنا ذکر آچکا ہے کہ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اوستا تصنیف ہوئی تو اُس زمانہ میں اُن قومی فسانوں کی بڑی بڑی باتیں لوگوں کو معلوم تھیں، ان کی قدامت کا صرف یہی ایک ثبوت نہیں ہے کیونکہ نولدکی نے دکھلادیا ہے کہ یونانی مصنفوں کی کتابوں میں بھی جو انھوں نے شاہانِ ایران کے بارہ میں لکھی ہیں، ان بہادروں کا تذکرہ موجود ہے، خاصکر ٹی سی ایس[۱] کی کتاب میں جو پانسو برس قبل حضرت مسیح "آرٹا یزرکسیز[۲] نیمن[۳] کا طبیب دربار تھا، اور اُس نے اپنی کتاب ایرانی تصانیف کی مدد سے لکھی ہے، یہ واقعات بار بار بیان ہوئے ہیں، بلکہ کبھی ایک خاندان سے منسوب ہوئے ہیں، کبھی دوسرے سے، مثلاً سائرس[۴] ایکی مینین[۵] کے پہلے بادشاہ کو جو واقعات میڈ[۶] یا والوں سے لڑنے میں پیش آئے وہ اردشیر ساسانی اور اُس کی پارتھیون[۷] کی جنگ

---

[۱] Ctesias [۲] Artaxerxes [۳] Mnemon [۴] Cyrus [۵] Achaemenian [۶] Medes [۷] Parthians

کے حالات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، اسی طرح عقاب سیمرغ اور ہما شاہ پسند پرندوں کا
اکی می نیز[1] زال اور اردشیر کا محافظ ہونا، اسی طور پر نو دیر کیانی اور پیروز ساسانی کو
تورانی دشمنوں سے قارن کے خاندان کے دو شخصوں کا بچانا اور اسی قبیل سے دارا
اور پیروز کی ملتی جلتی سرگذشتیں ہیں جو قابلِ غور ہیں،

یات کارزریراں | زریادریس[2] برادر ہسٹاسپس[3] اور شاہزادی اوداتس[4] کا قصہ ہم تک
اتھینیس[5] سے پہنچا ہے، یہ قصہ اس نے سکندر کی اس تاریخ سے لکھا ہے جو اسکے دیوان چارس[6] نے
تصنیف کی تھی، یہی داستان سب سے پرانی پہلوی کتاب یات کارزریراں[7] میں بیان ہوئی
ہے، جو پانسو برس قبل حضرت عیسیٰ کے لکھی گئی تھی، یہ چھوٹی مگر ضروری کتاب سب میں قدیم
فارسی کتاب ہے جس میں بہادری کے قصے درج ہیں، گو اسمیں ایک ہی قصہ ہے، مگر
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ان کل کہانیوں پر عبور ہے، اسی کتاب کو شاہنامہ
گشتاسپ یا پہلوی شاہنامہ کہتے ہیں۔

نولدکی کہتا ہے کہ "اگر ہم کو سراسر دھوکا ہوا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس
قصہ میں وہ روح موجود ہے جس کا وجود کئی اور قوموں کے بہادری کے قصوں میں
موجود ہے، خلاصۂ حال سب کو معلوم ہے، اس کے خاص خاص حصوں کو کوشش کرکے
زینت دی گئی ہے، اور اس ڈھانچ میں تھوڑی سی کمی بیشی اور ترتیب سے کم و بیش
ایک مسلسل اور پوری داستان تیار ہوسکتی ہے، اس قصے کے ضروری اجزا

۱ Achaemenies ۲ Zapiatres ۳ Hystespes ۴ Odatis
۵ Athessaeus ۶ Charas ۷ Yatkar-i-Zariran

عربی کے اس مختصر ترجمہ میں موجود ہیں جو طبری نے کیا ہے، اور جو شاہنامہ کے بیان سے بالکل مطابق ہے، بعض جگہ تو لفظ بہ لفظ وہی ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُسی عام قدیمی روایت سے لیا گیا ہے، جو شاہنامہ کا ماخذ ہے۔

اس نئی ترتیب سے جس کی طرف نولدکی نے اشارہ کیا ہے، وہ اضافہ اور اصلاح مراد ہے، جس سے مختلف حصے ایک دوسرے کا پیوند ہو کر ایک دلکش داستان بنجائیں اور کمی سے یہ غرض ہے کہ وہ باتیں اور الفاظ جو مسلمانوں کو ناگوار ہیں نہ آنے پائیں، جیسا فردوسی اور اوروں نے کیا ہے،

شاہنامہ کے ساسانی حصہ کے متعلق ہمارے پاس ایک پہلوی کتاب کارنامک ارتخشتر پاپکاں اصل پہلوی اور جرمن میں موجود ہے، جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے، اور ہماری نظر میں اسکی وقعت یہ دیکھکر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے، اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے، کارنامک غالباً ۶۰۰ء میں تصنیف ہوئی اور اگاتھی اس کا جو ۵۸۰ء میں تھا شاہانِ ایران کی تاریخوں کا ساسان پاپک اور اردشیر کے حالات میں حوالہ دینا، اس بات کا زائد ثبوت ہے، کہ شاہنامہ کے مختلف قصے اس زمانہ کی پہلوی کتابوں میں پائے جاتے تھے،

فردوسی کے شاہنامہ پر جو دیباچہ تیمور کے پوتے بایسنقر کے حکم سے

سنہ ۱۴۲۵ء میں لکھ کر لگایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہقان دانشور کا
پورا صحیح نسخہ اس ساری داستان کا کیومرث سے لیکر خسرو پرویز یعنی سنہ ۶۲۸ء
تک کا یزدجرد ثانی آخری ساسانی فرماں روا کے عہد میں تیار ہو چکا تھا، اس پر
نولدکی لکھتا ہے، کہ "یہ کتاب خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، مگر عرب مورخوں کے
ترجموں کا 'فردوسی' سے خسرو پرویز کی وفات تک مطابق ہونا اور بعد کو مختلف،
اس بارہ خاص میں اس کی صداقت کا ثبوت ہے، اور اس کی انتہا درجہ کی
ہمدردانہ کوشش اور حق پسندی سے پایا جاتا ہے، کہ وہ بادشاہ کی سرپرستی
اور نگرانی میں تصنیف ہوئی تھی۔"

اس پہلوی خدائی نامہ کا جس کا حمزہ اور مصنفِ فہرست وغیرہ اور دیگر
عرب مورخوں نے ذکر کیا ہے، ابن المقفع نے آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں
عربی میں ترجمہ کیا اور اس ذریعہ سے تمام عربی دانوں کو اس کا حال معلوم ہو گیا، مگر
نہایت افسوس ہے کہ یہ ترجمہ ضائع ہو گیا، اسی طرح وہ فارسی نظم کا ترجمہ جو سنہ ۹۵۷ء
میں ابو المنصور المعمری کے حکم سے ہوا تھا، اور ہرات، سیستان، شاہ پور اور طوس
کے چار پارسیوں نے، ابو منصور ابن عبد الرزاق حاکم طوس کے لئے کیا تھا، جیسا
کہ البیرونی اور نولدکی نے لکھا ہے، اسی کی بنا پر دقیقی نے ایک شاہ نامہ نوح
ابن منصور سامانی بادشاہ کے لیے جو سنہ ۹۷-۹۷۶ء تک رہا، فارسی نظم میں لکھنا شروع
کیا تھا، مگر سلطنت گشتاسپ اور زردشت کی آمد کے متعلق چند ہی ہزار

شعر لکھنے پایا تھا کہ اُسے ایک ترکی غلام نے مار ڈالا، یہ فردوسی ہی کا حصہ تھا کہ چند سال بعد اس نے اس قومی فسانے کو جو دقیقی نے شروع کیا تھا، ساٹھ ہزار اشعار میں جس میں دقیقی کے اشعار بھی شامل ہیں تکمیل کو پہنچایا، اتنا کہنا یہاں اور ضروری ہے کہ شاہنامہ قوم کا پورا پورا افسانہ ہے،

داستان اردشیر | اس داستان کی جتنی کہانیاں، شاہنامہ اور کارنامک پہلوی میں پائی جاتی ہیں حسب تفصیل ذیل ہیں،

(۱) ساسان جو بہمن دراز دست کی پانچویں پشت میں تھا، پاپک شاہ فارس کے ہاں مویشی چرانے پر نوکر ہے، پاپک خواب دیکھتا ہے کہ ساسان نسل شاہی سے ہے، اُس سے بلطف و خوشی پیش آتا ہے، اپنی بیٹی کی اس سے شادی کرتا ہے اور اردشیر اُس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے،

(۲) پاپک اردشیر کو متبنی کرتا ہے، اس کے جوان ہونے پر اسکی دلاوری عقلمندی اور شاہانہ خوبیوں کا تذکرہ اردوان (آخری بادشاہ آشکانی) تک پہنچتا ہے، وہ اردشیر کو طلب کرتا ہے، خاطر و مدارات سے پیش آتا ہے، ایک روز اردوان کے بیٹے کے ساتھ شکار کو جاتا ہے، اور وہ اردشیر کے مارے ہوئے شکار کو اپنا بتلاتا ہے اُسی بے قدر ہو کر میر آخور اصطبل شاہی مقرر ہوتا ہے،

(۳) اردوان کی ایک معتمد ہوشیار اور نازنین پرستار اردشیر پر ترس کھاتی ہے اور دو تیز رفتار گھوڑے مہیا کر کے اس کے ساتھ فارس کو بھاگ جاتی ہے اردوان

تعاقب کرتا ہے، مگر یہ سنکر کہ شوکتِ خسروی ایک خوبصورت مینڈھے کی شکل میں اردشیر تک پہنچ گئی ہے واپس آتا ہے،

(۴) اردشیر اشکانیوں وغیرہ سے لڑتا ہے، اردوان اور اس کے بیٹے کو شکست دیتا ہے اور خود کردوں سے زک اٹھاتا ہے،

(۵) داستان ہفتان بوخت (ہفتواد) اور کرم کرمانی مع جنگ متھرک دمسرک،

(۶) اردوان اپنی بیٹی (اردشیر کی زوجہ) کو موت کا حکم سناتا ہے ایک موبد جس کا نام ابرسام ہے اس کی جان بچاتا ہے، اسی کے پیٹ سے شاہو پیدا ہوتا ہے، اور باپ اس بچہ کو لیجاتا ہے،

(۷) اردشیر ہندوستان کے حاکم کید یا کیت سے یہ سنکر کہ ایران کی بادشاہت اس کے یا اس کے دشمن متھرک کے گھرانے میں جائیگی، متھرک کا استیصال کرتا ہے، اس کی ایک لڑکی قتلِ عام سے بچکر کسانوں میں پرورش پاتی ہے، شاہو اسے دیکھکر اس پر عاشق ہوتا ہے، اپنی شادی اور اپنے بیٹے ہرمزد کی پیدائش کو اپنے باپ اردشیر سے چھپاتا ہے، اور ہرمزد کو سات برس کی عمر میں چوگان کے میدان کی بہادری دیکھکر اردشیر پہچان لیتا ہے،

ہر متنفس جس نے کارنامک اور شاہنامہ کا یہ حصہ ساتھ ساتھ پڑھا ہو اس بات کا اقرار کریگا کہ شاہنامہ پورا چربہ کارنامک کا ہے، اس لئے کہ جزئیات میں بھی اختلاف نہیں ہے، ہمارے اس خیال کو کہ فردوسی نے جن قدیم کتابوں سے شاہنامہ

لکھا ہے اُن سے الگ نہیں گیا، پہلوی کے قصہ زریر اور شاہنامہ کے مقابلہ سے اور بھی تقویت ہو جاتی ہی، یہ امر اتفاقی ہے کہ ان حصوں کا ہم اصل کتابوں سے مقابلہ کر سکے، مگر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اور مقامات پر بھی جہاں ہمکو جانچ پرتال کے ذریعے حاصل نہیں ہیں وہاں بھی فردوسی نے ادنیٰ بات بھی قدیم ماخذوں کے خلاف نہیں لکھی ہوگی، یہاں ہم داستان اردشیر کی دونوں روایتوں میں سے صرف دو ایک باتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، زیادہ گنجایش نہیں ہی، اول ہم اُسکی پیدائش کا ذکر کرتے ہیں،

کارنامک

سکندر رومی کی وفات پر ایران میں ۲۴۰ مختلف گروہوں کے لوگ حکمراں تھے، اردوان ان سب میں سربرآوردہ تھا اور اصفہان، فارس اور قرب جوار کے حصہ پر قابض تھا، پاپک محافظ سرحد اور اردوان کی طرف سے فارس کا گورنر تھا اور اصطخر میں رہتا تھا، اس کے کوئی بیٹا نہ تھا، جس سے اس کا نام چلتا، ساسان پاپک کا گوالا تھا اور ہمیشہ اپنے گلوں میں رہتا تھا، مگر وہ دارا ابن دارا کی اولاد میں تھا اور سکندر کے بُرے زمانہ میں وہ بھاگ کر گڈریوں میں جا ملا تھا، پاپک کو یہ بات معلوم نہ تھی، ایک رات اُس نے خواب میں دیکھا کہ ساسان کے سر سے سورج نکلا ہی، اور اس نے تمام عالم کو منور کر دیا، دوسری رات دیکھا کہ ساسان ایک سپید ہاتھی پر جس پر

لہ شاہنامہ میں اصطرخ لکھا ہوا ہے،

قیمتی جھول پڑی ہوئی ہے، سوار جا رہا ہے اور تمام "کشور" کے لوگ اس کے ارد گرد ہیں؛ اس کی اطاعت کرتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں۔ تیسری رات اس نے دیکھا کہ آتش فروبہ گشنسپ اور متھر، ساسان کے گھر میں روشن ہے اور ساری دنیا میں اجالا پھیلا ہوا ہے، ان خوابوں سے گھبرا کر اس نے تعبیر دینے والوں اور دانش مندوں کو بلایا اور اُن سے تینوں خواب بیان کئے، معبروں نے کہا کہ یا تو وہ شخص جس کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے یا اسکی اولاد میں سے کوئی شخص تمام دنیا کا بادشاہ ہوگا، کیونکہ سورج اور قیمتی جھول والا ہاتھی، زور، طاقت اور فتح کی علامت ہیں آتش فروغ سے مراد وہ لوگ ہیں جو مذہب سے خوب واقف ہیں اور اپنے ہمسروں میں ممتاز ہیں؛ آتش گشنسپ سے جنگجو اور جرگوں کے سردار اور آتش برزین مہر سے دنیا کے کاشتکار مراد ہیں، پس بادشاہت اُسے یا اُس کی اولاد کو ملے گی، بابک نے یہ تقریر سنکر سب کو رخصت کیا اور ساسان کو بلا کر اس سے پوچھا، "تم کس خاندان اور نسل سے ہو تمہارے بزرگوں اور پرکھوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہے"؟ ساسان نے کہا کہ اگر جان بخشی ہو تو عرض کروں، بابک نے اجازت دی، ساسان نے اپنا راز فاش کردیا اور سارا حال تبلا دیا، بابک یہ سن کر خوش ہوا اور کہا کہ میں تمہاری حالت بہتر کردونگا اور اسکے حکم دیتے ہی پورا لباس شاہی آیا اور ساسان کو عطا ہوا، جب ساسان نے کہا پہنو، اُس نے پہن لیا، وہ بابک کے حکم سے چند روز عمدہ غذائیں کھاتا رہا جس سے اس کے جسم میں طاقت آگئی، بابک نے پھر اپنی لڑکی سے اس کی شادی کردی، اور قسمت کی

یاوری سے وہ حاملہ ہوگئی اور اس سے تختشر پیدا ہوا،

فرزبہ، فرہ باگ یا فرن باگ کی جگہ فردوسی نے خرید لکھا ہے، کارنامک کی عبارت جہاں ساسان کی آمد کا ذکر ہے، بڑی روکھی پھیکی ہے، فردوسی نے اپنے زورِ قلم سے اس میں جان ڈالدی ہے، اور یہ منجملہ اُن مقامات کے ہے جو فردوسی نے نہایت دلکش پیرایہ میں لکھے ہیں،

اشعار فارسی متعلق قصہ بابک و ساسان

چو دارا بہ رزم اندرون کشتہ شد　　ہمہ دودہ را روز برگشتہ شد

پسر بُد مر او را یکے شادکام　　خردمند و جنگی و ساسان بہ نام

از آن لشکر روم بگریخت اوی　　بدام بلا در نیامیخت اوی

بہ ہندوستان در بزاری بمرد　　ز ساسان یکے کودکے ماند خرد

برین ہم نشان تا چہارم پسر　　ہمے نام ساسانش کردے پدر

چو کہتر پسر سوے بابک رسید　　بدشت آمد و سرشبان را بدید

بدو گفت مزدورت آید بکار　　کہ ایدر گزارد بہ بد روزگار

بہ پذرفت بدبخت را سرشبان　　ہمی داشت بارنج روز و شبان

شبے خفتہ بُد بابک رودیاب　　چنان دید روشن روانش بخواب

کہ ساسان بہ پیل ژیان بر نشست　　گرفتہ یکے تیغ ہندی بہ دست

بہ دیگر شب اندر چو بابک بخفت　　ہمی بود با مغز تن اندیشہ جفت

چناں دید در خواب کاتش پرست — سه آتش فروزاں به برِوے بدست

چو آذر گشسپ و چو خرّاد و مهر — فروزاں چو بهرام و ناهید و مهر

همه پیش ساساں فروزاں بدے — بهر آتشے عود سوزاں بدے

سر بابک از خواب بیدار شد — روان و دلش پُر ز تیمار شد

کسانیکه در خواب دانا بُدند — بداں دانش اندر توانا بُدند

به ایوانِ بابک شدند انجمن — بزرگانِ فرزانه و رایزن

چو بابک سخن برکشاد از نهفت — همه خواب یکسر بدیشاں بگفت

پُر اندیشه شد زاں سخن رہنماے — نهاده بدو گوش پاسخ سراے

سرانجام گفت اے سرافراز شاه — به تاویل ایں کرد باید نگاه

کسے را که دیدی تو زینساں بخواب — به شاہی برآرد سر از آفتاب

گر ایدوں که ایں خواب ازو بگذرد — پسر باشدش کز جہاں برخورد

چو بابک شنید ایں سخن گشت شاد — براندازه شاں یک بیک ہدیه داد

بفرمود تا سر شباں از رمه — بر بابک آمد به روز دمه

بیامد دماں پیش او با گلیم — پُر از برف پشمین و دل پُر ز بیم

بپرداخت بابک ز بیگانه جاے — پدر شد پرستنده و رہنماے

ز ساساں بپرسید و بنواختش — بر خویش، نزدیک بنشاختش

بپرسیدش از گوہر و از نژاد — شباں زو بترسید و پاسخ نداد

ازاں پس بدو گفت کاے شہریار | شہاں را بجاں گر دہی زینہار
بگویم زگوہر ہمہ ہرچہ ہست | چو دستم بہ پیماں بگیری بدست،
چو بشنید بابک زباں برکشاد | زیزداں نیکی دہش کرد یاد
بہ بابک چنیں گفت ازاں پس جواں | کہ من پور ساسانم اے پہلواں
چو بشنید بابک فرو ریخت آب | ازاں چشم روشن کہ او دید خواب
بیاورد پس جامہ پہلوے | یکے اسپ پر آلت خسروے
یکے کاخ پُر مایہ اورا بساخت | ازاں سر شبانی سرش بر نواخت
بدو داد پس دختر خویش را | پسندیدہ و افسر خویش را

کارنامک پہلوی اور شاہنامہ کے بیان میں بہت خفیف فرق ہے جو عموماً تاریخی واقعات میں ہوتا ہے،

مسٹر براؤن نے اور بھی چند داستانیں کارنامک اور شاہنامہ کی مطابقت دکھانے کیلئے درج کی ہیں، لیکن ہم نے طول کے لحاظ سے قلم انداز کیں،

فردوسی کی وقعت شاعری کی حیثیت سے

عام اتفاق ہے کہ ایران میں اس درجہ کا کوئی شاعر آج تک نہیں پیدا ہوا، انوری اُن شعرا میں ہے جن کو لوگوں نے فردوسی کا ہمسر قرار دیا ہے چنانچہ مشہور ہے،

در شعر سہ تن پیمبرانند | ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

لیکن خود انوری کہتا ہے کہ فردوسی ہمارا خداوند ہے، اور ہم اُسکے بندے ہیں،

آفریں بر روان فردوسی   آں ہمایوں نژاد فرخندہ

آں نہ استاد بود و ما شاگرد   آں خداوند بود ما بندہ

نظامی کہتے ہیں،

سخن گوی پیشینۂ داناي طوس   کہ آراست زلفِ سخن چوں عروس

علامہ ابن الاثیر نے مثل السائر کے خاتمہ میں لکھا ہے، کہ "عربی زبان باوجود اس وسعت و کثرتِ الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کرسکتی، اور درحقیقت یہ کتاب عجم کا قرآن ہے"

یورپ کے فضلا بھی جو زبان فارسی سے واقف ہیں عموماً فردوسی کے کمالِ شاعری کے معترف ہیں، سر گور اوسلی نے تذکرۃ الشعرا میں فردوسی کو ہومر سے تشبیہ دی ہے اگرچہ ساتھ ہی یہ ناتوان بینی بھی ظاہر کی ہے کہ "وہ اگرچہ دراصل ہومر کا ہمسر نہیں ہوسکتا، لیکن ایشیا میں اگر کوئی ہومر ہوسکتا ہے تو وہی ہے"

لیکن تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مسٹر براؤن جو آج کل فارسی دانانِ یورپ میں سب سے ممتاز ہیں، فردوسی کے کمالِ شاعری کے منکر ہیں، وہ اپنی کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں لکھتے ہیں کہ فردوسی کے بعد جو شعرا پیدا ہوئے وہ شاعرانہ خیالات و شوکتِ الفاظ دونوں حیثیت سے فردوسی سے بالاتر ہیں، شاہنامہ سبعہ معلقہ کی بھی برابری نہیں کرسکتا" صاحب موصوف کو اس پر حیرت

کہ شاہنامہ تمام اسلامی دنیا میں اس قدر کیوں مشہور عام ہوگیا، پھر خود اسکی وجہ یہ بتائی ہے کہ شاہنامہ میں مسلمانوں کے اسلاف کی فخریہ داستانیں ہیں، اسلیئے حب قوم نے اس کا سکہ جمادیا"

ہم ان سب باتوں کے جواب میں صرف یہ کہتے ہیں،

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزش نہ ؕ بدست آور رگ جانی ونشتر را تماشا کن

شاہنامہ کی خصوصیات

اب ہم شاہنامہ کے اوصاف کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں،

پہلی خصوصیت

۱- اسلام کا خاصہ ہے کہ جہاں جہاں گیا ملک کی زبان سرے سے بدل دی یا اس قدر اس کو مغلوب کرلیا کہ وہ مستقل اور آزاد زبان نہیں رہی، اسلام سے پہلے مصر وشام میں قبطی اور سریانی بولی جاتی تھی، اسلام کے ساتھ تمام ملک کی زبان عربی ہو گئی یہانتک کہ آج عیسائی یہودی وغیرہ بھی عربی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں بول سکتے، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ میں ترک گئے تو ملکی زبان ترکی ہوگئی، کابل اور قندھار کی اصلی زبان پشتو ہے، لیکن خواص فارسی بولتے ہیں، جو اسلامی حکمرانوں کی زبان تھی، ایران اور ہندوستان سخت جان تھے، جہاں ملک کی اصلی زبان قائم رہی لیکن عربی الفاظ اس کثرت سے داخل ہوگئے کہ ان کی آمیزش کے بغیر فارسی یا اردو لکھنا چاہیں تو لزوم مالایلزم کی محنت اٹھانی پڑتی ہے،

ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت سے مخلوط ہوگئی تھی، عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا، اسکے چار شعر آج موجود ہیں، جن میں

نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں، رودکی اور ابوشکور بلخی وغیرہ کا کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے، سلطان محمود کے زمانہ میں ایک فاضل نے شاہنامہ کے جواب میں عمرنامہ ایک کتاب نثر میں لکھی تھی، وہ ہماری نظر سے گذری ہے، اس کا بھی یہی حال ہے، اسی زمانہ میں شیخ بوعلی سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے لیکن عہدہ برآنہ ہوسکا، فردوسی کی قدرت زبان دیکھو کہ ساٹھ ہزار شعر لکھکر ڈالدیئے، اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں، اگرچہ اس خصوصیت کا موجد دقیقی ہے، لیکن کل ہزار شعر اور صرف چند معمولی واقعات ہیں، بخلاف اس کے فردوسی نے ہر قسم اور ہر طرح کے سینکڑوں گوناگوں مطالب ادا کئے اور زبان کے خالص ہونے میں فرق نہ آنے پایا، عربی کے جو الفاظ خال خال آئے ہیں اکثر وہ ہیں جو خاص مصطلح الفاظ ہیں، مثلاً دین، میمنہ، میسرہ، قلب، سلاح، عنان وغیرہ وغیرہ یہ الفاظ اس طرح اس زبان میں شائع تھے، جس طرح آج کل اردو میں جج، کلکٹر، ٹکٹ، اسٹیشن وغیرہ ہیں کہ انکے بجائے اگر کوئی شخص اور الفاظ استعمال کرے تو ناموزوں معلوم ہونگے،

حیرت وہاں ہوتی ہے جہاں فلسفیانہ اصطلاحیں آتی ہیں اور وہ اس بے تکلفی سے سادی فارسی میں ان کو ادا کرتا ہے کہ گویا روزمرہ کی باتیں ہیں، بوعلی سینا نے بھی حکمت علائیہ میں یہ کوشش کی، لیکن اس کا نمونہ دیکھو، ابطال غیر متناہی کے استدلال میں لکھتا ہے،

"بیشی و بیشی بالطبع است چنانکہ اندر شمارست ما بعرض چنانکہ اندر اندازہ"

است کہ از ہر کدام سو کہ خواہی آغاز کنی وہرچہ اندروے پیشی وپسی است بالطبع
باوے مقداری ست کہ اورا بہرہ ہا بہر جاکہ بوند ہمہ بیک جائے حاصل وموجود
بود وے متناہی است"
غور کرو اس کوشش کے ساتھ کس قدر عربی الفاظ اب بھی باقی رہ گئے اور جن عربی
الفاظ کا فارسی میں ترجمہ کیا وہ اس قدر نامانوس اور بیگانہ ہیں کہ عبارت معما ہو کر رہ گئی،
عبارت کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں جب تقدّم وتاخر ہوتا ہے تو دو
طریقہ سے ہوتا ہے بلاواسطہ جس طرح ایک عدد دو پر مقدم ہے، یا بواسطہ جس طرح
مسافت میں آگا پیچھا ہوتا ہے کہ گو ایک حصہ کو مقدم اور دوسرے حصہ کو موخر کہتے
ہیں، لیکن جہاں سے چاہیں مسافت کو شروع کر سکتے ہیں، اب قاعدہ یہ ہے کہ
کسی چیز میں بالطبع تقدم وتاخر ہوگا، ضرور ہے، کہ اس میں مقدار ہو اور مقدار کے
تمام اجزا مرتب ہوں، یہ بھی ضرور ہے، کہ ایسی چیز متناہی ہو،
غور کرو، بوعلی سینا کی عبارت سے کیا کوئی شخص یہ مطلب سمجھ سکتا ہے؟
فردوسی نے آغاز کتاب میں مخلوقات کی پیدائش کی ابتدا، عناصر کا وجود، ان
ان کی ترتیب اور انقلابات لکھے ہیں،

از آغاز باید کہ دانی درست	سر مایۂ گوہران از نخست،
کہ یزداں زناچیز چیز آفرید	بداں تا توانائی آمد پدید،
وزو مایۂ گوہر آمد چہار	برآوردہ بے رنج وبے روزگار

نخستیں کہ آتش ز جنبش دمید | زگرمیش پس خشکی آمد پدید
وزاں پس ز آرام سردی نمود | ز سردی ہماں باز ترسی فزود
چو ایں چار گوہر بجاے آمدند | ز بہر سپنجی سراے آمدند
گیا رست ، با چند گونہ درخت | بزیر اندر آمد سراں شان بخت
ببالد ندارد جزیں نیروے | نہ پوید چو پویندگاں ہر سوے
نگہ کن بریں گنبد تیز گرد | کہ درماں ازوی ست زوی ست درد
نہ گشت زمانہ بفرسایدش ، | نہ ایں رنج و تیمار بگزایدش
نہ از گردش آرام گیرد ہمی | نہ چوں ما تباہی پذیرد ہمی

یونانیوں کے نزدیک آفرینش کی ابتدا اور اسکی تاریخ یہ ہے کہ خدا نے مادہ پیدا کیا، مادہ سے عناصر پیدا ہوئے، حرکت سے آگ پیدا ہوئی، آگ کی گرمی نے یبوست پیدا کی جس سے خاک کا وجود ہوا، پھر سکون کی وجہ سے رطوبت پیدا ہوئی، رطوبت نے پانی پیدا کیا، اس طرح چار عنصر پیدا ہوئے، پھر نباتات کا وجود ہوا، جن میں صرف نمو کی قوت ہے، متحرک بالارادہ نہیں،

آسمان کی نسبت یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ ابدی ہیں، اور امتداد زمانہ سے ان میں تغیر اور زوال نہیں ہو سکتا، فردوسی نے ان مسائل کو ایسے سادہ اور صاف الفاظ میں ادا کیا ہے کہ معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان میں فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں، لیکن درحقیقت سب فلسفہ کے خاص الفاظ ہیں،

ان کے مقابل کے عربی الفاظ دیکھو،

سرمایہ	مادّہ	توانائی	وجود
گوہر	عنصر	جنبش	حرکت
آرام	سکون	پوئیدہ	متحرک بالارادہ
گشت	دوراں	فرسودن	تغیّر
تباہی	فنا		

اس طرح اور بہت سے الفاظ ہیں، ہم نے صرف نمونہ دکھایا ہے،

دوسری خصوصیت

۲- ایشیائی تاریخوں کے متعلق عام شکایت ہے کہ ان میں بجز جنگ و خونریزی کے اور کچھ نہیں ہوتا، یعنی وہ حالات بالکل نہیں ہوتے جن سے اس زمانہ کے ملکی معاملات اور قوم کی تہذیب و معاشرت کا حال کھل سکے، یہ شکایت بہت کچھ صحیح ہے، لیکن شاہنامہ اس سے مستثنیٰ ہے، شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے، لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آتے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہ نامہ کی مدد سے اُس زمانہ کی تہذیب و تمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے، بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا، امرا کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے، عرض معروض کرنے کے کیا آداب تھے، انعام و اکرام کا طریقہ کیا تھا، بادشاہ اور امرا کا درباری لباس کیا ہوتا تھا، فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے، نامہ و پیام کا کیا انداز تھا، مجرموں کو کیونکر

سزائیں دیجاتی تھیں، بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کیجاتی تھی، وغیرہ وغیرہ،

شادیوں کے کیا مراسم تھے، جہیز میں کیا دیا جاتا تھا، عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں، دولھا اور دلھن کا کیا لباس ہوتا تھا، پیشخدمت، غلام اور لونڈیوں کی وضع اور انداز کیا تھا،

خط کتابت کا کیا طریقہ تھا، کس چیز سے ابتدا کرتے تھے، خاتمہ کی عبارت کیا ہوتی تھی، خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے، ان کو کیونکر بند کرتے تھے، کس چیز کی مہر لگاتے تھے،

مالگزاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا، زمینوں کی کیا تقسیم تھی، مالگذاری کی مختلف شرحیں کیا تھیں، ٹیکس کیا کیا تھے، کون کون لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے،

یہ تمام باتیں شاہنامہ سے بہ تفصیل معلوم ہوتی ہیں، نمونہ کے طور پر ہم چند مثالیں نقل کرتے ہیں،

(۱) بیژن کی مہم میں کیخسرو نے رستم کو زابل سے بلایا ہے، اور اس کے لئے باغ میں دربار کیا ہے، دربار میں تختِ زریں بچھایا گیا ہے، اس پر ایک مصنوعی درخت نصب ہے، جس کا سایہ بادشاہ پر پڑتا ہے، درخت چاندی کا ہے، یاقوت کی شاخیں ہیں، موتیوں کے خوشے دلکے ہیں، زریں ترنج اور سیب پھلے ہوئے ہیں، جو مجوف ہیں، اور ان کے اندر مشک کا برادہ ہے، ہوا جب چلتی ہے تو مشک

چھڑتی ہے، اسی کے قریب قریب وہ فرش تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران کی فتح میں آیا تھا) ان تمام باتوں کو فردوسی نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے،

در باغ بکشادہ سالار بار — نشستگہے ساخت بس شاہوار
بفرمود تا تاجِ زرّین و تخت — نہادند زیرِ گل افشاں درخت
درختے زوند از برِ گاہ شاہ — کجا سایہ گسترد برتاج و گاہ
تنش سیم و شاخس زیاقوت زرد — بروگونہ گوں خوشہ ہائے گہر
عقیق و زبرجد ہمہ برگ و بار — فروہشتہ از شاخ چوں گوشوار
ہمہ بار زرّیں ترنج و بہی — میان ترنج و بہی بُد تہی
بدو اندروں مشک سودہ بمے — ہمہ پیکرش سفتہ برسان نے
کرا شاہ برگاہ بنشاندے — براو باد زاں مشک بفشاندے
بیامد نشست او بہ زرینہ تخت — بسر برش ریزندہ مشک از درخت
ہمہ مے گساراں بہ پیش اندرا — ہمہ بر سراں افسر از گوہرا
ہمہ طوق بر سینہ و گوشوار — بہ بر بر ہمہ جامہ زرنگار

(۲) افراسیاب نے جب اپنی بیٹی فرنگیس کی شادی سیاوش سے کی ہے، اور فرنگیس سیاوش کے گھر آئی ہے، تو اُس کی مہمانی اور عروسی کے ساز و سامان کو اس طرح بیان کیا ہے،

بہ گنج اینچہ بد اندروں نامدار — گزیدند زربفت چینی ہزار

ز برجد طبقها و فیروزه جام　　　پر از نافهٔ مشک و پر عود خام

دو افسر پر از گوهر گوشوار　　　دو یاره، یکی طوق و دو گوشوار

ز گستردنیها شتروار شصت،　　　ز زر ز بفت پوشیدنیها نشست

یکے تخت زرین و کرسی چہار　　　سہ نعلین زرین زبرجد نگار

پرستنده سی صد به زرین کلاه　　　ز خویشان نزدیک صد نیک خواه

پرستار با جام زرین دویست　　　تو گفتی به ایوان درون جای نیست

همی صد طبق مشک صد زعفران　　　همی رفت گلشہر با خواہران

اسفندیار کا تابوت رستم نے روانہ کیا تھا، تابوت کے مراسم دیکھو:

یکے نغز تابوت کرد آہنیں　　　بگسترد فرشے ز دیبائے چین

درا اندرو یک سرے آہن به قیر　　　پراگند بر قیر مشک و عبیر

وزاں پس که پوشید روشن برش　　　ز پیروزه بر سر نهاد افسرش

چہل اشتر آورد رستم گزین　　　ز بالا فروهشته دیبائے چین

یکے اشترے زیر تابوت شاه　　　چپ و راست اشتر پس اندر سپاه

پشوتن همی رفت پیش سپاه،　　　بریده فش و دم اسپ سیاه

بر و بر نهاده نگونسار زین،　　　ز زین اندر آویخته گرز کین

همان نامور خود و خفتان اوے　　　همان ترکش و مغفر جنگجوے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی امیر کا جنازہ نکلتا تھا تو لوہے کے

تابوت میں رکھکر لیجاتے تھے، تابوت کے ایک رخ کو سیاہ رنگ سے رنگ دیتے تھے،
پھر اس پر مشک و عنبر چھڑکتے تھے، میت کو کپڑے پہناتے تھے اور سر پر تاج رکھتے
تھے، تابوت کو اونٹ پر محمل میں رکھتے تھے، اور اس کے دائیں بائیں اور بہت سے
اونٹ ساتھ ساتھ چلتے تھے، پیچھے فوج ہوتی تھی، میت کی سواری کا گھوڑا ساتھ
ہوتا تھا، اس کی یال اور دم کاٹ دیتے تھے، زین اُلٹ کر رکھتے تھے، میت کے
اسلحۂ جنگ زین پر لٹکتے چلتے تھے،

تیسری خصوصیت

(۳) ایشیائی شعرا کا عام قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن و عشق
کا کہیں اتفاقی موقع آجاتا ہے، تو اس قدر پھیلتے ہیں، کہ تہذیب و متانت کی حد سے
کوسوں آگے نکل جاتے ہیں، نظامی اور جامی جیسے مقدس لوگ اس حمام میں آکر ننگے
ہو جاتے ہیں، لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ اس کو تقدس کا دعویٰ نہیں ایسے موقعوں
پر آنکھ نیچی کئے ہوئے آتا ہے، اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک
سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے، بیژن اور منیزہ کی صحبت عیش
کو جہاں لکھا ہے، لکھتا ہے،

نشستند گہ دو دو می ساختند ز بیگانہ خرگہ بپرداختند
پرستندگاں ایستادہ بپاے ابا بربط و چنگ رامش سراے
بہ دیبا زمیں کردہ طاؤس رنگ ز دینار و دیبا چو پشت پلنگ
چہ از مشک و عنبر چہ یاقوت و زر سراپردہ آراستہ سر بسر

مے سالخوردہ بہ جام بلور | برآوردہ با بیژنِ گیو زور

سہ روز و سہ شب شاد بودہ بہم | گرفتہ بر او خواب مستی ستم

زال اور رودابہ کے عاشقانہ اختلاط میں زیادہ پھیلا ہے، پھر بھی یہ رنگ ہی،

گرفت آں زماں دستِ دستاں بدست | برفتند ہر دو بکردار مست

سوئے خانۂ زرنگار آمدند | بداں مجلسِ شاہوار آمدند

شگفت اندراں ماہ بد زالِ زر | بداں روے و بالا و آں موی و فر

دو رخسارہ چوں لالہ اندر چمن | سر جعد زلفش شکن در شکن

ز دیدنش رودابہ می نارمید | بہ دزدیدہ در روے ہمی بنگرید

ہمی بود بوس و کنار و نبید | مگر شیر کو گور را نشکرید[1]

چوتھی خصوصیت

۴۔ عام خیال ہے کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا۔ بے شبہ یوسف زلیخا میں اسکی شاعری کا رتبہ بہت گھٹ گیا ہے، لیکن یہ اس کے رنج و غم اور دل شکستگی کا زمانہ تھا جب اس کے تمام جذبات افسردہ ہو چکے تھے۔ یوسف زلیخا لکھنے سے اس کا مقصد صرف مذہبی جماعت کو خوش کرنا تھا، جو اتنی بات پر فردوسی سے ناراض تھے کہ اس نے مجوسیوں کی مدح و ثنا میں کیوں اس قدر اوقات صرف کی، لیکن شاہنامہ میں جہاں جہاں بزم کا موقع آیا ہے، شاعری کا چمن زار نظر آتا ہے،

زال رودابہ پر عاشق ہوا ہی، اس کے شوق میں گھر سے نکلا ہی۔ اس کو خبر ہوتی ہے

[1] یعنی دیکھو شیر نے گورخر کو پاکر شکار نہیں کیا۔

وہ لبِ بام آکر کھڑی ہوتی ہے، زال کوٹھے کے برابر آکر اوپر جانے کی تدبیریں سوچتا ہے رودابہ اپنی چوٹی کھول کر لٹکا دیتی ہے کہ اس کے سہارے چڑھ آؤ، زال زلف کو بوسہ دیتا ہے، اور کمند ڈال کر کوٹھے پر اترتا ہے، دونوں مل جل کر بیٹھتے ہیں، لطف و محبت کی باتیں ہوتی ہیں، شراب کا دور چلتا ہے، یہ سماں دیکھو کس طرح دکھایا ہے،

سپہبد سوے کاخ بنہاد روے ۔۔۔ چناں چوں بود مردم جفت جوے
زال

برآمد سیہ چشم گل رخ بہ بام ۔۔۔ چو سرو سہی بر سرش ماہِ تام

چو از دور دستانِ سام سوار ۔۔۔ پدید آمد آں دخترِ نامدار
زال

یاقوت یعنی لب
دو بیجادہ بکشاد و آواز داد ۔۔۔ کہ شاد آمدی ای جواں مرد شاد

پریروی گفت و سپہبد شنود ۔۔۔ ز سر شعر گلنار بکشاد زود
زال

کمندی کشاد او ز سرو بلند ۔۔۔ کس از مشک زاں ساں نپیچد کمند

خم اندر خم و مار بر مار بود ۔۔۔ براں عنبریں تار بر تار بود

فروہشت گیسو ازاں کنگرہ ۔۔۔ کہ بازید و شد تا بہ بن یکسرہ
لٹک آیا

پس از بارہ رودابہ آواز داد ۔۔۔ کہ اے پہلواں بچۂ گرد زاد
قلعہ

بگیر ایں سر گیسو از یک سویم ۔۔۔ ز بہر تو باید ہمے گیسویم

بداں پروراندم ایں تار را ۔۔۔ کہ تا دستگیری کند یار را

نگہ کرد زال اندراں ماہروے ۔۔۔ شگفتی بماند اندراں روے و موے
متعجب

بسایید مشکیں کمندش بہ بوس ۔۔۔ کہ بشنید آواز بوسش عروس

چنیں داد پاسخ کہ ایں نیست داد | چنیں روز خورشید روشن مباد
کمند از رہے بستد و داد خم | بیفگند بالا، نزد ہیچ دم
بہ حلقہ درآمد سر کنگرہ | برآمد زبن تا بسر یکسرہ
چو بر بام آن بارہ بنشست باز | بیامد پری روے و بردش نماز

(آگے کے اشعار اوپر گذر چکے)

تم کہو گے کہ رودابہ نے زال کو کہیں جواں مرد، کہیں پہلوان بچہ کہہ کے خطاب کیا ہے، اور خود فردوسی رودابہ کی تعریف میں بالا اور فر وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے حالانکہ بزم کی لطافت اور نزاکت ان الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ فردوسی کی نکتہ سنجی اور بلاغت شعاری کی دلیل ہے، اس کو معلوم ہے کہ وہ کابل و زابلستان کے محبوب کا ذکر کر رہا ہے، لکھنؤ کا نہیں، وہاں کے لوگ آج بھی اپنے پیارے اور چہیتے کی نسبت یہی الفاظ بولتے ہیں، کابل کا معشوق لکھنؤ کی طرح دھان پان نہیں ہوتا، بلکہ بالیدہ قامت، پُر اندام، اور تنومند ہوتا ہے، اس لئے بالا اور فر کا لفظ وہاں کے معشوق کی اصلی تصویر ہے،

بیژن جب افراسیاب کی سرحد میں پہنچتا ہے، تو گرگین نے اس سے بیان کیا کہ یہاں سے پاس ایک مرغزار ہے، جہاں سال میں ایک دفعہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کو آتی ہے، اور ہفتوں رہتی ہے، دیکھو فردوسی نے اس موقع پر مرغزار کی بہار اور پری رویوں کے جھرمٹ کی تصویر کس طرح کھینچی ہے،

ہمہ بیشۂ و باغ و آب رواں	یکے جایگاہ از درِ پہلواں
زمیں پرنیان و ہوا مشک بوے	گلابست گوئی مگر آب جوی
خم آوردہ از بار شاخ سمن	صنم شد گل و گشت بلبل شمن
خراماں بہ گرد گلاں بر تدرو	خروشیدنِ بلبل از شاخ سرو
پریچہرہ بینی ہمہ دشت و کوہ	بہر سو بہ شادی نشستہ گروہ
ہمہ دخت ترکانِ پوشیدہ رو[1]	ہمہ سرو قد و ہمہ مشک بوے
ہمہ رخ پر از گل، ہمہ چشم خواب	ہمہ لب پُر از مے بہ بوی گلاب

اخیر شعر پر غور کرو "ہمہ چشم خواب"، کے مبالغہ اور بیانگی پر متاخرین کے ہزاروں تکلفات اور مضمون آفرینیاں نثار ہیں

ایک اور موقع پر ایک پریچہرہ کی تصویر کھینچتا ہے،

دو ابرو کمان و دو گیسو کمند	بہ بالا بہ کردارِ سرو بلند
دو برگِ گلش سوسن می سرشت	دو شمشاد عنبر فروش از بہشت (بطور)
بنا گوش تابندہ خورشید وار	فروہشتہ زو حلقۂ گوشوار
لباں از طبرزد زباں از شکر	دہانش مکلل بہ درّ و گہر،

ان سادہ اور فطری مبالغوں کو دیکھو "لباں از طبرزد زباں از شکر" (مصری) لیکن یہ نہ سمجھنا کہ وہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تکلفات سے عہدہ بر آ نہیں

---

[1] اس سے ثابت ہوتا ہو کہ پردہ کی رسم ایرانیوں میں بھی قدیم سے ہے،

ہوسکتا، اس انداز میں بھی وہ کسی سے کم نہیں،

بہ دنبال چشمش یکے خال بود	کہ چشم خودش ہم بدنبال بود

سہراب نے جب ایران کی سرحد میں پہنچ کر قلعہ سپید کا محاصرہ کیا ہے تو قلعہ سے ایک عورت مردانہ لباس پہن کر نکلی ہے، اور سہراب سے جنگ آزما ہوئی ہے، دیر تک رد و بدل کے بعد سہراب نے اسکو گرفتار کیا، جبکہ چہرے سے ہٹی تو معلوم ہوا کہ عورت ہے، سہراب فریفتہ ہوگیا، لیکن عورت فریب دیکر نکل گئی، سہراب اب ستمگری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا، دیکھو فردوسی اسکے نالہ وزاری کو کس طرح ادا کرتا ہے،

ہمی گفت ازاں پس دریغا دریغ	کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ
غریب آہوئے آمدم در کمند	کہ از بند جست و مرا کرد بند
عجب ہرن میری کمند میں آیا	کہ خود چھوٹ کر نکل گیا اور مجھکو قید میں ڈال گیا
زہی چشم بندے کہ آں پر فسوں	بہ تیغم نخست و مرا ریخت خوں
اس شعبدہ کو دیکھو کہ اس جادوگر نے	مجھکو تلوار نہیں ماری لیکن میں قتل ہوگیا
ندانم چہ کرد آں فسونگر بمن	کہ ناگہ مرا بست راہ سخن
بہ زاری مرا خود بباید گریست	کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست
ہمی گفت و میسوخت از غم بسے	ہمی خواست رازش بداند کسے
ولے عشق پنہاں نماند کہ راز	بہر دم نماید ہمی اشک باز
غم جاں برآرد خروش از دروں	اگرچند عاشق بود ذوفنوں

ہرچند

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں، استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے، شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں، ع کہ از بند جست و در کرد بند، ع بہ تیغم بہ خست و مرا ریخت خوں، یہ سب کچھ ہے، لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی داستان لکھ رہا ہے، محمد شاہ و واجد علی شاہ کی نہیں، اسلئے فوراً سہراب کو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہے، اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہے،

از آں کار ہوماں بنو دش خبر	کہ سہراب را ہست خوں در جگر
ولے از فراست بدل نقش بست	کہ او را پریشانیے داد دست
بہ دام کسے پائے بند آمدہ است	ز زلف بتے در کمند آمدہ است
نہاں میکند درد و خونیں دل است	ہوس میرود راہ و پا در گل است
یکے فرصتے جست و گفتش بہ راز	کہ اے شیر دل گرد گردن فراز
فریب پری پیکراں جواں	نخواہد کسے کو بود پہلواں
نہ رسم جہانگیری و سروری است	کہ از مہر ماہے بباید گریست
ز توراں بہ کارے بروں آمدیم	شناور بدریائے خوں آمدیم
اگرچند ایں کار باشد بہ کام	ولے ہست در پیش رنجے تمام
بباید شہنشاہ کاؤس و طوس	چو رستم کہ بر شیر دارد فسوس

(یعنی ہوس میرود)

ہرچند

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کہتا ہے،

توئی مردِ میدانِ این سروران | چہ کارت بہ عشق پری پیکران
تو کارے کہ داری نہ بُردی بسر | چرا دست بازی بہ کارِ دگر
بہ نیروی مردی جہاں راگبیر | ز شاہاں بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدستِ تو آید فراز | بہر جائے خوباں برندت نماز
ازاں گفتہ سہراب بیدار شد | دلش بستۂ بند پیکار شد
بگفت اے سرِ نامدارانِ چین | بگفتار خوبت ہزار آفرین
شد این گفت تو داروی جانِ من | کنون با تو نو گشت پیمانِ من
جہاں را سراسر چہ خشک و چہ آب | در آرم بفرمانِ افراسیاب
بگفت این و دل راز دلبر بکند | بر آمد بر افرازِ تختِ بلند

دیکھو شجاع دامِ عشق میں اتفاقاً پھنس بھی جاتا ہے تو کس طرح جلد چھوٹ کر نکل جاتا ہے، فردوسی نے موقع پاکر عشقیہ شاعری کا کمال بھی دکھلا دیا، اور پھر متانت اور شائستگی کا سرِ رشتہ بھی ہاتھ سے نہ چھوٹا، متاخرین بلکہ نظامی و سعدی کو بھی اتنا سہارا ہاتھ آجاتا تو خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے،

پانچویں خصوصیت

(۵) شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذباتِ انسانی کا اظہار ہے ان دونوں باتوں میں وہ تمام شعرا کا پیشرو اور امام ہے، وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے، اسکے تمام جزئیات اور گردوپیش کے ہر قسم کے حالات اور واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے پھر انکو اس خوبی کیساتھ ہو بہو ادا کرتا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور شعرا نو

واقعہ کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ڈالنا ضروری نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں لیکن طبیعت
فطرت شناس نہیں ہوتی، اس لئے باریک باتوں پر نظر نہیں پڑتی یا پڑتی ہے لیکن زبان پر قدرت
نہیں کہ جوں کا توں ادا کر دیں، اس لئے یا بات کو بدل کر کہتے ہیں یا استعارات و تشبیہات
کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، تم دیکھتے ہو کہ فردوسی استعارہ کے پاس ہو کر نہیں نکلتا، تشبیہیں
وہی پاس پاس کی لیتا ہے، مجاز کو بہت کم ہاتھ لگاتا ہے، اسکی یہ وجہ نہیں کہ وہ ان باتوں
میں قاصر ہے، بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں واقعہ کے چہرہ پر نقاب ڈالدیتی ہیں اور اس کا
اصلی خط و خال نظر نہیں آتا، غور کرو، یہ لکھنا مقصود ہے کہ خاقان چین ہاتھی پر ہے، رستم نے
کمند پھینکی اور اسکو گرفتار کر کے ہاتھی سے پٹک دیا، فردوسی اسکو اسطرح ادا کرتا ہے،

چو از دست رستم رہا شد کمند ‌ ‌ ‌ ‌ سر شہریار اندر آمد بہ بند

ز پیل اندر آوردو زد بر زمیں، ‌ ‌ ‌ ‌ بہ بستند بازوے خاقان چین،

نظامی کو اسی قسم کا موقع پیش آتا ہے وہ کہتے ہیں،

کمند عدو بند را شہریار ‌ ‌ ‌ ‌ بینداخت چوں چنبر روزگار

بے شبہہ عدو بند کے لفظ سے جملہ کی ترکیب چست ہو گئی "چنبر روزگار" کی تشبیہ نے
بھی ندرت پیدا کی، یہ سب کچھ ہوا لیکن سننے والے پر یہ اثر ہوا کہ اصل واقعہ کے بجائے
اسکی توجہ الفاظ اور تشبیہ کی طرف متوجہ ہو گئی، اور کمند میں گرفتار ہونے کی اصلی حالت
سامنے نہ آسکی، یہی نکتہ ہے کہ فردوسی واقعات اور جذبات کے بیان کرنے میں استعارات
اور تشبیہات وغیرہ سے بہت کم کام لیتا ہے، اور جب اسکو طباعی اور انشاپردازی کا

زور دکھانا ہوتا ہے، تو دوسرے موقع تلاش کرتا ہے، چنانچہ اسکی تفصیل آگے آتی ہے،

واقعہ نگاری کے دقیق نکتوں پر اس کی نظر جس طرح پڑتی ہے، اس کی ایک دو مثالیں ہم لکھتے ہیں،

پہلوان جب جوش شجاعت میں لبریز ہوتا ہے تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ لڑائی بھڑائی کچھ نہیں، تنہا بیٹھا ہے لیکن آپ ہی آپ بپھرا پڑتا ہے، اور جوش میں آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، سہراب جب ایرانی فوج کے ایک ایک سردار پر نظر ڈال کر ہجیر سے انکا نام و نشان پوچھتا ہے تو اس کی نظر رستم پر پڑتی ہے، اور ہجیر سے کہتا ہے، یہ کون شخص ہے جس کی یہ حالت ہے کہ

بجوشد ہمی ہر زماں بر خروشد ہمے | تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے

آپ ہی آپ بپھر رہا ہے | اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دریا جوش مارتا ہے

ایک جسیم اور تناور پہلوان کبھی تخت پر بیٹھا ہوتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے تخت پر چھایا جاتا ہے، اس حالت کو فردوسی نے اس موقع پر جب رستم سہراب کے دیکھنے کو گیا ہے اور سہراب تخت پر بیٹھا ہوا اپنے پہلوانوں سے باتیں کر رہا ہے اس طرح ادا کیا ہے، ع تو گفتی ہمہ تخت سہراب بود

سہراب نے کیکاؤس کے خیمہ کے پاس جا کر برچھی سے خیمہ کی میخیں اکھاڑ کر پھینکدی ہیں فردوسی اس واقعہ کو اس طرح ادا کرتا ہے،

ازاں پس بجنبید از جائے خویش | بہ نزدیک پردہ سرا رفت پیش

خم آورد و پشت و سنان ستیخ | بزد تند و برکند ہفتاد میخ،
سراپردہ یک بہرہ آمد ز پائے | زہر سو برآمد دم کرہ نائے

عام شعرا اگر اس واقعہ کو لکھتے تو صرف اس پر قناعت کرتے کہ سہراب نے میخیں اکھاڑ کر پھینکدیں، لیکن یہ خصوصیات کہ "وہ جھکا، جھک کر زور سے نیزہ مارا، ستر میخیں اکھاڑ کر پھینکدیں خیمہ کا ایک حصہ گر پڑا" نظرانداز کر جاتے، حالانکہ واقعہ کی تصویر کھینچنے کے لئے ان تمام باتوں کا ادا کرنا ضروری ہے،

اسی تفصیلی واقعہ نگاری کی بدولت ہمکو بہت سے ایسے محاروں تک رسائی ہوتی ہے جو یوں کبھی عام طریقہ بیان میں نہیں آسکتے تھے،

مثلاً سہراب نے جب رستم کو گرز مارا ہے تو رستم تلملا جاتا ہی، مگر ضبط سے کام لیتا ہے اور سہراب پر ظاہر نہیں ہونے دیتا، اس واقعہ کو اردو کا محاورہ داں صرف اس لفظ سے ادا کریگا کہ "پی گیا"، فردوسی نے بھی صرف محاوروں سے کام لیا، چنانچہ کہتا ہے، ع بہ پیچید و درد از دلیری بخورد، رستم ایک معرکہ میں صرف کمند ہاتھ میں لیکر گیا ہے، حریف سے سوال جواب ہوئے تو اس نے طنز سے کہا کہ "اس دھاگے کے بل پر بہت نہ اتراؤ"، فردوسی اس طنزیہ محاورہ کو بعینہٖ اسی طرح ادا کرتا ہی،

بدو گفت ہومان کہ چندیں مدم | بہ نیروے ایں رشتہ شصت خم

واقعہ نگاری کی مثالوں سے تمام شاہنامہ بھرا پڑا ہے، ہم نمونہ کے طور پر ایک مختصر لیکن مسلسل داستان یہاں نقل کرتے ہیں،

یہ وہ موقع ہے کہ سہراب ایک ایرانی پہلوان کو لیکر کیکاؤس کے لشکر گاہ کو دیکھنے چلا ہے، فوجیں اپنے اپنے افسروں کے ساتھ الگ الگ ساز و سامان سے آراستہ ہیں، سہراب ایک ایک پر نگاہ ڈالتا جاتا ہے اور ہر ایک کا نام و نشان پوچھتا ہے، ایرانی پہلوان جواب دیتا ہے،

بدو گفت کز تو بپرسم ہمہ	ز گردن کشان و ز شاہ و رمہ
سراپردۂ دیبۂ رنگ رنگ	بدو اندروں خیمہ ہاے پلنگ (فوج)
بہ پیش اندروں بستہ صد ژندہ پیل (کمخواب)	یکے تخت پیروزہ بر سان نیل
یکے زرد خورشید پیکر درفش[ل] (نشان)	سرش ماہ زرین، غلافش بنفش (فیروزہ) (بنفشی رنگ کا)
بہ قلب سپاہ اندروں جاے کیست (علم)	ز گردان ایران ورا نام چیست
بدو گفت کاں شاہ ایران بود	کہ بر در گہش پیل و شیراں بود
وزاں پس بدو گفت کز میمنہ	سواران بسیار و پیل و بنہ
سراپردۂ برکشیدہ سیاہ	بدو گرد وش اندر ستادہ سپاہ (اسباب)
بگرد اندرش خیمہ ز اندازہ بیش	پس پشت پیلاں و شیراں بہ پیش (صف لطیف)
زدہ پیش او پیل پیکر درفش	بہ نزدش سواراں زرینہ کفش
چہ باشد ز ایرانیاں نام اوے	بگو تا کجا باشد آرام اوے
چنیں گفت کاں طوس نوذر بود	درفشش کجا پیل پیکر بود

ل خورشید پیکر یعنی آفتاب کی صورت کا،

بپرسید کاں سرخ پردہ سرائے — یکے لشکرے گشن پیش بپائے
قوی

یکے شیر پیکر درفش بنفش — درافشاں گہر درمیان درفش

پس پشتش اندر سپاہی گراں — ہمہ نیزہ داران جوشن وراں

چنیں گفت کاں فر آزادگاں — سپہدار گودرز کشوادگاں

سپہ کش بود گاہ کینہ دلیر — دو چل پور دارد چو پیل و چو شیر

اب رستم کی باری آتی ہے،
ہا

دگر گفت کاں سبز پردہ سرائے — بزرگان ایراں بہ پیشش بپائے

یکے تخت پرمایہ اندر میاں — زدہ پیش او اختر کاویاں
علم

بر او بر نشستہ یکے پہلواں — ابا فرو با سفت و یال گواں
شانہ بازو پہلوان

ازاں کس کہ بر پائے پیشش براست — نشستہ بیک سر از او بر تر است

جو شخص سامنے کھڑا ہے — رستم کا قد اس سے بیٹھنے کی حالت میں بھی نکلا ہوا ہے

بہ ایراں نہ مردے بہ بالائے او — کمندے فروہشتہ تا پائے او،

درفشش ببیں اژدہا پیکر است — بر آں نیزہ بر شیر زریں سر است
علم

بجوید ہمی زماں برخروشد ہمے — تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے
ہا

کہ باشد؟ بنام آں سوار دلیر — کہ ہر دم ہمی برخروشد چو شیر

ہجیر نے رستم کا نام بدل کر بتایا، سہراب باور افسروں کا حال پوچھتا ہے،

وزاں پس بپرسید کز مہتراں — کشیدہ سراپردہ بر کراں،
الگ

سواران بسیار و پیلان بپای | برآید ہمے نالۂ کرّ نائے ،
میان سراپردہ تختے زدہ ، | ستادہ غلامان بہ پیشش زدہ
زایران بگو نام آن مرد چیست | کجا جائے وارد نژادش زکیست
چنین گفت کان پور گودرز گیو | کہ خوانند گردان ورا گیو نیو ،
زگودرزیان بہتر و مہتر است | بہ ایران سپہ بر دو بہرہ سر است
بدو گفت زان سو کہ تابندہ شید | برآید یکے پردہ بینم سپید ،
ز دیباے رومی بہ پیشش سوار | زدہ برکشیدہ فزون از ہزار
پیادہ سپردار و نیزہ وران | شدہ انجمن لشکرے بیکران
ز دیبا فروہشتہ زیبا جلیل | غلام ایستادہ زدہ خیل خیل
نشستہ سپہدار بر تخت عاج | نہادہ بران عاج کرسی ساج
چہ نام است اورا ز نام آوران | سپہد نژاد است یا سروران
بدو گفت کورا فرابرز خوان | کہ فرزند شاہ است و تاج گوان
بدو گفت سہراب کیں درخور است | کہ فرزند شاہ است و با افسر است

واقعہ نگاری جب اس حد تک پہنچ جاتی ہے تو اسکو مرقع نگاری یعنی آج کل کے محاورہ میں سین دکھانا کہتے ہیں،

جذبات | رزمیہ میں درد و غم کے اظہار کا کم موقع پیش آتا ہے، اور آئے بھی تو بلاغت یہ ہے کہ اس کو زیادہ پھیلایا نہ جائے، تاہم کہیں کہیں اسکا موقع پیش آگیا ہے تو فردوسی نے

چھٹی خصوصیت

اس میں بھی کمال دکھایا ہے، سہراب کے مرنے کی خبر سنکر اس کی ماں کی جو حالت ہوئی ہو/ اور جس طرح اُس نے نالۂ وزاری کی ہے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

خروشید و جوشید و جامه درید ۔۔۔ بزاری بران کودک نارسید (نوجوان)

برآورد بانگ غریو و خروش ۔۔۔ زمان تا زمان زو همی رفت هوش

فرو برد ناخن دو دیده بکند (آنکھیں نکال ڈالیں) ۔۔۔ برآورد بالا در آتش فگند (دمبدم)

مر آن زلف چون تاب داده کمند ۔۔۔ بانگشت پیچیده و از بن بکند

بسر بر فگند آتش و بر فروخت ۔۔۔ همه موی مشکیں به آتش بسوخت

همی گفت کاے جانِ مادر کنوں ۔۔۔ کجائی بسرشته بخاک و بخوں

دو چشمم به ره بود گفتم مگر، ۔۔۔ ز سهراب و رستم بیابم خبر

چه دانستم اے پور کاید خبر ۔۔۔ که رستم بخنجر دریدت جگر

دریغش نیامد ازاں روے تو ۔۔۔ ازاں برز و بالاؤ بازوے تو

بپرورده بودم تنش را بناز ۔۔۔ برخشنده روز و شبان دراز

کنوں آں بخوں اندروں غرقه گشت ۔۔۔ کفن بر تنِ پاک او خرقه گشت

کنوں من کرا گیرم اندر کنار ۔۔۔ که خواهد بدن مر مرا غمگسار

پدر جستی اے گرد لشکر پناه ۔۔۔ بجاے پدر گورت آمد براه

چرا نامدم با تو اندر سفر، ۔۔۔ که گشتی بگردانِ گیتی سمر (مشہور)

مرا رستم از دور بشناختے، ۔۔۔ ترا با من اے پور بنواختے

بینداخت تیغ آں سرفراز — نکردے جگرگاہت اے پور باز
ہمی گفت ومی خست ومی کند موے — ہمیزد کف دست بر خوب روے
زخون او ہمی کرد لعل آب را — بہ پیش آوریدا اسپ سہراب را
سر اسپ او بہ بر در گرفت — بماندہ جہانے درو در شگفت
گہے بوسہ زد بر سرش گہ بروے — زخون زیر سمش ہمی راند جوے
بیاورد آں جامۂ شاہوار — گرفتش چو فرزند اندر کنار
بیاورد خفتان و درع و کمان — ہماں نیزہ و تیغ و گرز گراں
بسر برہمی زد گراں گرز را — ہمے یاد کرد آں بر و برز را
بیاورد زین و لگام و سپر — لگام و سپر را ہمی زد بہ سر

سہراب کی ماں نے جو کچھ کہا ہے کس قدر سچ اور کس قدر پرتاثیر ہے، سہراب کے گھوڑے کو گود میں لینا، اس کے ہاتھ پاؤں چومنا، سہراب کے کپڑوں کو بچہ کی طرح آغوش میں لینا، ہتھیاروں کو سر پر مارنا، کس قدر اصلی حالت کی سچی تصویر ہے۔

بیژن ایرانی پہلوان تھا، افراسیاب کی لڑکی منیژہ اس پر عاشق ہوگئی اور چوری سے لیجا کر گھر میں رکھا جب افراسیاب کو خبر ہوئی تو اس نے بیژن کو ایک کنوئیں میں قید کر دیا، اور منیژہ کو گھر سے نکال دیا، منیژہ بیژن کی تیمارداری اور خبرگیری کرتی تھی، رستم بیژن کے چھڑانے کو سوداگر بن کر گیا، اور توران پہنچکر تجارت کے سامان پھیلائے منیژہ کو خبر ہوئی، دوڑی ہوئی آئی اور رستم سے بیژن کے حالات بیان کیے، رستم

نے اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہو جائے، منیزہ کو جھڑک دیا کہ میں بیژن و یژن کو کچھ نہیں جانتا، منیزہ دل شکستہ ہو کر کہتی ہے،

به رستم نگه کرد و بگریست زار — ز خواری بیارید خون در کنار

بدو گفت کای مہتر بہرہ خرد — ز تو سرد گفتن نہ اندر خورد،

رستم سے کہا کہ اے سردار — اس طرح رکھائی سے جواب دینا آپکے شایاں نہیں

سخن گر نہ گوئی مرانم ز پیش — کہ من خود دلے دارم از درد ریش

اگر بات نہیں کرتے تو نہ کرو لیکن مجھکو کہدیتے کیوں ہو — میرا دل تو خود مصیبت سے زخمی ہو رہا ہی،

چنیں باشد آئین ایران مگر — کہ درویش را کس نہ گیرد خبر،

کیا ایران کا یہی دستور ہے — کہ لوگ غریبوں سے بات نہیں کرتے

زدی بانگ بر من چو جنگ آوران — نہ ترسی تو از داور داوران

مجھکو پہلوانوں کی طرح ڈانٹ بتاتے ہو — تمکو بادشاہ ہونیکے بادشاہ (خدا) کا کچھ ڈر نہیں

منیزہ منم دخت افراسیاب — برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

کنوں دیدہ پر خون و دل پر ز درد — ازیں در بداں در دو رخسارہ زرد

برائے یکے بیژن شور بخت — فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

اختصار اور زور

بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں، کہ کسی واقعہ کے بیان کرنے میں جب حد سے زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے، تو لمبی چوڑی تمہید اور تفصیل وہ کام نہیں دیتی جو ایک پر زور مختصر جملہ کام دیتا ہے، قرآن مجید میں؛ اوحی الی عبدہ ما اوحی غشیہم من الیم ما

غشتیہ میں جو بات ہے وہ سینکڑوں جملوں سے ادا نہیں ہو سکتی، روم کے فاتح کا مشہور جملہ تم نے سنا ہوگا، "میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کیا"، شاہنامہ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، سہراب کی پر درد داستان اس شعر سے شروع کی ہے،

کنوں جنگِ سہراب و رستم شنو ··· دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

صرف "ایں ہم" نے جو بات پیدا کی ہے ہزاروں تمہید سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی، رستم افراسیاب کو ایک خط لکھتا ہے اور تہدید کے وسیع مضمون کو ایک مصرع میں ادا کرتا ہے،

دگر نہ بکامِ من آمد جواب ··· من و گرز و میدان و افراسیاب

نظامی نے اپنے فخریہ میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں، لیکن فردوسی کے دو مصرع سب پر بھاری ہیں،

بسے رنج بردم دریں سال سی ··· عجم زندہ کردم بدیں پارسی

رستم کی مار دھاڑ، ہنگامہ آرائی اور قتال و جدال کا سماں صرف چار مصرعوں میں دکھایا ہے،

بروزِ نبرد آں یلِ ارجمند ··· بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند

درید و برید و شکست و ببست ··· یلاں را سر و سینہ و پا و دست

صلاح و مشورہ کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، اسی میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے، لوگ کھاپی کر، اٹھ کھڑے ہوئے، اسکو اس طرح ادا کرتا ہے،

پے مشورہ مجلس آراستند | نشستند و گفتند و برخاستند

آٹھویں خصوصیت

۸۔ صنائع بدائع، شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں، اسلئے فردوسی کے کلام میں اس کو ڈھونڈھنا نہیں چاہیے، لیکن جو محاسن شاعری ضمناً کسی صنعت میں آجاتے ہیں، اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں، اور اعلیٰ درجہ پر پائے جاتے ہیں، مثلاً

لفّ و نشر مرتب

بہ روز نبرد آن یلِ ارجمند | بہ شمشیر و خنجر بگرز و کمند
دریدو بریدو شکست و ببست | یلاں را سر و سینہ و پا و دست

لف و نشر مع طباق و مقابلہ،

فرو شد بہ ماہی و بر شد بہ ماہ | بن نیزہ و قبہ بارگاہ

مبالغہ

زبس گرد میداں کہ بر شد بہ دشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت،

رزمیہ شاعری

رزمیہ شاعری جس کو انگریزی میں ایپک پوئم کہتے ہیں، شاعری کے انواع میں سے بہترین انواع ہے یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے، اس کا کارنامہ فخریہ رزمیہ شاعری ہے، مہابھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے، اور اگر ان دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دیجا سکتی ہے تو وہ شاہنامہ ہے،

رزمیہ شاعری کے کمال کے چند شرائط ہیں، واقعہ ایسا مہتم بالشان ہو جس نے دنیا کی تاریخ میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا ہو، لڑائی کے ہنگامہ کا بیان اس زور

شوراور پر رعب طریقہ سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں معرکۂ جنگ کے تمام ساز و سامان
اور آلات و اسلحۂ جنگ تفصیل سے بیان کئے جائیں، سالار فوج اور مشہور بہادروں کی لڑائی
کے بیان میں لڑائی کے تمام داؤں پیچ ایک ایک کرکے دکھائے جائیں، شاہنامہ
میں یہ تمام باتیں اعلیٰ درجہ پر پائی جاتی ہیں،

ہنگامۂ جنگ اور مجلس،

ز لشکر برآمد سراسر خروش   زمیں پرخروش و ہوا پرخروش
جہاں لرزلرزاں شد و دشت و کوہ   زمیں شد ز نعل ستوراں ستوہ
درفش از درفش و گروہ از گروہ   گسستہ نشد شب برآمد ز کوہ
درخشیدن تیغہائے بنفش   ازاں سایۂ کاویانی درفش
تو گفتی کہ اندر شب تیرہ چہر   ستارہ ہمے برفشاند سپہر
زمیں گشت جنباں چو ابر سیاہ   تو گفتی ہمے برنتابد سیاہ،
بلند آسماں چوں زمیں شد ز خاک   ز ہر سو ہمی شدہ چاک چاک
دل کوہ گفتی بدرد ہمے   زمیں باسواراں ببیزد ہمے
زبس نعرہ نالہ کرنائے   ہمے آسماں اندر آمد ز جائے
چناں تیرہ شد روئے گیتی ز گرد   تو گفتی کہ خورشید شد لاجورد
بزد مہرہ بر کوہ ژندہ پیل   زمین جنب جنباں چو دریائے نیل
ز گرد سواراں ہوا بست میغ   چو برق درخشندہ پولاد تیغ
ز جوش سواران و آواز کوس   ہوا قیرگوں شد زمیں آبنوس

تو گفتی زمیں موج خواہد زدن | وزاں موج بر اوج خواہد زدن
ز بس گرد میداں کہ برشد بدشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
ز بس نیزہ و گرز و گوپال و تیغ | تو گفتی ہوا ژالہ بارد ز میغ
ز کشتہ ہمہ دشت آوردگاہ | تن و دست و سر بود و ترک و کلاہ
بجوشید دشت و بتوفید کوہ | ز جوش سواران ہر دو گروہ
تو گفتی کہ روی زمیں آہن است | ز نیزہ ہوا نیز در جوشن است

شاہنامہ میں لڑائی کے سامان اور اسلحۂ جنگ کی اس قدر تفصیل پائی جاتی ہے، کہ ہم یہ تفصیل بتا سکتے ہیں، کہ آج سے دو ہزار برس پہلے آلاتِ جنگ کیا کیا تھے، پہلوان اور بہادر کیا کیا ہتھیار لگاتے تھے، لباسِ جنگ کیا کیا تھے، مثلاً لڑائی کے وقت جو باجے استعمال ہوتے تھے، اُن کے یہ نام ہیں، تبیرہ، گاؤدم، خرمہرہ، کوس، طبل، نقارہ، کرنائے، سرغن،

اسلحۂ جنگ یہ تھے، زرہ، جوشن، خود، مغفر، چار آئینہ، خفتان، ترک، ببربیان، برگستوان،

آلات اور سامانِ جنگ یہ تھے، گوپال، گرز، تیغ، سپر، درفہ، خنجر، ژوپیں، ناوک، خشت، تیر، خدنگ، کمند، سناں، نیزہ، ژوپین، پرتاب، تبرزیں، دبوس، قارورہ، شراع، عرادہ، رایت، علم، درفش، اختر، سراپردہ،

اقسام فوج، قلب، میمنہ، میسرہ، طلایہ، ساقہ۔ و مدار،

اُس زمانہ میں مجموعی فوج کے لڑانے کا فن نہ تھا، اس لئے یہ پتہ نہیں لگتا کہ سپہ سالار کس طریقہ سے فوج کو لڑاتے تھے، رستم اگرچہ سپہ سالار تھا اور شاہنامہ سرتاپا گویا اسی کی داستان ہے تاہم کہیں یہ پتہ نہیں لگتا، کہ اُس نے فوج کو کیونکر لڑایا، طریقۂ جنگ یہ تھا کہ ایک ایک پہلوان میدان میں آتا تھا، اور معرکہ آرا ہوتا تھا، ان معرکہ آرائیوں کو فردوسی اس تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے،

لڑائی کے جتنے طریقے تھے یعنی کشتی لڑنا، تلوار چلانا، تیر مارنا، کمند پھینکنا، برچھی چلانا وغیرہ وغیرہ شاہنامہ میں سب بہ تفصیل پائے جاتے ہیں، اور جس چیز کو جہاں لکھا ہے، اس طرح لکھا ہے کہ اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے،

کمند اندازی

تہمتن ز الوای شد دردمند ‏— ز فتراک بکشاد پیچاں کمند

چو آہنگ رزم یلاں داشتے ‏— کمندے دگر نیز گراں داشتے

بیامد بغرید چوں پیل مست ‏— کمندے بہ بازو دگر نیز بدست

بدو گفت کاموس چندیں مدم ‏— بہ نیروے ایں رشتۂ شصت خم

بر انگیخت کاموس جنگی نبرد ‏— ہم آورد را دید باز در و برد

بینداخت تیغ پرند آورش ‏— ہمی خواست از تن گسستن سرش

سر تیغ بر گردن رخش خورد ‏— ببرید برگستوان نبرد،

نیامد تن رخش را زاں گزند ‏— گو پیلتن، حلقہ کرد آں کمند

پہلوان

بینداخت و افگندش اندر میاں ۔۔۔ برانگیخت اندر جاے رخشِ دماں

به راں اندر آورد و گردش دواں ۔۔۔ عقابے شده رخش با پر و بال

به رای و دلیری بنفیثر وراں ۔۔۔ گراں شد رکیب و سبک شد عناں

همی خواست آں خام خم کمند ۔۔۔ به نیروی تن بگسلاند ز بند

شد از هوش کاموس و نگسست خام ۔۔۔ گوِ پیلتن رخش را کرد رام

عناں را بپیچید و اوداز زیں ۔۔۔ نگوں اندر آورد و زد بر زمیں

دو دست از پسِ پشت بستش چو سنگ ۔۔۔ به خم کمند اندر آورد چنگ،

تیراندازی

تہمتن به بند کمر برد چنگ ۔۔۔ گزیں کرد یک چوبه تیر خدنگ

خدنگی بر آورد پیکاں چو آب ۔۔۔ نهاده بر و چار پر عقاب

بمالید چاچی کماں را بدست ۔۔۔ به چرم گوزن اندر آمد شکست

ستوں کرد چپ را و خم کرد راست ۔۔۔ خروش از خم چرخ چاچی بخاست

چو سوفارش آمد به پہنای گوش ۔۔۔ ز چرم گوزناں بر آمد خروش

چو پیکاں ببوسید انگشتِ او ۔۔۔ گزر کرد از مہرۂ پشت او،

چو زد تیر بر سینه اشکبوس ۔۔۔ سپهر آں زماں دست او داد بوس

قضا گفت گیر و قدر گفت ده ۔۔۔ فلک گفت احسن، ملک گفت زه

تیرہ بازی

برآشفت سہراب شد چوں پلنگ ۔۔۔ چو بدخواه او چاره جو شد به جنگ

عناں بر گرائید و برداشت اسپ ۔۔۔ بیامد به کردار آذر گشسپ

چو آشفته شد شیر تندی نمود — سر نیزه را سوی او کرد زود

بدست اندرون نیزهٔ جانستان — پس پشت خود گردش آنگه سنان

بزد بر کمر بند گرد آفرید — زره بر تنش یک بیک بردرید

ز زین برگرفتش بکردار گوی — که چوگان ز باد اندر آید بروی

کشتی گیری

گرفتند ازاں پس دوال کمر — دو اسپ تگاور برآورده بر

یکے بد بدست یل اسفندیار — بدست دگر رستم نامدار

نیرو کشیدند زی خویشتن — دو گرد سرافراز دو پیلتن

همی زور کرد این ازان آن برین — نه جنبید یک مرد بر پشت زین

کف اندر دهان شان شده خون و خاک — همه گبر و برگستواں چاک چاک

چو رستم ورا دید بفشرد ران — بگردن برآورد گرز گران

چو تنگ اندر آورد با او زمین — فرو کرد گرز گران را بزین

شاہنامہ کا اثر

شاہ نامہ کے مقبولِ عام ہونے کے مخالف بہت سے اسباب جمع تھے۔ سب سے مقدم یہ کہ وہ سرتاپا غیر قوموں کا کارنامہ تھا اور مسلمانوں کا جہاں جہاں ذکر آگیا تھا نہایت حقارت سے انکو یاد کیا تھا،

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار

که تختِ کیان را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

قادسیہ کے معرکہ میں مسلمانوں نے بے نظیر شجاعت کے جوہر دکھائے

تھے فردوسی نے اس کو بھی مدہم کر کے دکھایا تھا، اس بات پر مذہبی گروہ میں عام ناراضی پھیلی، چنانچہ اسی زمانہ میں عمر نامہ[1] ایک کتاب لکھی گئی، جس کے دیباچہ میں سبب تالیف یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایرانیوں کے جھوٹ سچ قصے لکھ کر ملک میں مشہور کر دیئے، اسلئے یہ کتاب حضرت عمر فاروق کے حالات میں لکھی گئی، کہ لوگوں کی توجہ ادھر سے ہٹ جائے،

چونکہ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو لکھ کر شاہنامہ میں اس کو منضم کر دیا تھا اس لئے لوگ شاہنامہ کو ہاتھ لگاتے ڈرتے تھے، فردوسی چونکہ معتوبِ شاہی تھا، اس لئے بھی اسکی تصنیف مقبولِ عام نہ ہو سکی ہوگی،

یہ سب تھا، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ خراسان سے لیکر بغداد تک در و دیوار سے شاہنامہ کی صدا آنے لگی، تقریر و تحریر، تصنیف و تالیف، خلوت و جلوت کوچہ و بازار، اس کی آواز بازگشت سے گونج اٹھے، لوگ جب کام سے فارغ ہو کر بیٹھتے تو کوئی خوش لہجہ شخص، حفظ شاہنامہ کے اشعار پڑھتا، اور شجاعت و جانبازی، دلیری، حبِ وطن کا اثر تمام مجلس پر چھا جاتا،

سیکڑوں برس تک، سلاطین و امرا کی باہمی خط و کتابت میں شاہنامہ کے اشعار جا بجا درج ہوتے تھے اور دلیری اور بہادری کے موقعوں پر بیاختہ

[1] یہ کتاب میری نظر سے گذری ہے،

اس کے اشعار زبان سے نکل جاتے تھے، میدانِ جنگ میں رجز کے بجائے شاہنامہ کے اشعار پڑھے جاتے تھے، سلجوقیوں کے اخیر فرماں روا طغرل ارسلان نے میدانِ جنگ میں لڑکر جان دی تو شاہنامہ کے یہ اشعار زبان پر تھے،

من آں گرز یک زخم بر داشتم | سپہ را ہماں جاے بگذاشتم
چناں بر خروشیدم از پشتِ زین | کہ چوں آسیا شد، پریشاں زمین

شاہنامہ ہی کے اثر نے سیکڑوں برس تک، ایران کی شاعری کو غزل سے پاک رکھا، امتدادِ زمانہ سے جب اس کا اثر گھٹا اور عشق و عاشقی کے خیالات قوم میں پھیلنے لگے، تو دفعۃً تاتاریوں کے طوفان نے مسلمانوں کی خاک تک اڑا دی۔

شاہنامہ کی زبان

شاہنامہ کی زبان، آج کی زبان سے اس قدر مختلف ہے کہ گویا دو زبانیں الگ الگ ہیں، اور یہ شاہنامہ کی تخصیص نہیں، اُس زمانہ کے شعرا کی عام زبان یہی تھی، لیکن چونکہ اور کسی شاعر نے اس قدر الفاظ استعمال نہیں کئے، اسلئے فردوسی کی زبان بہ نسبت اور شعراء کے زیادہ بیگانہ اور غیر مانوس معلوم ہوتی ہے،

شاہنامہ کی زبان کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں،

۱۔ ضمیروں کی ترکیب، مثلاً،

ع زشادی رخاں شاں چو گل بر دمید،

اب یوں کہیں گے رخ ہاے ایشاں،

۲۔ غیر جاندار چیزوں کی جمع الف و نون سے، مثلاً

اگر عمر باشد مرا سالیان، یعنی سالہا،

۳۔ اسم اور فعل کے آخر میں الف زائد مثلاً

ع سیامک برآمد برہنہ تنا، یعنی تن،

ع بہ سی روز گیتی بہ پیمایدا،

۴۔ فارسی الفاظ پر تشدید مثلاً خوشّی، زرّہ، پرّہ۔ ہمّہ، مژّہ، زرّبفت، کرّشمی،

۵۔ بعض زائد حرف، مثلاً چناں کے بجائے چونان، اشیا کے بجائے اشیوار، چنیں کے بجائے چونیں، فرشتہ کے بجائے فریشتہ،

۶۔ در کے بجائے اندرون، مثلاً

بہ جنگ اندروں گرزہ گاؤ رنگ،

۷۔ متحرک بجائے ساکن، اور ساکن بجائے متحرک، مثلاً،

ع بگویم ز مادرشؔ وہم از پدرشؔ ع بنا مدت از شیر و ز دیو باک،

ع بہ شادی ہمہ جاں بر افشاندند،

۸۔ بے کے پہلے الف زائد،

ع ایے او بناشیم در جنگ شاد،

۹۔ دیا بجائے دیا،

دیا بارہ رستم جنگجوے　　بہ آخر بہ بندبے خداوند مے،

۱۰۔ کجا بہ معنی کہ

ع درفشش کجا پیل پیکر بود،

۱۱۔ ازبر بمعنی بر

ع نشست ازبر کوہہ ژندہ پیل، یعنی برکوہ،

۱۲۔ ایچ۔ معنی ہیچ،

ع زپیکاں نبود ایچ پیدا سرش،

۱۳۔ تاے خطاب کا استعمال، مثلاً

ع ہزارانت کودک وہم نوش لب، یعنی ہزاراں ترا،

چرائی خیال کت مراد وہوا است، یعنی کہ ترا

۱۴۔ ورا بمعنی اورا،

چو رستم ورا دید خیرہ بماند، یعنی چو رستم اورا دید،

۱۵۔ ازو کے بجاے ازوی،

برما ور آمد بہ پرسید از وے بدو گفت گستاخ با من بگوی

۱۶۔ ازیرا بجاے ازیں رو،

ع ازیرا سرت زآسماں برتر است، یعنی ازیں رو،

۱۷۔ آزمایش کے بجائے آزموں،

نہادی برو دست یہ آزموں تنکم برزمیں برنہادی ہموں،

۱۸۔ میم متکلم کا حذف،

اگر من نہ رفتے بہ مازندران   یعنی اگر من نہ رفتمے،

ان تصرفات کے علاوہ سیکڑوں الفاظ ہیں جو بالکل متروک ہیں، یا ان کی صورتیں بدل گئیں، یا ان کے بجائے اور اور الفاظ استعمال میں ہیں، مختصراً چند الفاظ ذیل میں درج ہیں،

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ویژہ	خاص	تال و مال	ریزہ ریزہ
مر	شمار	تخش	تیر
ایدون	حالا	ترک	کلاہ آہنی
ایدر	اینجا	ترنگ	صدائے کماں
آخُر	اصطبل	تلاش	پراگندہ
آذین	زینت و آرایش	تنگ آمدن	نزدیک آمدن
آذرگشسپ	برق	جوال	ظرفیست کہ از پشم بافند
آستی	آستیں	چاک	سفیدۂ صبح
برسان	بساں	چاک چاک	صدائے زدن شمشیر
آغاز	ارادہ	چرنگیدن	آواز گرز
افسوس	ظلم و ستم	چک	قبالہ او دستاویز

لفظ	معنی	لفظ	معنی
اند	چند، یا اندک	سہ دیگر	سیوم
اندرخور	لائق	شارسان	شہر و شہرستان
انوشہ	آفریں	شبگیر	صبح
بادسر	مغرور	شخودن	خراشیدن
بارگی و بارہ	اسپ	شکردن	پارہ کردن
باژ	خراج	غرم	میش کوہی
بخش	حصہ	غرچہ	مخنث و نامرد
برتر	بلندی	غو	خروش
بسندہ	کافی	گو	پہلوان
بسیج	قصد و کارسازی	فرو ریختن از اسپ	فرود آمدن
بگماز	شراب	فزونی	فضیلت و بزرگی
پازہر	تریاک	فسیلہ	گلہ اسپ
پذیرہ	استقبال کردن	فش	دم و یال اسپ
پیدرام	آراستہ	قارورہ	آلہ ایست از آلاتِ جنگ
پہلوانی	زبان پہلوی	خشت	نیزہ کوچک
در	درہ کوہ و مرتبہ	وبوس	گرز

لفظ	معنی	لفظ	معنی
	ع بگفتش به از این سخن دربدر	درع	پیراہن زناں
درخت	دارایساسته	سبز در سبز	نام یکے نست
درقه	سپر چرمین	ستاده	خیمه
دستار	دستر خوان	ستاره	مسهری
دست بند	زنان رقاص	ستودال	دخمه
دست حابه	جامه سروپا	ستیخ	راست وبلند
دست راست	وزیر اعظم	سرسری	فرومایه
دستوار	عصا	سرون	شاخ گاؤ
دفتر شکستن	دفتر ساختن	سفت	دوش
دمدار	ساقه لشکر	شیب	دنباله تازیانه
دواج	لحاف	ماروپچ	گچ
دیدار	چشم ورخ و پدیدار گشتن	صلاب	اصطرلاب
رده	صف	طرخون	بید سرخ
رزمه	بقچه	طغرل	نوعی از مرغ شکاری
رسته	صف زده	قرطه	کرته
رفت آوری	آمد و رفت کردن	کاتوزی	زاهد

لفظ	معنی	لفظ	معنی
رنج	رنگ	کالوشه	دیگچه
روزبان	دربان	کشکین	نان جوین
روسپی	فاحشه	کفچ	آبِ دہن
ریدک	غلام وامرد	کلک	کمان
رمین	مکار	کنارنگ	بزرگ قوم
زحیر	پیچ وتاب	کندآور	پہلوان
زخم	عمارت	کوہسر	کوہسار
زمزم	کلمات مغاں کہ وقت	گردگاہ	تہی گاہ وکمر
	پرستش گویند	گردگال	مرہون
زمی	زمیں	گریغ	گریز
زنہار خوردن	عہد شکستن	گشن	بسیار
زوار	خام زندان خانه	ماہار	مہارِ شتر
زکیدن	آہستہ زیرِ لب گفتن	مزیح	طعنه وظرافت
سان	عرضِ لشکر	منجوق	ماہیچہ علم
سہت	سنگین وگران	دلیه	نعرہ
ناباک	بے باک	ہرکارہ	دیگِ سنگی

معنی	لفظ	معنی	لفظ
ہر زماں	ہزماں	صف لشکر	نخ
مانند	ہما نند	ہنوز	نوز
جان	ہوش	پہلوان	نیو
چہار دنداں پیشیں	یشک	نگہبان	دان
جانور درندہ		یاد وفہم	دیر
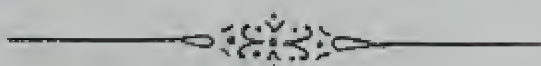
اسدی طوسی

اقلیم سخن (رزم) کا یہ دوسرا تاجدار ہے، صاحب آتشکدہ نے اسکو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے،

اسدی کا نام علی بن احمد اور کنیت ابو نصر ہے، سلسلۂ نسب شاہانِ عجم سے ملتا ہے، تحصیل علوم کے بعد عراق کا سفر کیا، اور دیلمیوں کے دربار میں رسائی حاصل کی، عراق سے آذربایجان آیا، یہاں کا رئیس ابو دلف کرکری تھا، اس کا وزیر نہایت قدردان علم و فن تھا، اُس نے اسدی سے کہا کہ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر عجم کو زندہ کیا، تم اسی کے ہموطن اور ہم فن ہو تم بھی کچھ یادگار چھوڑ جاؤ، اسدی نے گرشاسپ نامہ لکھکر ہم فنی کا حق ادا کیا، چنانچہ ان تمام واقعات کو خود دیباچہ میں لکھا ہے،

یکے بود سردار دنیا و دیں	گراں مایہ دستور شاہ زمین
بمن گفت فردوسی پاک مغز	بداد ست داد سخنہاے نغز
بہ شہنامہ گیتی بیاراستہ است	وزاں نامہ نام نکو خواستہ است
تو ہم شہری اوراد ہم پیشۂ	چو او در سخن چابک اندیشۂ

ازاں ہم رہاں نامۂ باستاں　　　　به نظم آر خرم یکے داستاں

دولت شاہ نے لکھا ہے، اور اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسکی تقلید کی ہے کہ فردوسی جب غزنین سے بھاگ کر مختلف شہروں سے گذرتا ہوا، وطن میں آیا، اور زندگی کے دن قریب آگئے تو اسدی کو بلا کر کہا کہ شاہنامہ کا کچھ حصہ ناتمام رہ گیا ہے میرے بعد کون اسکو پورا کر سکے گا، اسدی نے کہا، جان استاد! کچھ اندیشہ کی بات نہیں میں اس خدمت کو انجام دونگا، چنانچہ ایک رات دن میں چار ہزار شعر لکھکر فردوسی کو سنائے، فردوسی نہایت خوش ہوا اور وہ اشعار شاہنامہ میں داخل کر لئے، یہ وہ اشعار ہیں جہاں عربوں کے حملے اور ایران کی شکست کا ذکر ہے،

لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت محض فرضی اور غلط ہے، نہ شاہنامہ ناتمام رہا تھا نہ اسدی فردوسی کا استاد تھا[1]، نہ فردوسی، اسدی سے ایسی فرمایش کر سکتا تھا، نہ ایک رات دن میں اسدی سے چار ہزار شعر لکھے جا سکتے تھے، ان سب پر مستزاد یہ کہ اسدی کے انداز سے، ان اشعار کو مطلقاً مناسبت نہیں،

شاعری پر اسدی کا ایک احسان یہ ہے کہ قصائد میں جدت کا راستہ نکالا اکثر قصائد میں مناظرات لکھے ہیں، اور یہ اس کی خاص ایجاد ہے وہ دو چیزوں کو لیکر

---

[1] اسدی نے گرشاسپ نامہ میں فردوسی کا نام جسطرح لیا ہے، اس سے قطعی ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی اس کا شاگرد نہ تھا، شعر ملاحظہ ہو،

به شهنامه فردوسی نغز گوے　　　　که از پیش گویندگان برد گوے،

باہم مناظرہ کراتا ہے، ہر ایک کی طرف سے ترجیح کے دلائل پیش کرتا ہے، اور بالآخر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز کرتا ہے، چنانچہ رات دن، زمین آسمان، گبر و مسلم، قوس و رمح، شب و روز کا مناظرہ، مجمع الفصحا میں نقل کیا ہے،

اسدی سب سے پہلا شخص ہے جس نے مصطلحات فارسی پر کتاب لکھی، چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے، سلگمین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع بھی کیا ہے[1]،

کلام پر رائے اسدی اگرچہ فردوسی وغیرہ کا ہمعصر ہے، لیکن تشبیہات اور مضمون بندی کے لحاظ سے، نظامی سے دوش بدوش ہے، ایک جنگل کی تعریف میں لکھتا ہے،

چناں تنگ در ہم یکے بیشہ بود	کہ رفتن دراں کار اندیشہ بود
اس طرح کا گھنا جنگل تھا	کہ اس میں صرف خیال چل سکتا تھا
درختانش سر در کشیدہ بسر	چو خط دبیراں یک اندر دگر
اس کے درخت اس طرح پاس پاس تھے	جس طرح خوشنویس کی سطریں ہوتی ہیں
ہمہ شاخہا تا بہ چرخ کبود	بہم در شدہ تنگ چوں تار و پود
تمام شاخیں آسمان تک	اسطرح لپٹی ہوئی تھیں جسطرح کپڑے میں تانا بانا ہوتا ہے
تو گفتی سپاہی است در جنگ سخت	وز و ہست گردو گرہر درخت
معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فوج لڑائی میں مصروف ہے	ہر درخت پہلوان ہے،

---

[1] مسٹر براؤن کی کتاب جلد دوم تذکرہ اسدی،

کماں شاخہا شاں، ہمہ گرز بار	سپر برگہا و سناں نوک خار
شاخیں کمان تھیں گرز پھل تھے	پتے سپر، اور کانٹے برچھیاں تھیں
نتابیدہ اندر وے از چرخ ہور	ز تنگی رہش پوست برفتے زمور
آفتاب کبھی اس میں چمکا نہیں تھا،	اسقدر گھنا تھا کہ چیونٹی اسمیں چلتی تو اسکی کھال اتر جاتی

اس قسم کی تشبیہات اور اس قسم کا مبالغہ متوسطین بلکہ متاخرین کا انداز ہے، باایں ہمہ واقعہ نگاری اور صورتِ حال کے منظر دکھانے میں اسدی کو فردوسی سے کم مایہ نہیں کہہ سکتے، گرشاسپ نے جہاں اژدہا کو مارا ہے، اس موقع پر اژدہا کی تصویر دیکھو کس طرح کھینچی ہے، اگلے زمانہ میں اژدہا کی تصویر جو لوگوں کے ذہن میں تھی یہ تھی کہ بیس تیس گز کا لمبا ہوتا ہے، آگے دو بڑے بڑے دانت ہاتھی کی طرح نکلے ہوتے ہیں، سانس لیتا ہے تو منہ سے شعلے نکلتے ہیں، سر پر کانٹے کی طرح بال ہوتے ہیں، جسم پر ہاتھی کے کان کے برابر چھلے ہوتے ہیں، جن کو کبھی سمیٹ لیتا ہے اور کبھی پھیلا دیتا ہے، آنکھیں ستارہ کی طرح دور سے چمکتی ہیں،

شد اندر درہ ہر سوے بنگرید	بناگاہ آں اژدر آمد پدید
براں پشتہ او سینہ سایان بکیں	زبیجیدنش جنبش اندر زمیں
چو تاریک غارے دہن کردہ باز	دو دندانش (دانت) چو شاخ گوزنان دراز
دہان و نفس دود و آتش بہم	دہاں کورۂ (بھٹی) آہن و شعلہ دم
ز تفت (گرمی) دہانش دلِ خارہ (پتھر) موم	ز زہر دمش باد گیتی سموم،

به دو دو نفس هر دو چشمش ز نور　　درخشان چو در شب ستاره ز دور

گره در گره خم و دم تا به پشت　　همه سرش چون خار و موها درشت

بپشیزه پشیزه تن از رنگ نیل　　ازاں هر پشیزه، سه از گوش فیل

گہے چوں سپر بر فگندیش باز　　گہے ہمچو جوشن کشیدی دراز

چو بر کوه سوئے، تن سنگ رنگ　　بفر سنگ رفتے چکاکاک سنگ

غرض شاہنامہ اور سکندر نامہ کی بیچ کی کڑی گرشاسپ نامہ ہے، نظامی نے غالباً گرشاسپ نامہ کو سامنے رکھکر سکندر نامہ لکھا ہے۔
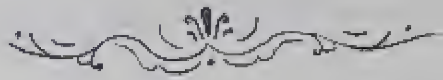
منوچہری

دامغان وطن، ابوالنجم کنیت، احمد نام، شصت کلہ لقب اور منوچہری تخلص تھا، دولت شاہ نے اسکو بلخی لکھا ہی، چونکہ نہایت دولت مند تھا، اسلیئے شصت کلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، امیر منوچہری بن شمس لمعالی امیر قابوس بن وشمگیر جو مشہور رئیس اور جرجان کا فرماں روا تھا اور ۴۰۳ھ میں تخت نشین تھا، یہ اس کے دربار میں ملازم تھا، اس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا، ۴۲۱ھ میں منوچہری نے انتقال کیا تو یہ غزنین میں آیا، اور عنصری کی مدح میں قصیدہ لکھا، جو اس کے دیوان میں موجود ہے، مدح کے چند شعر یہ ہیں،

اوستاد اوستادان زمانہ عنصری | عنصرش بے عیب و دل بےغش و دینش بے فتن
شعر او چوں طبع او ہم بے تکلف ہم بدیع | طبع او چوں شعر او ہم با ملاحت ہم حسن
کو جریر و کو فرزدق کو ولید و کو لبید | رؤبہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذی یزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند | تا عزیزی روضہ بینند و طبیعی نسترن
شعر او فردوس را ماند کہ اندر شعر او | ہر چہ در فردوس یارا وعدہ کردہ ذو المنن
کوثر است الفاظ عذب او و معنی سلسبیل | لفظ او انہار خمر و نثرش انہار لبن

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی، لیکن یہ بھی

خوشامد کا ایک پہلو تھا، جس طرح قلعہ میں لوگ بہادر شاہ سے گلستاں پڑھنے جایا کرتے تھے، بہرحال عنصری نے اسکو دربار شاہی میں پہنچایا، اور سلطان محمد بن محمود کے حضور میں ترخانی کا منصب ملا یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا، کچھ روک ٹوک نہ تھی، محمد چند روز کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار ہو کر قید ہوا، اور اس کے بھائی سلطان مسعود نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا، منوچہری کے اکثر قصائد مسعود ہی کی مدح میں ہیں، مسعود بھی اس کا نہایت قدردان تھا، یہاں تک کہ دربار کے شعراء اس پر رشک کرتے تھے، ایک قصیدہ میں منوچہری نے فخر کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے، تقی کاشی نے خلاصۃ الافکار میں لکھا ہے کہ منوچہری، عنصری و عسجدی کا ہمعصر تھا، اور دربار میں عنصری کے سوا اور تمام شعراء یہاں تک کہ فردوسی اور فرخی تک اس سے نیچے بیٹھتے تھے لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنین میں آیا ہے، اور اسلئے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہو سکتا تھا،

منوچہری فطرۃً شاعر تھا، نہایت کمسنی میں لوگ مشکل طرحیں دیتے تھے، اور وہ برجستہ ان طرحوں میں قصیدے اور غزل کہتا تھا،[1]

دیوان جو آج موجود ہے، اس میں تین ہزار شعر ہیں، علی قلی خاں ہدایت

---

[1] مجمع الفصحاء، [2] ایضاً بحوالہ لب الالباب عوفی یزدی،

نے بڑی تلاش سے بہم پہنچایا اور شائع کیا، فرانس میں اس کا دیوان نہایت اہتمام اور تکلف سے چھپا ہے، فرہنگ بھی ہے اور تمام مشکل اشعار کو حل کیا ہے، یہ نسخہ میری نظر سے گذرا ہے، اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، منوچہری نے ۴۳۲ھ میں انتقال کیا،

کلام کی خصوصیات منوچہری کے کلام میں اکثر ایسے خصوصیات ہیں جن سے اسکے معاصروں کا کلام بالکل خالی ہے، بلکہ مابعد کے شعرا میں بھی ان کے نمونے خال خال پائے جاتے ہیں،

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرائے عرب کی زیادہ تر تقلید کرتا ہے، اس نے متعدد قصیدے عربی قصائد کے بحر اور قافیہ میں لکھے ہیں، ابو الشیص کا ایک قصیدہ ہے،

سالفات واللیل ملقی الجران   غراب ینوح علی غصن بان

منوچہری اس کے جواب میں لکھتا ہے.

جہانا چہ بدمہر و بدخو جہانی   چو آشفتہ بازار بازار گانی

مزہ وہاں آتا ہے، جہاں چند شعرائے عرب کے نام لیکر کہتا ہے کہ فلاں شاعر نے خلیفہ اور امیر کی مدح میں زور کے قصیدے لکھے اور ایسے بڑے بڑے صلے حاصل کئے، میں بھی اسی طرح تیرے دربار میں آیا ہوں،

شنیدم کہ اعشی بہ شہر یمن شد   سوے سودۃ بن علی الیمانی

بر و خواند شعرے بالفاظ تازی | بہ شیریں معانی وشیریں زبانی
یکے کاروان اشتر کشن واوش | ہر اشتر بساں کہے از کلانی
سوے تاج عمرانیان ہم بہ بنیاں | بیاید منوچہری دامغانی

دیکھو تخلص کس لطف سے کھپایا ہی،

آخر میں تصریح کی ہو کہ یہ قصیدہ میں نے ابوالشیص کے جواب میں لکھا ہی، ساتھ ہی قصیدہ کا مطلع بھی تضمین کیا ہی،

بدان وزن این شعر گفتم کہ گفتہ است | ابوالشیص اعرابی باستانی
مسالقاک فی اللیل ملقی الجران | غراب ینوح علی غصن بان

ابن المعتز کا ایک قصیدہ سادات علوی کے معارضہ میں ہی،

ونحن بنوا العم اولی بھا،

اس قصیدہ پر منوچہری نے قصیدہ لکھا ہے اور لطف یہ کیا ہے کہ عربی ضمیر کی جو تھی اس سے فارسی میں جمع کا کام لیا ہی،

چو از زلف شب باز شد تابہا | فرو مرد قندیل محرابہا،
سپیدہ دم از بیم سرمای سخت | بپوشید بر کوہ سنجاب ہا،
بمخوارگان ساقی آواز داد | فگندہ بزلف اندروں تابہا
ببانگ نخستین ازیں خواب خوش | بجستیم ما ہمچو طبطاب ہا
منجم بیام آمد از نور مے | گرفت ارتفاع سطرلاب ہا

فارسی کے اور شعرا کے برخلاف منوچہری کو شعرائے عرب کے اکثر دیوان حفظ یاد تھے، اور اس پر فخر کرتا تھا، ایک قصیدہ میں حاسد کو خطاب کرکے لکھتا ہے،

من بسے دیوان شعر تازیاں دارم زبر — تو ندانی خواند الا ھبی بصحنک فاصبحین

یعنی مجکو عرب کے بیسوں دیوان ازبر ہیں — اور سبعہ معلقہ کا یہ قصیدہ بھی نہیں پڑھ سکتا

الا ھبی بصحنک فاصبحینا — ولا تبقی خمور الاندرینا

عربی پر اسکو یہ قدرت حاصل تھی کہ اپنے کلام میں عربی قصائد کی طرف اشارے کرتا ہو اور ان کے وہ ٹکڑے جن کے نام سے وہ قصیدے مشہور ہیں، بے تکلف تضمین کرتا جاتا ہے، ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

امرء القیس و لبید و اخطل و اعشی و قیس — بر طلل ہا نوحہ کردندے و بر رسم تلی،

شاعری عباس کردو حمزہ کرد و طلحہ کرد — جعفر و سعد و سعید و سید ام القری

آنکہ گفتست اذ نفنا آنکہ گفت الا ھبی — آنکہ گفت السیف اصدق آنکہ گفت ابلی الھوی

اس شعر میں چار قصیدوں کے مطلعوں کی طرف اشارہ ہے، یعنی

اذ نفتنا ببینها اسماء — (سبعہ معلقہ کا قصیدہ ہے)

الا ھبی بصحنک فاصبحینا — سبعہ معلقہ

السیف اصدق انباءً من الکتب — ابو تمام کا مشہور قصیدہ ہے جو معتصم کی مدح میں

ابلی الھوی، — (متنبی کا قصیدہ ہے)

اس کے کلام میں اکثر عربی تلمیحات ہیں یہانتک کہ محض فارسی داں اس کے کلام

سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتے، ایک قصیدہ کا مطلع ہے،

نوروز برنگاشت بصحرا و مشک ومے | تمثال طے و غزہ و تصویر بلے مے

عرب میں لیلیٰ و شیریں کے بجائے جن معشوقوں کا نام آتا ہے، لیلیٰ، سلمیٰ، رباب غزہ، میہ بثینہ وغیرہ ہیں، غزہ، کثیر کی معشوق تھی، جو بنی امیہ کے زمانہ کا مشہور شاعر تھا، میہ ذوالرمہ کی معشوق تھی، اسی میتہ کو منوچہری نے قافیہ کی ضرورت سے مے کہدیا ہے،

ایک اور قصیدہ میں لکھتا ہے،

باد برزین صناعتِ مانی کند ہمے | مرغِ حزیں روایتِ معبد کند ہمے

معبد بنو امیہ کے زمانہ کا مشہور مغنی تھا،

روایت کردن کے معنی گانے کے ہیں، مرغ حزیں سے بلبل مراد ہے، یعنی بلبل معبد کے راگ گاتی ہے،

زمیں محراب داؤدست از بس سبزہ پیدا ہے | کشادہ مرغکاں بر شاخ چوں داؤد حنجر ہا

با نظم ابن رومی و با نثر اصمعے، | با شرع ابن جنی و با نحو سیبوے،

آں جایگاہ کا نجمن سرکشاں بود، | تو بو فلانی آں دگراں ابنہ دبنی

(۳) اس کے کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی، روانی اور شستگی ہے، یہ جوہر اگرچہ اس کا عام خاصہ ہے، لیکن اس کے ساتھ اور مختلف باتیں جمع ہو گئی ہیں، جن سے اور زیادہ شیرینی اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اکثر شگفتہ ردیفیں پیدا کرتا ہے،

کہیں کہیں ممدوح کے نام کو ردیف کرتا ہے، اور وہاں گریز کے موقع پر ممدوح کے نام سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، بعض جگہ کئی کئی شعر تنسیق الصفات[1] کی صنعت میں لکھتا جاتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریشم پر موتی ڈھلکتے چلے آتے ہیں،

ماہ رمضان رفت مرا رفتن آں بہ ۔ عید رمضان آمد و المنۃ اللہ

بر آمدنِ عید و بروں رفتنِ روزہ ۔ ساقی بدہم بادہ بر باغ و بہ سبزہ

بر نہ بکفِ دستم آں جامِ چو کوثر ۔ جامِ دگر آور بکفِ دست و گرنہ

من می نخورم تا نبود بر دو کفم جام ۔ یا ساتگنی بر سرِ خوانم ننہی سہ

چوں می بدہی نوش ہمی گوئی و ہمی باش ۔ چوں می نخورم جام ہمی گیرد ہمی چہ

دلم اے دوست تو دانی کہ ہوائے تو کند ۔ لبِ من خدمتِ خاکِ کفِ پائے تو کند

رایگاں مشک فروشی نکند ہیچ کسے ۔ در کند ہیچ کسے لف دو تائے تو کند،

چہ دعا کردی جاناں کہ چنیں خوب شدی ۔ تا چو تو جا کہ تو نیز دعائے تو کند

از لطیفی کہ توئی اے بت و از شیرینی ۔ ملک مشرق بیم است کہ رائے تو کند
یعنی تیری رائے میں آجائے

این جہان کرد برائے تو خداوند جہان ۔ وان جہان نیز برانم کہ برائے تو کند

صنما! از تو دلم ہیچ شکیبا نہ شود ۔ اگر امروز نشود بیتک فردا نہ شود

تجربت کردم و دانا شدم از کار تو من ۔ تا مجرب نہ شود، مردم دانا نہ شود

نہ کشم ناز ترا و نہ دہم دل بہ تو ہم ۔ تا مرا آشتی و مہرِ تو پیدا نہ شود

---

[1] تنسیق الصفات کی مثال گھوڑے کی تعریف میں آئیگی،

گوئی از دو لب من بوسہ تقاضا چہ کنی | دام خواہی نہ بود کو بتقاضا نہ شود
بہ مدارا دل تو نرم کنم، وآخر کار | بہ درم نرم کنم گر بہ مدارا نہ شود
دگر ایں عاشق تو نومید شود از در تو | از در خسرو شاہنشہ دنیا نہ شود
صنما گرد سرم چند ہمے گردانی | نہ نشستی از روے نکو زشت بود گردانی
یا مکن آنکہ شبے روز ہمی وعدہ دہی | یا مکن وعدہ ہر آں چیز کہ می توانی
دل من بردی و از خویشتنم دور کنی | بر نیاید صنما! کار بدیں آسانی
مہربانی نہ کنی بر من و مہرم طلبی | نہ دہی داد من و داد ز من بستانی
بیوفائی کنی و ناداں سازی تن خویش | نیستی اے بت یکبارہ بدیں نادانی
از تو ما را نہ کنار و نہ پیام و نہ سلام | مکن اے دوست کہ کیفر بری و درمانی

مکن اے دوست کہ بیداد نشانی نگذاشت
عدل باز آمدہ با بوالحسن عمرانی

نوروز روزگار نشاط است و ایمنی | پوشیدہ ابر دشت بہ دیبائے ارمنی،
خیل بہائیں خیمہ بصحرا برون زند، | واجب کند کہ خیمہ بصحرا برون زنی
بر گل ہمی نشینی و بر گل ہمی خوری | بر خم ہمی خرامی و بر دن ہمی دنی[1]
در راست نا خریدہ و شکستہ آرایگاں | ہر چند بر فشانی و ہر چند بر چینی
شاخ بنفشہ بر سر زانو نہادہ سر | مانندہ مخالف بوسہل زوزنی

---

[1] دن یعنی خم شراب دنی، دنیدن سے مشتق ہے جس کے معنی اکڑ کر چلنے کے ہیں،

باد نوروزی ہمی در بوستان ساحر شود | تا بہ سحرش دیدہ ہر گلبنے ناظر شود
باد ہمچوں دزد گرد و ہر سوکو بیا رباے | بوستاں آراستہ چوں کلبہ تاجر شود
نو بہار ایں جامۂ صد رنگ تو شد تا مگر | دوستار دوستاں خواجہ بو طاہر شود

منوچہری مناظرِ قدرت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچتا ہے صحرا، سبزہ، بادل، سیلاب، ہوا، وغیرہ وغیرہ کے اوصاف اکثر قصائد کی تمہید میں لکھے ہیں اور اس خوبی سے لکھے ہیں کہ اگر اس قسم کے اشعار الگ جمع کر دیے جائیں تو نیچرل شاعری کا ایک عمدہ مجموعہ تیار ہو جائیگا، ایک قصیدہ میں سفر کا حال لکھتے لکھتے آب و ہوا کے طوفان کا حال لکھا ہے اس موقع پر ہوا کے جھونکے، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، پانی کے سیلاب کا نقشہ دیکھو کس طرح کھینچتا ہے،

برآمد بادے از اقصاے بابل | ہبوبش خارہ در و بارہ افگن
تو گفتی کز ستیغ کوہ سیلی | فرو بارد ہمے احجار صد من
ز روے بادیہ برخاست گردے | کہ گیتی کرد ہمچوں خز ادکن
چناں کز روے دریا بامدادان | بخار آب خیزد ماہ بہمن
برآمد زاغ رنگ و مار پیکر | یکے میغ از ستیغ کوہ قارن
چناں چوں صد ہزاراں خرمن تر | کہ عمداً در زنی آتش بہ خرمن
بجستے ہر زماں از تیغ برقی | کہ کردے گیتی تاریک روشن
خروشی برکشیدے تند تندر | کہ موے مرد ماں کردے چو سوزن
تو گفتی نائے رومی ہر زمانے | بگوشش اندر دمیدے یک دمیدن

بلرزیدے زمیں از زلزلہ سخت | کہ کوہ اندر فتادے زو بگردن
تو گفتی ہر زمانے زندہ پیلے | بلرزاند زرنج پشگان تن
فرو بارید بارانے زگردوں | چناں چوں برگ گل بارد زگلشن
دیا اندر تموزی مہ بیارد | جراد منتشر بر بام و برزن
زصحرا سیلہا برخاست ہر سو | درازآہنگ پیچاں وزمیں کن
چو ہنگام عزائم زی معزم | بتک خیزند ثعبانان ریمن
نماز شامگاہاں گشت صافی | ز روے آسماں ابر معکن

بہار کی تعریف شعرائے ایران کا ایک عام موضوع ہے جس پر ابتداء سے آجتک سب طبع آزمائیاں کرتے آئے ہیں، لیکن قدماء اور متاخرین میں سے کسی نے منوچہری کی طرح نیچر کی تصویر نہیں کھینچی، اس نے سیکڑوں جگہ بہار کا نقشہ دکھایا ہے، اور ہر جگہ گویا فطرت کی تصویر کھینچکر رکھدی ہے، وہ اور شعرا کی طرح صرف گل وبلبل پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ ایک ایک پتے، پھول پھل شاخ، درخت، اور ان سب سے بڑھکر جانوروں اور پرندوں کی صورت اور حالت دکھاتا ہے،

پرندوں کی حالت،

کبکان بے آزار کہ بر کوہ بلندند | بے قہقہہ یکبار ندیدم کہ بخندند
جز خارستاں[1] جایگہ خود نہ پسندند | بر پہلوازیں تیمہ بداں نیمہ بدزند[2]

---

[1] خارستاں، خارزار، [2] دیدند، میخرامند،

هر ساعتکی سینه بمنقار بر زند،
چون جزع[1] بر و سینه و چون بسد[2] منقار

شبگیر ز گل فاختگان بانگ بر آرند ‌ ‌ ‌ گوئی که سحرگاه همی خواب گزارند

ماه شبه (وقت صبح) از بر گردن بنگارند (یعنی هلال) ‌ ‌ ‌ از غالیه بے آنکه همی غالیه دارند

صد بار بروزی در ره‌ها بشمارند
چون نیم دبیری که غلط کرده باشمار[3]

هر ساعتکی بط سخنے چند بگوید ‌ ‌ ‌ در آب همه جامه دگر بار بشوید

در آب کند گردن و در آب برد بید ‌ ‌ ‌ گوئی که مگر چیزے در آب بجوید

چون سینه بجنباند و یک لخت بپوید
از هر سر ریش بچکد صد در شهوار

آمد نوروز دهم از بامداد ‌ ‌ ‌ آمدنش فرخ و فرخنده باد

باز جهان خورم و خوب ایستاد ‌ ‌ ‌ مرد زمستان و بهاران بزاد

ز ابر سیه روے سمن بوے دار
گیتی گردید چو دار القرار

روے گل سرخ بیاراستند ‌ ‌ ‌ زلفک شمشاد به پیراستند

---

[1] جزع مهره سلیمانی که سفید و سیاه باشد [2] بسد، یاقوت، [3] کهتا ہو کہ قمریاں اسطرح بار بار اپنے پرونکو گنتی ہیں (کھولتی ہیں)، جس طرح کہ نوآموز حساب ان بار بار حساب بھول جاتا ہے اور ہر گا غلط کو الٹتا ہے [4] اشمار، شمار،

کبکاں برکوہ تبک خواستند | فاختگاں ہمبر بنشاستند

بلبلکاں زیر ستا خواستند
زیر و بم
نائے زناں بر سر شاخ چنار

طوطیکاں بر گلکاں تاختند | آہوکاں گوش برافراختند

گورخراں میمنہا ساختند | زاغان گلزار بہ پرداختند

بے دلکاں در پے دل تاختند
عاشق
باترکاں چنگل و قند ہار

مرغ نہ بینی کہ چہ خواند ہمے | میغ نہ بینی چہ ستاند ہمے

دشت نہ بینی بچہ ماند ہمے | دوست نہ بینی چہ ستاند ہمے

باغ بتاں زینتشاند ہمے
بر سمن و نسترن و لالہ زار

کردہ گلو پر زباد قمری سنجاب پوش | کبک فرو ریختہ مشک بسوراخ گوش

بلبلکاں بانشاط قمریکاں باخروش | در دہن لالہ مشک در دہن نحل نوش

سوسن کافور بوی گلبن گوہر فروش

از مہ اردی بہشت دہر بہشت بریں

چوک زشاخ درخت خویشتن آویختہ | زاغ سیہ پر و بال غالیہ آمیختہ
نام مرغے است

ابر بہاری ز دور اسپ برانگیختہ　　وز سم اسپ سیاہ لولو تر ریختہ

در دہن لالہ باد ریختہ و بیختہ

ریختہ مشک سیاہ بیختہ در ثمیں

سرو سماطی کشید بر دو لب جویبار　　چون دو رده چتر سبز در دو صف کارزار

مرغ نہاد آشیاں بر سر شاخ چنار　　چوں سپر خیزراں بر سر مرد سوار

گشت نگارین تذرو پنہاں در کشت زار

ہمچو عروسی غریق در بن دریاے چیں

گوئی بط سفید جامہ بصابون زدہ است　　کبک دری ساق پاے در قدح خون زدہ است

بر گل تر عندلیب گنج فریدون زدہ است　　لشکر چیں در بہار در کہ و ہامون زدہ است

لالہ سوے جویبار خرگہ بیروں زدہ است

خرگہ او سبز گوں خیمۂ او آتشیں

بادل جب برستے ہیں تو کبھی قطرہ افشانی ہوتی ہی، کبھی ننھی ننھی پھوہار پڑتی ہی، کبھی جھڑی لگ جاتی ہے، سبزہ پر، مختلف قسم کے پھولوں پر، تالاب کی سطح پر بوندوں کے پڑنے سے طرح طرح کی صورتیں پیدا ہو کر ہر ایک کا الگ الگ سماں نظر آتا ہی منوچہری نے ایک موقع پر تشبیہات کے پیرایہ میں اسکی تصویر کھینچی ہی،

آں قطرۂ باراں بیں از ابر چکیدہ　　گشتہ سر ہر برگ ازاں قطرہ بہ آثار

آویختہ چوں ریشہ و دستارچۂ سبز　　سیمیں گرہے بر سر ہر ریشہ و دستا

یا ہچو زبرجد گون یک دستہ سوسن — اندر سر ہر سوزن یک لولوی شہوار

وان قطرۂ باران کہ فرو بارد شبگیر — بر طرف چمن بر دو رخ سرخ گلنار

گوئی بہ مثل بیضۂ کافور ریاحی — بر بیرم حمرا بپراگندست عطار

وان قطرۂ باران کہ فرود آید از شاخ — بر تازہ بنفشہ نہ بہ تعجیل بہ ادرار

گوئی کہ مشاطہ ز بر فرق عروسان — یا ورد ہمی ریزد باریک بمقدار

وان قطرۂ باران کہ چکد از بر لالہ — گردد طرف لالہ از ان باران بنگار

پنداری بتخالہ خردک بدمیدست — بر گرد عقیقین دو لب دلبر عیار

وان قطرۂ باران کہ برافتد بہ سر خوید — چون قطرۂ سیماب برافتادہ بہ زنگار

وان دائرہ ہا بنگر اندر شمر آب — ہر گہ کہ در آن آب چکد قطرۂ امطار

چون مرکز پرکار ست آن قطرۂ باران — وان دائرۂ آب بسان خط پرکار

ہر گہ کہ از ان دائرہ انگیزد باران — وز باد در و چین و شکن خیزد ہر بار

گوئی علمی از سقلاطون سپیدست — وز باد جہندہ متحرک شدہ بسیار

وانگہ کہ فرو بارد باران بہ قوت — گیرد شکن آب دگر صورت و آثار

گردد شمر اید دون چو یکے دام کبوتر — دیدار زیک حلقہ بسے سیمین منقار

سراپا نگاری

حلیہ نگاری یعنی کسی خاص چیز کا سراپا لکھنا اور اس کے تمام اوصاف کا بیان کرنا منوچہری اس کا گویا موجد ہے، قصائد میں شعرا، بادشاہ کی مدح کے ساتھ تلوار گھوڑے وغیرہ کی تعریف بھی کرتے ہیں، عبد الواسع جبلی اور عرفی شیرازی

اس میدان میں سب سے آگے ہیں، لیکن ان کے ہاں محض خیالی باتیں ہیں، بخلاف اس کے منوچہری نے تصویر کھینچ کر رکھدی ہے، اس کے ساتھ اکثر صنعت تنسیق الصفات کا التزام کیا ہے، اور وہاں اس کی قدرت زبان کا اندازہ ہوتا ہے، کہ بے تکلف موزوں اور متناسب الفاظ کا انبار لگاتا چلا جاتا ہے،

گھوڑا

حبذا اسپے محجل مرکبے تازی نژاد — نعل او پروین نشان و سم او خارا شکن

رام زین و کش خرام و خوش عنان و تیز گام — شخ نورد و بارہ جوی و سیل بر و کوہکن

پشت او چون دوست وی گوش وی گرد و نش — چون کمان و چون عاج و چون سنان و چون مجن

گاہش اندر شیب تازم گاہ تازم بر فراز — چون کسی کو گاہ بازی بر نشیند بر رسن

دیر خواب و زود خیز و تیز سیر و دور بین — خوش عنان و کش خرام و پاک زاد و نیکخوی

سخت پای و ضخم ران و راست دست و گرد سم — تیز گوش و پہن پشت و نرم چرم و خوب موی

ابر سیر و باد گرد و رعد بانگ و برق جہ — کوہ کوب و سیل برو شخ نورد و بارہ جوی

گور ساق و شیر زہرہ یوز تاز و غرم تگ — پیل گام و گرگ سینہ رنگ تاز و گرگ پوی

تیز چشم آہن جگر فولاد دل گیخت لب — سیم دندان چابکی نا وہ کام و لوح روی

نیزہ و گرز و کمند و ناچخ و تیر و کمان — گردن و گوش و دم و سم و دہان و ساق اوی

بیر چہ، باد گرد، یوز دو، و کوہ قرار — شیر تگ، پیل قدم، گور دو آہو پرواز

گوش و پہلو و میان و کتف و جبہہ و ساق — تیز فربی و نزار و قوی و پہن و دراز

رہ برو شخ شکن و شیر دل و بیر عنان   خوش دو و سخت سم و پاک تن و جنگ آغاز

منوچہری نے اگرچہ کوئی مثنوی نہیں لکھی جس سے واقعہ نگاری کی ترقی کا قدم آگے بڑھتا، لیکن اکثر قصائد کی تمہید میں وہ واقعہ نگاری کا پیرایہ ڈھونڈھ لیتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلسل داستان لکھ رہا ہے، ان موقعوں پر اس کی قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے، کہ وہ محض مداحی کے لئے قصیدہ نہیں کہتا، بلکہ زبان کی ترقی دینے کو پیش نظر رکھتا ہے، ایک قصیدہ میں عرب کے انداز پر قافلہ کی روانگی، محبوب کی رخصت اور سفر کے حالات لکھے ہیں؛

الا یا خیمگی خیمہ فروہل   کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل
بتیرہ زن بزد طبل نخستیں   شتربانان ہمے بندند محمل
نماز شام نزدیک است امشب   مہ و خورشید را بینم مقابل
ولیکن ماہ دارد قصد بالا   فرو شد آفتاب از کوہ بابل
چناں دو کفۂ زریں ترازو   کہ ایں کفہ شود زاں کفہ مائل
نگار من چو حال من چناں دید   ببارید از مژہ باران وابل
بیامد تا فتاں خزان بر من،   چو آں مرغے کہ باشد نیم بسمل
دو ساعد را حمائل کرد بر من   فرو آویخت از من چوں حمائل
چو برگشت از من آں معشوق ممشوق   نہادم صابری را سنگ بر دل
نگہ کردم بہ گرد کاروان گاہ   بہ جائے خیمہ و جائے رواحل

(حاشیہ: نقارہ؛ کشتنی؛ سجادہ)

نه وحشی دیدم آنجا و نه انسی | نه راکب دیدم آنجا و نه راجل (پیادہ)

بجنب خویش را دیدم بیکسو (گھوڑا) | چو دیوی دست و پا اندر سلاسل

گشادم هر دو زانو بندش از بند | چو مرغی کش گشاید از حبایل

برآوردم زبانش از بناگوش (باگ) | فرو هشتم بویدش تا بکاهل

چو مساحی که پیماید زمین را | بپیمودم بپای او مراحل

همی رفتم شتابان زی بیابان | همی کردم بیک منزل دو منزل

همی بگداخت برف اندر بیابان | تو گوئی داردش بیماری سل

چو پاسی از شب دیرنده بگذشت | برآمد شعریان از کوه موصل

رسیدم من فراز کاروان تنگ (قریب) | چو کشتی کو رسد نزدیک ساحل

جرس دستان گوناگون همی زد | بسان عندلیبی از عنادل

ز نوک نیزه های نیزه داران | شده وادی چو اطراف سنابل

بجنب خویش را گفتم سبکتر | الا یا دستگیر مرد فاضل،

بحرکت عنبرین بادا چراگاه | بحرکت آهنین بادا مفاصل

بیابان در نورد و کوه بگذار | منازلها بکوب و راه بگسل

فرود آور بدرگاه وزیرم | فرود آوردن اعشی بباهل

اقسامِ سخن میں سے منوچہری کے مسمطات[1] مشہور ہیں۔ وہ درحقیقت اس طرز کا موجد ہے

[1] مسمط میں چھ مصرعے ہوتے ہیں جنمیں سے پانچ مصرعوں کے قافیے متحد ہوتے ہیں،

اور خود بھی اس کو اس پر ناز ہے، چنانچہ کہتا ہے،

طاؤس مدیح عنصری خواند دراج مسمط منوچہری

ان مسمطات میں اکثر جگہ واقعہ نگاری کے نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، ایک مسمط میں انگوروں کے پھلنے اور ان سے شراب کھینچنے کو ایک حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنی انگور ایک عورت ہے، اس نے لڑکیاں جنی ہیں، انگور والا خوش ہے کہ یہ میری لڑکیاں ہیں، اکثر آ آکر دیکھتا ہے، اور خوش ہوتا ہے، اتفاق سے لسے باہر جانا پڑا آکر دیکھا تو بچوں کے سرخ سفید چہرے سیاہ ہوگئے ہیں، اور انکے پیٹ نکل آئے ہیں، اسکو سخت رنج ہوا کہ یہ لڑکیاں بدکار نکلیں، لڑکیوں نے عذر خواہی کی لیکن اس نے نہ مانا اور ان کے گلے کاٹ ڈالے، اسی طرح شراب پینے کی اخیر حالت تک حکایت کے پیرایہ میں بیان کی ہے،

شاخ انگور کہن دخترکاں زاد بسے کہ نہ از درد بنالید و نہ برزد نفسے

ہمہ را از بیک دفعہ بہ حیض آمد نسبے نہ درا قابلہ بود نہ فریاد رسے

ایں چنیں آسان فرزند ندیدست کسے

کہ نہ در شے بگرفتش متواتر نہ تبے

چوں نگہ کرد بداں دخترکاں مادر پیر سر بود ند یکایک بہ صغیر و چہ کبیر

کرد شاں مادر بستر ہمہ از سبز حریر نہ خورش داد مراں بچگاں را ہیچ و نہ شیر

نہ تشغب کردند آں بچگاں نہ ہیچ نفیر

بچهٔ گرسنه دیدی که ندارد شیبی

بچگانش بنهاد و بد تن خویش بر آب — نه جهیدند و نه جستند از آن بستر خواب

گرد کردند سرین محکم کردند رقاب — رو بها یکسره کردند به نگار خضاب

داد شان زبان پیوسته شرابی چو گلاب

نشد از جانب شان غائب ورد نه شبی

گفت پندارم کین خرکان آن من اند — چون دل و چون جگر و چون تن و چون جان من اند

تا بباشند درین زود رهمان من اند — ز فردوس من است ایشان رضوان من اند

تا درین باغ و درین خانه درین مان من اند

دارم اندر سرشان سبز کشیده شطبی،

در چو بگشاد و بدان خرکان کرد نگاه — دید چون زنگی هر یک دو رخی سیاه

جای جای بچه تابان چون زهره شاه — بچهٔ سرخ چو خون و بچهٔ زرد چو کاه

سرنگونسار ز شرم و رو تیره ز گناه

هر یکی با شکم حامله و با نازبی،

ز زبان رابه دو ابروی در افتاده گره — گفت لاحول ولا قوت الا بالله

این بلای بچگان در حق من آمده زه — همه آبستن گشتند بیک شب که مه

نیست یک تن بمیان همگان ایدر به

این چنین زانیه باشد بچه هر عنبی،

دختران رز گویند کہ مابے گنہیم — ماتن خویش بدست نبی آدم ندہیم

ماہمہ سربسر آبستنِ خورشید و مہیم — ما تو انیم کہ از خلق جہان و رہیم

نتوانیم کہ از ماہ و ستارہ برہیم

زآفتاب و مہ ماں سود ندارد ہربے

روز ہر روزی خورشید بتابد بر ما — خویشتن در فگند بر تن ما و سر ما

چوں شب آید برود خورشید از محضر ما — ماہتاب آید و برچید در پیکر ما

ویں دو تن دور نگردند ز بام و در ما

نکند ہیچ کس ایں بے ادباں را ادبے

منوچہری کی خصوصیات میں ایک بڑی چیز تشبیہ کی صنعت ہے جہاں کسی منظر یا حالت کا بیان کرتا ہے سیکڑوں نئی تشبیہیں پیدا کرتا جاتا ہے، اور یہ اس کا خاص انداز ہے، اس بہتات کے ساتھ کوئی تشبیہ جدت سے خالی نہیں ہوتی، اس زمانہ تک خیالی اور فرضی تشبیہیں پیدا نہیں ہوئی تھیں، اس لئے عموماً تمام شعرا محسوسات اور مادیات سے تشبیہ دیتے تھے لیکن وہی چند مفرد تشبیہیں تھیں جو بار بار ادا ہو کر مبتذل ہو گئی تھیں، منوچہری کی اکثر تشبیہیں مرکب ہیں اور اس کے ساتھ خاص جدت ہے مثالیں حسب ذیل ہیں،

آفتاب کا صبح کے وقت بتدریج طلوع ہونا،

بکردار چراغ نیم مردہ — کہ ہر ساعت فزوں گردش روغن

یعنی آفتاب کی روشنی اس طرح آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے، کہ جسطرح ایک چراغ جو

بجھ چلا تھا، اس میں کوئی شخص بتدریج تیل ڈالتا جاتا ہے،

زمین کا بھونچال سے لرزنا،

توگفتی ہر زمانے ژندہ پیلے	بلرزاند ز رنج پشہ گان تن

یعنی زمین بھونچال سے اس طرح جنبش میں ہے جس طرح ہاتھی مچھروں کے اذیت دینے سے جھرجھریاں لیتا ہے،

ہلال

چناں چوں دو سر از ہم باز کردہ	ز زر سرخ یک دست آورنجن

یعنی پہلی رات کا چاند اس طرح نظر آتا ہے کہ گویا کسی نے طلائی کڑے کے دونوں سرے کھول دیئے ہیں،

بید کے پتے

واں برگہائے بید تو گوئی کسی بہ قصد	پیکانہائے بہمن زبرجد کند ہے

بید کے پتے ایسے معلوم ہوتے ہیں، کہ گویا کسی نے دانستہ زمرد کے پیکان چوڑے بنائے ہیں،

ہدہد اور اسکی کلغی

بوبویک پیکے نامہ دہ اندر سر خویش	نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنا

ہدہد گویا نامہ بر ہے جس نے خط کو اپنی پگڑی میں کھونس لیا ہو، کبھی اسکو کھولتا ہو کبھی تہ کر کے لپیٹ لیتا ہے،

ہدہد اکثر اپنی کلغی کو پھیلا دیتا ہے، اور پھر سمیٹ لیتا ہے،

مناظر قدرت کے اشعار جو اوپر گذرے ہیں، ان میں بھی اکثر تشبیہات ہیں، ان کو بھی سامنے رکھنا چاہئے،

پانچویں و چھٹی صدی

پانچویں صدی کے آغاز میں اگرچہ شاعری کی ترقی کی رفتار گھٹ گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ اس صدی کے وسط میں غزنوی حکومت کا زوال شروع ہو چلا تھا، اور نئی طاقتیں ابھی شباب تک نہیں پہنچی تھیں، لیکن صدی کے ختم ہوتے ہوتے جبکہ غزنوی سلطنت کا زور سلجوقیہ کی طرف منتقل ہو گیا، دفعۃً بحرِ سخن میں طوفان آگیا، سلجوقیہ کا پہلا فرماں روا رکن الدین طغرل بک تھا، جو محرم ۴۲۹ھ میں بمقام نیشاپور مسند نشین ہوا، اس سلسلہ نے اگرچہ صرف ۱۶۳ برس کی عمر پائی، لیکن اتنی ہی تھوڑی مدت میں جو باتیں اس نے حاصل کیں، تاریخ اسلام کو اس سے گوناگوں اور وسیع تعلقات ہیں، اول تو اس سلطنت نے جو وسعت پیدا کی، ابتدائے اسلام سے آج تک کبھی کسی عہد میں نہیں ہوئی تھی، اسی کے ساتھ عدل و انصاف اور امن و امان کا یہ حال تھا کہ خراسان سے شام تک ایک ہروتن تنہا سونا اچھالتا جاتا تھا، اور کوئی خبر نہیں ہوتا تھا، ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایران، عراق روم میں جو بڑی بڑی پر زور سلطنتیں قائم ہوئیں، سب کی سب اسی سلسلہ کی شاخیں تھیں، ترکوں سے پہلے جو سلاطین شاہان روم کہلاتے تھے، اسی خاندان کی ایک شاخ تھے، سلاطین خوارزم شاہیہ جنکی شوکت و شان محتاجِ بیان نہیں، انکا مورثِ اول یعنی

توتگین اسی خاندان کا غلام در غلام تھا، اتابکوں کے متعدد خاندان جنمیں سے نور الدین زنگی سلطان صلاح الدین کا آقا، قزل ارسلان ظہیر فارابی کا ممدوح اور اتابک ابوبکر ابن سعد زنگی شیخ سعدی کا مربی اور سرپرست تھا، سب اسی خاندان کے غلام یا خدمتگزار تھے،

سلجوقیہ کے اوج شباب کا زمانہ ملک شاہ[1] اور سنجر کا زمانہ ہے اور یہی دور فارسی شاعری کا معراج شباب ہے، سلجوقی شعرا کی فہرست نہایت وسیع ہے جنمیں سے چند نام یہ ہیں، امیر معزی، ازرقی، لامعی، فخر الدین اسعد، شہابی خراسانی، عبد الواسع جبلی، انوری، حسن غزنوی، رضی الدین نیشاپوری، ادیب صابر، علی باخرزی، فتوجی مروزی، فرقدی، کافی ہمدانی، نظامی عروضی، نظامی گنجوی، شمس الدین خراسانی، سوزنی، ابو المعالی، (مجمع الفصحا کے دیباچہ میں اور بہت سے نام لکھے ہیں)

اس دور کی چند خصوصیات لحاظ کے قابل ہیں،

اس عہد تک شاعری نے اگرچہ بے انتہا ترقی کر لی تھی، لیکن یہ ترقی صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے تھی، شاعری کی زبان ابتک ٹکسالی نہ تھی، شاعری کی بنیاد سامانی حکومت میں قائم ہوئی، اور غزنویہ کے عہد میں اوج ترقی تک پہنچی، ان خاندانوں کے پایہ تخت بخارا اور غزنین تھے، جہاں کی مادری زبان ترکی یا افغانی تھی، شعرا جس قدر تھے من حیث الاغلب سب کے سب انہی مقامات کے رہنے والے تھے جو ایران

---

[1] ملک شاہ ۴۶۵ھ میں تخت نشین ہوا ۴۸۵ھ میں وفات پائی، اسکے بعد سنجر نے اپنے بھائیوں کی طرف سے نیابت بیس برس تک اور پھر مستقل حکومت کی اور ۵۵۲ھ میں انتقال کیا،

اصلی مرکز یعنی شیراز، اصفہان و نیشاپور سے دور رہتے، فرخی سیستانی تھا، عنصری بلخ کا رہنے والا تھا، منوچہری دامغان سے تعلق رکھتا تھا، عسجدی اور دقیقی مرو کے رہنے والے تھے،

سلجوقیہ نے نیشاپور کو پائے تخت قرار دیا، اس تعلق سے ان لوگوں میں شاعری پھیلی جو ایران کی زبان کے اصلی مالک تھے، اسی کا اثر ہے کہ اس عہد کے شعرا کی زبان زیادہ لطیف، شیریں اور محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے،

اس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی، سلطان محمود اپنے ملکی اور قومی خصوصیات کا پورا دلدادہ تھا تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی ہی رہی، فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اُس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دیجائے، چنانچہ دولت شاہ سلجوقی نے طبقہ اول کے شعرا کا جہاں ذکر شروع کیا ہے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے، یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان جس کے عنصر میں ترقی کا مادہ موجود تھا سلطنت کی زبان بنکر کس قدر ترقی کر گئی ہوگی،

سلطان سنجر کی قدردانی اور حاتمانہ فیاضی نے پھر وہی محمودی دربار قائم کر دیا، امیر معزی کو ملک الشعرا کا خطاب ملا اور بڑے بڑے شعرا پائے تخت کے شاعر قرار پائے، دولت شاہ لکھتا ہے،

اما از شعرائے بزرگ کہ در دور سلطان سنجر بودہ اند، و مدح سلطان گفتہ اند و

صلہ وتربیت یافتہ، ادیب صابر است و رشید و طواط و عبدالواسع جبلی و فرید کاتب و انوری خاورانی و ملک عمادی و سوزنی و سید حسن غزنوی و حستی دیرہ کہ محبوب سلطان و ظریفہ روزگار بوده[1]،

سنجر کی شاعرانہ مذاق اور قدردانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں، اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اسکے دربار میں کیا تھی،

ایک دفعہ ارکانِ دولت کے ساتھ عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی، خوشی سے اچھل پڑا، سب کو انگلی کے اشارے سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے، معزی اس وقت تک دربار میں امیدواری کرتا تھا، موقع پاکر اس نے برجستہ کہا،

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی	یا ہمچو کمان شہریاری گوئی،
نعلے زدہ از زر عیاری، گوئی	در گوش سپہر گوشواری گوئی،

یعنی اے چاند تو ابروے معشوق ہے، یا بادشاہ کی کمان، یا سونے کا نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ،

سنجر نے اسپ خاصہ اور پانچہزار درہم عطا کئے، معزی نے پھر برجستہ کہا،

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید؟	از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید	چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

[1] دولت شاہ ذکر عمق بخاری،

سنجر نے ہزار دینار کے عطیہ کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس کے خطاب میں شامل کیا جائے،

چونکہ سنجر کا لقب معز الدین تھا، اسلئے معزی لقب پڑا جو آج تخلص ہو کر مشہور ہے،

ایکدفعہ سلطان سنجر گیند کھیل رہا تھا، اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی، اور سنجر گھوڑے سے گر گیا، معزی نے برجستہ یہ رباعی پڑھی،

شاہا ادبے کن، فلک بدخو را | کو چشم رسانید رخ نیکو را
گر گوے خطا کرد بہ چوگانش زن | ور اسپ خطا کرد بہ من بخش او را

یعنی اے بادشاہ! آسمان کو ذرا تنبیہ کر دیجئے، اُس نے آپ کو نظر لگا دی، اگر گیند کی خطا ہے تو چوگان سے اُسکو ماریئے، اور گھوڑے کا قصور ہے تو میرے حوالہ فرمایئے، اخیر کا مصرع دو پہلو رکھتا ہے، سنجر نے گھوڑا معزی کو عنایت کیا، معزی نے دوبارہ رباعی پیش کی،

رفتم بر اسپ تا بہ جرمش بکشم | گفتا کہ نخست بشنو این عذر خوشم
نے گاو زمینم کہ جہاں بر گیرم | نے چرخ چہارمین کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینی چاہی، اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سن لیجئے، میں کچھ گاو زمیں تو نہیں کہ عالم کا بار اٹھا لوں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں، مطلب یہ کہ سلطان سنجر کا بار اُٹھانا گاو زمیں اور آفتاب کا کام ہے،

لہ مجمع الفصحا اور خزانہ عامرہ وغیرہ،

مہستی ایک مشہور شاعرہ تھی، جس کی حاضر جوابیاں اور ظریفانہ فقرے مشہور عالم ہیں، سنجر کی شاعرانہ صحبتوں میں وہ بھی شریک ہوا کرتی تھی، ایک دفعہ مجلسِ عیش قائم تھی، مہستی بھی موجود تھی، کسی کام سے باہر نکلی تو دیکھا برف پڑ رہی ہے، واپس آئی، سنجر نے پوچھا ہوا کا کیا رنگ ہے، مہستی نے فی البدیہہ رباعی پڑھی،

شاہا فلکت اسپ سعادت زیں کرد ۔۔۔ وز جملہ خسرواں ترا تحسیں کرد

تا در حرکت، سمند زریں نعلت ۔۔۔ بر گل نہ نہند پاے زمیں سیمیں کرد

یعنی آسمان نے اس غرض سے کہ آپ کے گھوڑے کے پاؤں خاک پر پڑنے نہ پائیں زمین پر چاندی بچھا دی، سنجر نہایت محظوظ ہوا، اور اسی دن سے مہستی سنجر کے مقربین میں داخل ہو گئی،

غزنوی خاندان نے بھی اس عہد میں سنبھالا لیا، بہرام شاہ جو سلطان محمود کی چوتھی پشت میں تھا، اور ۵۱۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا، نہایت شان و شوکت کا بادشاہ اور نہایت علم دوست اور مربی فن تھا، تاریخِ فرشتہ میں اس کا تذکرہ ان لفظوں سے شروع کیا گیا ہے،

" او بادشاہے بود ذی شوکت و صاحبِ حشمت، با علما و فضلا بسیار نشستے و صحبت ایشاں دوست داشتے، و ہر کسے را بقدر علمش رعایت کردے، لہذا افضلاے آں روزگار باسم شریفش کتب ساختہ اند و تصنیفات پرداختہ اند"

کلیلہ و منہ جس کا ترجمہ پہلوی زبان سے عبداللہ بن المقفع نے عربی میں کیا تھا بہرام شاہ کے حکم سے فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی ، اور یہ پہلا دن تھا کہ ایران اور ہندوستان میں اس کا عام رواج ہوا، بہرام شاہ ہی کو یہ فخر نصیب ہوا کہ حکیم سنائی نے جو تعلقات دنیوی سے آزاد ہو چکے تھے، اپنی کتاب حدیقہ اس کے نام پر لکھی، (بہرام شاہ نے ۵۴۷ھ میں وفات پائی)

ان سلاطین کے علاوہ اور بڑے بڑے دربار تھے، جہاں شاعری کی تربیت کیجاتی تھی، ان میں سب سے زیادہ علم دوست طغان شاہ سلجوقی تھا، چہار مقالہ میں لکھا ہو

آلِ سلجوق ہمہ شعر دوست بودند، اما ہیچکس شعر دوست تر از طغان شاہ ابی سلاں نبود، محاورت و معاشرت او ہمہ با شعرا بود و ندیمان او ہمہ شعرا بودند، چون امیر عبداللہ قریشی و ابوبکر ازرقی، و ابو منصور یوسف و شجاعی نوی و احمد بدیہی و حقیقی و نسیمی ایہنا مرتب خدمت بودند و آیند در وند بسیار بودند۔“

اسی طرح شروان شاہ کے دربار کا ملک الشعرا خاقانی اور خوارزم شاہ کا رشید الدین وطواط تھا

صوفیانہ شاعری

بہرام شاہ کے عہد کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہی کہ تصوف اور اخلاقی شاعری کا سنگِ بنیاد اسی عہد میں رکھا گیا، اور صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے، یہ عمارت گویا انجام کو پہنچ گئی، چنانچہ اسکی تفصیل حکیم سنائی، اوحدی اور خواجہ فریدالدین عطار کے حالات میں آئیگی،

فلسفیانہ شاعری

فلسفیانہ شاعری بھی اسی دور کی یادگار ہے فلسفہ کے خیالات سب سے پہلے حکیم ناصر خسرو نے اشعار میں ادا کئے لیکن وہ محض فلسفہ ہی فلسفہ تھا، شاعری نہ تھی، بر خلاف اس کے اس عہد میں عمر خیام نے فلسفیانہ مسائل اور خیالات کو اس انداز سے ادا کیا کہ ظاہر بیں آدمی کو اس میں صرف شاعری نظر آتی ہے، حالانکہ وہ فلسفیانہ نازک مسائل ہیں جو دلکش اور دلفریب پیرایہ میں ادا کر دیئے گئے ہیں،

اس عہد تک شاعری میں عشق و عاشقی کی روح نہ تھی، مثنوی رزم پر محدود تھی، قصائد کا مقصود مداحی تھا تشبیب میں معشوق کا جو ذکر کرتے تھے، وہ صرف عرب کے قصائد کا اتباع تھا، ساقی اور حسین بچوں کا ذکر کرتے تھے تو اس سے محض تفریح مقصود ہوتی تھی، جس طرح امرا کے ہاں تازگی نظر کے لئے پیش خدمت اور غلام حسین اور خوشرو رکھے جاتے تھے، اس عہد میں نظامی نے عشقیہ شاعری کی جداگانہ صنف قائم کر دی، عرب و عجم میں عاشقی میں جو نامور تھے یعنی مجنون و فرہاد، ان کے حالات میں مثنویاں لکھیں، صرف عاشقانہ جذبات اور خیالات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بزم اور عاشقانہ خیالات کے اظہار کے لئے مستقل لٹریچر پیدا کر دیا جس پر آگے چل کر متاخرین نے بڑی بڑی عمارتیں قائم کیں، غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنمکدہ کے آذر نظامی ہی ہیں،

عشقیہ شاعری

قصائد کی صنف کو چنداں ترقی نہیں ہوئی، مضامین میں تو کسی قسم کی جدت پیدا نہیں ہوئی، مداحی، خوشامد، مبالغہ پہلے سے بھی بڑھ گیا، البتہ لفظی صناعیاں کمال کے

درجہ کو پہنچ گئیں، عبدالواسع جبلی اور رشید الدین وطواط نے الفاظ پر اس قدر قابو پیدا کر لیا کہ جس نوع، جس ترکیب، جس انداز کے الفاظ چاہتے ہیں، انکا انبار لگا دیتے ہیں، قصیدے کے قصیدے ہیں، جن میں، تمام الفاظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں جسکو اصطلاح میں صنعت طباق کہتے ہیں، بعض قصیدوں میں التزام کر لیا ہے کہ الف کا حرف جو سب سے عام حرف ہے، نہ آنے پائے، باوجود اس کے یہ قصائد ایسے برجستہ اور رواں ہیں کہ جب تک بتا نہ دیا جائے کہ اسمیں اس صنعت کا التزام کیا گیا ہی اس طرف خیال بھی منتقل نہیں ہو سکتا، اکثر قصیدوں میں یہ التزام ہی کہ ہر مصرع میں پانچ پانچ چھ چھ الفاظ ہیں، اور پہلے مصرع میں جس قدر الفاظ آئے ہیں دوسرے مصرع کے تمام الفاظ بھی انہی الفاظ کے ہموزن، بلکہ ہم قافیہ ہیں، باوجود اس کے کسی قسم کا تکلف نہیں معلوم ہوتا،

عبدالواسع جبلی نے تسجیع کو ۹ قافیوں تک پہنچایا، جس سے وہ صورت پیدا ہو گئی، جس کو عوام بحر طویل کہتے ہیں مثلاً

یا صاحِی ایش الخبر، زاں سرو قدِ سیمبر، کز عشقِ او گشتم سمر، تشنہ لب و خستہ جگر، بر کندہ جان افگندہ سر، با کامِ خشک و چشمِ تر، کردہ زغم زیر و زبر، دنیا و دین و جان و تن

یہ ایک مصرع ہے،

یہ قاعدہ ہے کہ جب بارش اچھی ہوتی ہے، تو جو اور گیہوں کے ساتھ مختلف قسم کی زہریلی گھانس اور خار دار درخت اور بوٹے بھی پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ شاعری

کے چمن میں ہجو کا خارزار اسی عہد کی یادگار ہے جس کے چمن آرا انوری اور سوزنی ہیں،

ہم اس دور کے چند مشہور شعراء کا تذکرہ لکھتے ہیں،

حکیم سنائی

مجدود نام، ابوالمجد کنیت، سنائی تخلص، غزنین وطن تھا، ابتدا میں شاعری کا پیشہ کرتے تھے، چنانچہ بہرام شاہ کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے جو دیوان میں موجود ہیں، لیکن پھر خدا نے توفیق دی اور توبہ کی، توبہ کا سبب ایک دلچسپ قصہ ہے، بہرام شاہ ہندوستان کی مہم پر جارہا تھا، حکیم سنائی نے چاہا کہ اس تقریب سے قصیدہ مدحیہ لکھکر پیش کریں قصیدہ تیار کرکے، دربار کے قصد سے چلے، راہ میں ایک حمام تھا، یہاں ایک پاگل رہا کرتا تھا، اس کا معمول تھا کہ شراب خانوں سے شراب کی تلچھٹ مانگ لایا کرتا اور پی کر مست پڑا رہتا، اسی لئے اسکو لای خوار کہتے تھے، حکیم سنائی حمام کے برابر سے نکلے، تو غنغنانے کی آواز سنی، ٹھہر گئے، دیکھا تو لای خوار ساقی سے کہہ رہا ہے کہ ابراہیم شاہ کے اندھے پن کے صدقے میں ایک پیالہ دینا، ساقی نے کہا کیا لغو بکتے ہو، ابراہیم شاہ نہایت عادل بادشاہ ہے، پاگل نے کہا، ابھی غزنین کے انتظام سے عہدہ برآ نہیں ہوا دوسرے ملک کا ارادہ کرتا ہے اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی،

یہ کہکر پیالہ اٹھایا اور پی گیا، پھر ساقی سے کہا کہ سنائی کے اندھے پن کے

صدقہ میں ایک پیالہ اور لانا، ساقی نے کہا، سنائی نہایت خوش فکر اور خوش طبع شاعر ہے
اُسکی بُرائی کیوں کرتے ہو؟ پاگل نے کہا اس سے بڑھکر کیا حماقت ہو گی کہ دو چار جھوٹ
سچ باتیں جوڑ کر، کسی بیوقوف رئیس کے پاس جاتا ہی، اور دست بستہ کھڑا ہوتا ہی
اور اسکو سناتا ہے، قیامت میں اگر سوال ہوا کہ دربار میں کیا لایا ہے، تو کیا
جواب دیگا، [1]

حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اُسی وقت سب چھوڑ چھاڑ گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے
اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹی کرتے تھے، یا بہرام شاہ نے
اپنی بہن کو انکے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا

من نہ مرد زن و زر و جاہم — بخدا گر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم — بہ سر تو کہ تاج نستانم

ید بیضا میں لکھا ہی کہ سر و پا برہنہ حج کو گئے، وہاں سے واپس آکر غزنین میں
گوشہ نشینی اختیار کی، ننگے پاؤں غزنین کے گلی کوچہ میں پھرا کرتے تھے، انکے عزیز دل
کو رحم آتا، ان کو اس حالت میں دیکھتے تو بے اختیار رو دیتے، یہ انکو سمجھاتے کہ میری
حالت پر رونا نہیں، بلکہ خوشی کرنی چاہیے، ایک دن لوگوں نے جوتی لاکر پیش کی، اُنکی
خاطر سے پہن لی لیکن اتنا تعلق بھی انکی حالت میں خلل انداز ہوا، چنانچہ دوسرے دن
جوتی اُتار کر پھینک دی اور کہا کہ جو بات مجھ میں کل تھی آج نہیں، امیر خسرو نے اسی

[1] نفحات الانس میں بہرام شاہ کے بجائے سلطان محمود کا نام لکھا ہی، اسی بنا پر تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ سے انکار کیا ہے

واقعہ کی طرف ایک قصیدہ میں اشارہ کیا ہے،

ہر سگافت از پاشنایش دین دولت را ست — نیست بہر آن ترک از خود بدار و کفش از آنک

ایک رئیس نے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا، انکو خبر ہوئی اسی وقت رئیس کو خط لکھا کہ

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا، گوشہ دل این گوشہ گرفتہ را بہ تفقد ستایش خود خراب نہ کند جسم حضرا این بندہ نہ سزای خشم خداوندی است[1]"

اس زمانہ میں شیخ ابو یوسف ہمدانی مشہور مشایخ میں سے تھے حکیم سنائی نے اُن سے بیعت کی، شیخ ابو یوسف، ابو علی فارمدی کے مرید تھے جو امام غزالی کے پیر ہیں اس رشتہ سے حکیم سنائی، امام غزالی کے برادر زادہ ہیں،

حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کی، تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں، اسلئے علمائے نے سخت مخالفت کی، یہانتک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی' بہرام شاہ نے دار الخلافہ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علماء نے لکھا کہ یہ مسائل قابلِ اعتراض نہیں، حکیم سنائی نے اپنی برارت کے متعلق ایک خط بھی بہرام شاہ کے نام لکھا، عبد القادر بدایونی نے اس خط کو پورا نقل کیا ہے، اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس بات پر ناراض تھے کہ حکیم سنائی نے حدیقہ میں بنی امیہ کی نہایت

---

[1] یہ تمام تفصیل دولت شاہ میں ہے [2] نفحات،

برائی لکھی تھی، اور اہل بیت کی مدح میں مبالغہ کیا تھا، حکیم سنائی نے ان دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور لکھا کہ آل مروان کی برائی خود احادیث میں آئی ہو، لیکن حکیم صاحب محدث نہ تھے ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ گو آل مروان کی برائی میں شک نہیں، لیکن حدیثیں جو ان کی شان میں مذکور ہیں، سب وضعی اور جعلی ہیں،

حکیم سنائی کی وفات میں سخت اختلاف ہو، تاریخ فرشتہ میں تاریخ گزیدہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بہرام شاہ کے زمانہ میں وفات پائی، اسی تاریخ میں بعض فضلا کا قول نقل کیا ہو کہ ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا، اور اسی سنہ میں حدیقہ بھی تمام ہوئی تھی دولت شاہ نے ۵۷۶ھ میں لکھا ہو، ریاض العارفین میں ۵۴۶ھ ہو،

تصنیفات

نفحات میں لکھا ہو کہ مرتے وقت یہ شعر زبان پر تھا،

بازگشتم زانچہ گفتم زاں کہ نیست   در سخن معنے و در معنی سخن

حکیم سنائی کی تصنیفات میں ایک کلیات ہو جسمیں تیس ہزار شعر ہیں، سات مثنویاں ہیں، حدیقہ، سیر العباد، کارنامہ بلخ، طریق التحقیق، عشق نامہ، عقل نامہ، بہروز، بہرام، حدیقہ چھپ گئی ہے، اور ہر جگہ ملتی ہو، باقی مثنویاں ناپید ہیں، البتہ سیر العباد کے بہت سے اشعار مجمع الفصحا میں نقل کئے ہیں، حدیقہ کی بحر اور وہی انداز ہو،

کلیات میں قصائد، قطعے، غزلیں، رباعیاں سب کچھ ہے، اور افسوس یہ ہو کہ ان پھولوں میں، ہجو کے کانٹے بھی ہیں،

حکیم سنائی کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

اتشبیب اور قصائد میں اُنھوں نے گو اپنے اور تمام معاصرین کی طرح کوئی جدت نہیں پیدا کی لیکن پختگی، برجستگی، اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے، اور قدما میں بھی، فرخی کے سوا، اس خصوصیت میں کوئی ان کا ہمسر نہیں، فرخی کے قصیدہ کا جو جواب لکھا ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

دوش سرمست نگارین من آں طرفہ پسر | یا کلہ پیرہنے با کلہے طرفہ بہ سر،
از سر کوچہ فرود آمد ہموار ہی دادہ | کردہ از غایت دلتنگی صد گونہ طر،
نرم نرمک ہمی آں نرگس پرخواب کشاد | ژالہ ژالہ عرق از عارض او کردہ اثر
بوسہ بر دو لب من داد ہمی از پے عذر | اینت شوریدہ نگار اینت شکر بوسہ بسر
شادماں گشتم ازیں کار و گرفتمش کنار | ہمچو تنگ شکر و خرمن گل تنگ بہ بر
او شدہ خواب و من از بوسہ دن دو رخش | با دو چشم و دو رخش تا بہ سحر جفت سہر
خود کہ داند؟ کہ دراں نیم شب از مستی او | تا چہ بر داشتم از بوسہ و ہر چیزے بر

یہی مضمون ہے جسکو قاآنی نے زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

مست در بستر من خفتہ و رنداں دانند | حالت مست کہ در بستر ہشیار افتد

خیالات اور طرز ادا میں کہیں کہیں جدت بھی پائی جاتی ہے، مثلاً کمر بر و شجر بر کی طرح میں جو قصیدہ کہا ہے اسمیں ایک قطعہ بند ہے،

در زینت و در رنگ کلاہ و کمر خویش | زحمت چہ کشی در طلب گوہر و زر بر
ایں اشک من و رنگ رخ من بہر اے شوخ ق | ایں را بہ کلہ بر زن و آں را بہ کمر بر

یعنی اے معشوق اپنے کمربند، اور کلاہ کی زینت میں اس قدر زحمت کیوں اٹھاتا ہے، میرا آنسو اور میرے چہرہ کا رنگ لیکر کلاہ اور کمر پہ لگالے کہ زر و گوہر کا کام دیں گے آنسو گوہر اور چہرہ کا رنگ زردی کی وجہ سے زر کے مشابہ ہے،

۲۔ حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جس نے تصوف کو شاعری سے روشناس کیا، اس سے پہلے حضرت ابوسعید ابوالخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن اُن میں صرف جوشِ عشق کو پرزور طریقہ سے ادا کیا ہی، تصوف کے مسائل، اسرار اور معارف نہیں، بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصنیفیں ہیں، خود حکیم صاحب کو بھی اس کا دعویٰ ہے، چنانچہ حدیقہ میں کہتے ہیں،

کس نہ گفت این چنین سخن بجہاں ۔۔۔ در کسی گفت، گو بیار و بخواں

زیں نمط ہرچہ در جہاں سخن است ۔۔۔ گر یکے در ہزار، آنِ من است

چوں ز قرآں گذشتی و ز اخبار ۔۔۔ نیست کس را ازیں نمط گفتار

اس دعویٰ کو اکابر صوفیہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مولانا روم فرماتے ہیں،

ترک جوشے کردہ ام نیم خام ۔۔۔ از حکیم غزنوی بشنو تمام

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ۔۔۔ ما از پسِ سنائی و عطار آمدیم

حدیقہ میں تصوف کے تمام مقامات کو الگ الگ عنوان سے لکھا ہی، اور نہایت خوبی سے ادا کیا ہی، اس کتاب کے چوتھے حصہ میں جہاں صوفیانہ شاعری کا ریویو ہوگا حدیقہ کے انتخابات درج کئے جائیں گے،

سوپند مار کی شاعری اگرچہ نیچرل شاعری تھی، لیکن طرز ادا شاعرانہ نہ تھا، جس بات کو کہنا چاہتے تھے، صاف، بے تکلف، سیدھے سادھے طور پر کہدیتے تھے، معمولی بات کو انوکھے پیرایہ میں ادا کرنا، یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا، متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہی لیکن اسکے موجد حکیم سنائی ہیں، اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہی،

۴۔ اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی نے قائم کی، اور آگے چل کر اس صنف کو بہت وسعت ہوئی، لیکن اصول اور آئین حکیم سنائی نے قائم کر دیئے تھے،

اخلاقی شاعری کی سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ جو بات کہی جائے اس کے لئے پیرایۂ بیان ایسا ڈھونڈھا جائے کہ سننے والے کو معلوم ہو کہ اس سے پہلے کسی نے اسکی اصلی حقیقت نہیں ظاہر کی تھی، اور یہ کہ وہ جس کام کو معمولی بات سمجھتا تھا، وہ نہایت نفرت انگیز اور بدترین افعال ہے، اسکے لئے شاعر کو ضرور ہے کہ وہ سامنے کی باتوں سے ایسے نتائج پیدا کرے جو بظاہر بالکل اچھوتے معلوم ہوں، اور جس کی طرف خیال نہ گیا ہو،

مثلاً یہ بات عام ہے کہ طبیب جس چیز کو منع کر دیتا ہے، لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں، لیکن شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کرتے، اب دیکھو حکیم سنائی اس واقعہ سے نصیحت کا کیا پہلو پیدا کرتے ہیں، اُنھوں نے دیکھا کہ طبیب اکثر پارسی، عیسائی، یہودی ہوتے ہیں، یہ بھی دیکھا کہ جن چیزوں کو طبیب منع کر دیتا ہی، اکثر حلال ہوتی ہیں مثلاً حلوا مٹھائی وغیرہ، اور شریعت جن چیزوں کو منع کرتی ہی وہ مضر اور ناجائز ہوتی ہیں ان باتوں سے اُنھوں نے اس طرح کام لیا،

ترا ایزداں ہمے گوید کہ در دنیا مخور بادہ	ترا ترسا ہمے گوید کہ در صفرا مخور حلوا
ز بہر دین تو نگذاری حرام از حرمت یزداں	ولیک از بہر تن مانی، حلال از گفتہ ترسا

یعنی خدا نے حکم دیا کہ شراب نہ پیو، اور عیسائی (طبیب) کہتا ہے کہ حلوا نہ کھاؤ حلوا حلال چیز تھی، اس کو تو تم نے ایک عیسائی کے کہنے سے چھوڑ دیا، اور شراب جس کو تم خود بھی ناجائز سمجھتے ہو، خدا کے کہنے سے بھی نہیں چھوڑتے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم خدا کے حکم کو ایک عیسائی کی بات کے برابر بھی نہیں سمجھتے،

اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ انسان مر کر تمام جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے، اس سے حکیم سنائی نے نصیحت کا یہ پیرایہ پیدا کیا ہے،

با ہمہ خلق جہاں گرچہ ازاں	بیشتر گمرہ و کمتر بہ رہ اند،
آں چناں زی کہ چو میری برہی	نہ چناں زی کہ چو میری برہند

یعنی لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ کہ جب مرو تو تم جھگڑوں سے چھوٹ جاؤ، نہ یہ کہ جب تم مرو تو لوگ جھگڑے سے چھوٹیں، یعنی تمہارے افعال سے ہر شخص تنگ آرہا تھا، اس لئے جب تم مروگے تو لوگوں کو نجات ہوگی،

شراب کی برائی کا یہ پہلو ہر شخص جانتا ہے کہ نشہ میں انسان بیہودہ بکتا ہے، گالیاں دیتا ہے، لڑتا ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان نشہ کی حالت میں فیاض اور کرم گستر بن جاتا ہے اور یہ تعریف کا پہلو ہے، اب دیکھو شاعر اس تعریفی پہلو سے کیونکر شراب کی برائی کا یقین دلاتا ہے،

نکند عاقل مستی، نخورد دانا مے | نہ نہد مرد ہشیار سوی مستی پے
گر کنی بخشش گویند کہ مے کرد نہ او | ور نہ کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

یعنی شراب ایسی چیز ہے کہ انسان اگر سخاوت بھی کرتا ہے تو لوگ اسکی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ شراب کا فیض ہی،

از پے رد و قبول عامہ خود را خر مکن | زاں کہ نبود کار عامہ، خر خری یا فرخری
گاو را دارند باور در خدائی عامیان | نوح را باور ندارند از پے پیغمبری

اس قدر سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم نے گوسالہ کی پرستش کی تھی، اور آج بھی ہندوؤں کے نزدیک گاے نہایت مقدس چیز ہے، یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت نوحؑ کو ان کی امت نے پیغمبر تسلیم نہیں کیا، ان دونوں باتوں سے شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ عوام کا رد و قبول کس قدر ناقابلِ اعتبار ہے، ماننے پر آئے تو گاے کے بچھڑے کو خدا بنا دیا، اور انکار کی طرف جھکے تو حضرت نوحؑ کو پیغمبر بھی تسلیم نہیں کرتے،

اختلاط اور صحبت میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی، اسلئے اربابِ حال دونوں طرف گئے ہیں، لیکن اس نکتہ کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا کہ خوبی کا جو پہلو ہے وہ بھی زحمت سے خالی نہیں،

کسے کش خرد رہنمون است ہرگز | بہ گیتی رہ و رسم الفت نورزد
کہ صحبت نفاقی است یا اتفاقی | دل مرد دانا ازیں ہر دو لرزد

اگر خود نفاقی است جاں را بکاہد | وگر اتفاقی است ہجراں نیرزد

یعنی اگر صحبت منافقوں کے ساتھ ہے تو ظاہر ہے کہ سوہانِ روح ہے، اور اگر خاص احباب کے ساتھ ہے تب بھی اسلیئے بُری ہو کہ اس حالت میں جدائی کا صدمہ جاں گزا ہوگا،

بہ حرص[۱] ار شربتے خوردم مگیر از من کہ بد کردم | بیاباں بود و تابستان و آب سرد و استسقا

چوں[۲] تو شدی پیر بلندی مجو | کاں کہ ز تو زاد، بلندآں شود

روز نہ بینی کہ بہ پایاں رسد | سایۂ ہر چیز دو چنداں شود

زشت[۳] باشد روے نازیبا و ناز | سخت باشد چشم نابینا و درد

با دو[۴] قبلہ در رہ توحید نتواں رفت راست | یا رضای دوست باید، یا رضای خویشتن

سوے[۵] آں حضرت نہ پوید ہیچ دل با آرزو | با چنیں گلرخ نہ خسپد ہیچ کس با پیرہن

ایں[۶] جہاں بر مثال مرداریست | کرگساں گرد او ہزار ہزار

ایں مرآں را ہمی کشد مخلب (چنگل) | آں مرایں را ہمے زند منقار

آخر الامر بر پرند ہمہ | وز ہمہ باز ماند ایں مردار

یہ جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے، ایشیا کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے، فارسی شعرا میں مولانا روم پر یہ نشہ چھایا ہوا ہے، خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بدمست

---

۱ گناہ کی معذرت ۲ بوڑھے جواں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۳ بدلیاقت آدمی کو غرور اور زیادہ بدنما ہے ۴ یکسوئی ۵ مقام وصال میں ترکِ آرزو ۶ دنیا اور طالبانِ دنیا،

ہو جاتے ہیں، لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیشرو ہیں، اشعار ذیل کو پڑھو، اور ان کے الفاظ، ترکیب، انداز بیان، مضمون، ایک ایک چیز کو دیکھو کس طرح جوش سے لبریز ہیں

یا برو چون زنان رنگی و بوی پیش گیر　　　یا چو مردان اندر آی و گوی در میدان فگن

چون دو عالم زیر پایت قطع شد پایی بکوب　　　چون دو کون اندر دو دست جمع شد دستی بزن

سر برآر از گلشن توحید تا در کوی دین　　　کشتگان زنده بینی انجمن در انجمن

دی ز دل تنگی زمانی طوف کردم در چمن　　　یک جہان جان دیدم آنجا جستہ از زندان تن،

بی طرب خوشدل طیور و بی طلب جنبان صبا　　　بی دہان خندان درخت و بی زبان گویا چمن

طالب ای عاشقان خوش رفتار　　　طرب ای شاہدان شیرین کار

تا کے از خانہ ہان رہ صحرا　　　تا کے از کعبہ ہین در خمار

در جہان شاہدے و ما فارغ!　　　در قدح جرعہ و ما ہشیار

بسکہ شنیدی صفت روم و چین　　　خیز و بیا ملک سنائی ببین

تا ہمہ دل بینی بے حرص و بخل　　　تا ہمہ جان بینی بے کبر و کین

پای نہ و چرخ بزیر قدم　　　دست نہ و ملک بزیر نگین

رستہ ز ترکیب زمان و مکان　　　جستہ ز ترتیب شہور و سنین

روح امین دادہ بدہش ہمانکہ　　　دادہ بہ مریم ز رہ آستین

۶۔ شاعری کے اجزا میں ایک بڑا ضروری جز تمثیل اور تشبیہ ہے، شاعر کبھی کوئی اخلاقی دعویٰ کرتا ہے تو دلیل میں اسکو تمثیل پیش کرنی پڑتی ہے، کبھی کسی چیز کی اچھائی

یا برائی ثابت کرنا، یا کسی چیز کی تصویر اور ہئیت کھینچنا چاہتا ہے تو تشبیہ اور تمثیل کے بغیر چارہ نہیں ہوتا، اسی بنا پر اکثر بڑے بڑے شاعر مثلاً سعدی، صائب، کلیم، غنیمؔ تمثیل میں کمال رکھتے تھے، شاعری کی اس صنف کے موجد بھی حکیم سنائی ہی ہیں، ذیل کی مثالوں سے معلوم ہوگا کہ انکی تمثیلیں کس قدر نادر اور موثر ہوتی ہیں،

حصول مقصد کے لئے دیر اور انتظار شرط ہے،
اور جو مقصد جس قدر اہم ہوگا اسی قدر زیادہ دیر ہوگی،

ہر خسے از رنگ گفتارے بدیں رہ کے رسد — درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن
ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب گل — شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن
ماہہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش — صوفیے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن
سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب — لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
ساعت بسیار می باید کشیدن انتظار — تا کہ در جوف صدف باراں شود در عدن
قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع — عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سخن
صدق و اخلاص و درستی باید و عمر دراز — تا قرین حق شود صاحبقرانے در قرن

تو بعلم[1] آموختی از حرص اینک ترس کاندر شب — چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا
چو تن جاں را مزین کن بہ علم و دیں[2] کہ زشت آید — درون سو شاہ عریاں بروں سو کوشک دیبا

اب ہم حکیم سنائی کے بعض قطعات و قصائد کے اشعار یکجا لکھتے ہیں، جس سے انکی عام شاعری کا اندازہ ہو سکے گا۔

ملکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون است آں والا — قدم زیں ہر دو بیروں نہ اینجا باش و نہ آں جا

[1] علم زیادہ پر خطر گناہوں کا سبب ہو سکتا ہے [2] صفائی ظاہری کے ساتھ صفائی باطن بھی ضروری ہے،

بهر چه از راه باز افتی چه کفر آن حرف چه ایمان
بهر چه از دوست وا مانی چه زشت آن نقش چه زیبا

چو علمت هست خدمت کن چو بی علمان که زشت آید
گرفته چینیان احرام و مکی خفته در بطحا

مرا باری بحمدالله ز راه حکمت و همت
بسوی خط وحدت برد عقل از خطهٔ اشیا

نخواهم لاجرم نعمت نه در دنیا نه در جنت
همی گویم بهر ساعت چه در ضراء چه در سرا

که یارب مر سنائی را سنائی ده تو در حکمت
چنان کز وی به رشک آید روان بوعلی سینا

مگردان عمر من چون گل که در طفلی شوم کشته
مگردان حرص من چون مل که در پیری شوم برنا

بهر چه از اولیا گفتند ارزقنی و وفقنی
بهر چه از انبیا گفتند آمنا و صدقنا

پرده وار عشق دان رسم ملامت بر فقیر
پاسبان ورشناس این آب تلخ اندر بحار

ای بسا عنبا که اندر حشر خواهد بد از آن که
هست ناقد بس بصیر و نقدها بس کم عیار

عقل جزوی کی تواند گشت بر گیهان محیط
عنکبوتی کی تواند کرد سیمرغی شکار

کی شود ملک دو عالم تا تو باشی ملک آن
کی بود اهل نثار آن کس که برچیند نثار

باش تا کل یابی آنها را که امروزند جزو
باش تا گل یابی آنها را که امروزند خار

گوئی که بعد ما چه کنند و کجا روند
فرزندگان و دخترگان یتیم ما

خود یاد ناوری که چه کردند و چون شدند
آن مادران و آن پدران قدیم ما

آدمی را دو بلا کرد رهی
و اندر از هر دو بلا روز بهی ،

یا کند پر شکم خویش ز نان
یا کند پشت خود از آب تهی ،

عمرخیام بن ابراہیم نیشاپوری

عمرو نام، خیام لقب نیشاپور وطن، غالباً آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا، جس کی وجہ سے خیام کا لقب ملا، عمرو نے جب تحصیل شروع کی تو دو شخص اس کے ہم سبق تھے ان میں رابطۂ محبت اس قدر بڑھا کہ سب نے عہد کیا کہ ہم میں سے جب کوئی شخص بڑے منصب پر پہنچے گا تو اپنے ساتھیوں کو بھی اپنا ہمسر بنائے گا، اس وقت دنیا کو کیا معلوم تھا کہ یہ مکتب کے لونڈے جو اس وقت ایک خیالی منصوبہ باندھتے ہیں، آگے چل کر دنیا کی تاریخ بدل دیں گے، ان میں سے ایک کا نام حسن ابن علی اور دوسرے کا حسن تھا، حسن بن علی نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ الپ ارسلان سلجوقی کا وزیر ہو گیا، اور ۴۶۵ھ میں جب الپ ارسلان نے وفات پائی، اور ملک شاہ سلجوقی مسند آرا ہوا تو وہ کل سیاہ و سفید کا مالک تھا، یہی حسن ہے، جو آج نظام الملک (بانی نظامیہ بغداد) کے نام سے مشہور ہے، عمرو خیام کو جب معلوم ہوا کہ میرا ہم سبق تاج و تخت کا مالک ہے تو اصفہان میں نظام الملک کے پاس آیا، نظام الملک نے بڑے احترام سے خیر مقدم کیا، نظام الملک کو اپنا عہد یاد تھا، خود پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، خیام جو کچھ چاہتا، اس کو

مل سکتا تھا، لیکن ملکِ قناعت کے شہنشاہ نے صرف معمولی وجہ معاش کی درخواست کی، نظام الملک نے خیام کے وطن نیشاپور میں کم وبیش بارہ سو روپیے سالانہ کی جاگیر مقرر کردی[1]، خیام نے اگرچہ صرف معمولی جاگیر پر قناعت کی، لیکن سلاطین و امراء اس سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے، شمس الملوک خاقان بخاری اس کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتا تھا، ملک شاہ سلجوقی جو دنیائے اسلام کا شہنشاہ اعظم تھا، اس سے ندیمانہ تعلقات رکھتا تھا[2]، دولت شاہ سلجوقی نے لکھا ہے کہ سلطان سنجر بھی اس کو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا لیکن شہرزوری کی تاریخ الحکماء سے معلوم ہوتا ہے کہ سنجر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے، شہرزوری نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس زمانہ میں سنجر شاہزادہ تھا، اس کو چیچک نکلی خیام معالجہ کے لئے طلب ہوا، وزیر نے خیام سے پوچھا کہ بچّا کی کیا حالت ہے، خیام نے کہا آثار اچھے نہیں، یہ خبر کسی نے سنجر کو پہنچائی اس کو نہایت رنج ہوا، اور یہ رنج ہمیشہ قائم رہا،

۴۶۷ھ میں ملک شاہ نے ایک عظیم الشان رصد خانہ قائم کرنے کا ارادہ کیا، دور دور سے بڑے بڑے ہیئت دان اور منجم بلوائے، ان میں ابوالمظفر اسفزاری میمون بن نجیب واسطی، اور ہمارا نامور خیام بھی تھا، ابن الاثیر نے جلال

---

[1] دولت شاہ، لیکن جاگیر کی آمدنی کی تعیین اور کتابوں سے ماخوذ ہے،

[2] تاریخ الحکماء شہرزوری،

اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ اس رصد خانہ پر بیشمار دولت صرف ہوئی، اس رصد سے جو زیچ تیار ہوئی وہ خاص خیام کی تیار کردہ تھی، چنانچہ کشف الظنون زیچ ملک شاہی کے ذکر میں صاف تصریح ہے،

خیام زیادہ تر فلسفۂ یونان کا درس دیتا تھا، اور اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا، یہ خیالات جب زیادہ پھیلے تو عوام میں سخت برہمی پیدا ہوئی یہانتک کہ لوگوں نے اسکو بے دین قرار دیکر قتل کر دینا چاہا، مجبوراً اس نے حج کا ارادہ کیا کہ حرم میں کوئی کسی کو ستا نہیں سکتا، حج سے فارغ ہو کر بغداد میں آیا، یہاں لوگوں نے نام سنا تو ہر طرف سے ٹوٹ پڑے کہ علوم فلسفیہ سیکھیں، لیکن اس نے انکار کیا، اور بغداد سے چل کر وطن میں آیا[1]،

وفات | اس کی وفات کا دلچسپ حصہ ہے، ایک دن بو علی سینا کی کتاب الشفاء مطالعہ کر رہا تھا، جب وحدت و کثرت کی بحث آئی تو اٹھ کھڑا ہوا، عادت تھی کہ ہر وقت خلال پاس رکھتا تھا، اس کو ورق میں رکھ کر اٹھا، نماز پڑھی، وصیت کی، شام تک کچھ نہ کھایا، نماز عشا پڑھ کر سجدہ کیا اور کہا اے خدا جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے تجھکو پہچانا، اسلئے مجھ کو بخش دے، یہی کہتے کہتے جان نکل گئی، مجمع الفصحا میں ہے کہ ۵۱۷ھ میں وفات پائی،

دفن کا قصہ اس سے بھی عجیب تر ہے، نظامی عروضی اس زمانہ کا مشہور شاعر

---

[1] تاریخ الحکماء جمال الدین قفطی،

ہے جس کی کتاب چار مقالہ چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا بیان ہے کہ ۵۰۶ھ میں
میں بلخ گیا، معلوم ہوا کہ خیام آجکل یہیں امیر ابو سعید کے مکان پر مقیم ہے، میں
خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں خیام نے کہا کہ میری قبر ایسے مقام میں ہوگی
کہ ہر سال دو دفعہ درخت اس پر پھول برسائیں گے، مجھکو تعجب ہوا، ساتھ ہی خیال
آیا کہ ایسا بڑا شخص لغو گو نہیں ہو سکتا، ۵۳۰ھ میں میں جب نیشاپور پہنچا تو حکیم موصوف
کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا، چونکہ مجھ پر شاگردی کا حق تھا، ایک آدمی کو ساتھ
لیا کہ قبر کا پتہ بتائے، وہ قبرستان حیرہ میں لوا گیا، دیکھا تو باغ کی دیوار کے نیچے قبر
ہے، سرہانے امرود اور زردآلو کے درخت ہیں، شگوفہ جھڑ کر اس قدر ڈھیر ہو گئے
ہیں کہ قبر ڈھک گئی ہے، مجھکو حکیم موصوف کا قول یاد آگیا، اور بے اختیار آنسو نکل پڑے[1]

فضل و کمال

خیام کو آج زمانہ شاعری کی حیثیت سے جانتا ہے لیکن وہ فلسفہ میں
بو علی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب تاریخ میں امام فن تھا، جمال الدین
قفطی نے تاریخ الحکما میں اس کا نام ان القاب سے شروع کیا ہے "امام خراسان و
علامۃ الزمان"، شہرزوری تاریخ الحکما میں لکھتے ہیں، کان تلو ابی علی فی اجزاء علوم الحکمۃ
وکان عالما باللغۃ والفقہ والتواریخ، حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اصفہان میں
ایک کتاب نظر سے گذری، سات دفعہ اس کا مطالعہ کیا، نیشاپور میں واپس آیا تو ساری
کتاب زبانی لکھوا دی، اصل سے مقابلہ کیا گیا تو خفیف فرق نکلا،[2]

[1] چہار مقالہ ذکر منجم ماہر [2] شہرزوری،

ایک دفعہ وزیر عبد الرزاق کے ہاں علمی صحبت تھی، ابو الحسن غزالی جو اس زمانہ میں فن قرأت کے امام تھے وہ بھی موجود تھے، اتفاق سے خیام بھی آنکلا، عبد الرزاق نے خیام کو آتا دیکھکر کہا علی الخبیر سقطنا، یعنی واقف کار آگیا، مسئلہ زیر بحث کو خیام کے آگے پیش کیا، اس نے ساتوں قرأتیں، شاذ روایتیں، اور ان کے دلائل اور وجوہ بیان کرکے ایک قرأت کو ترجیح دی، غزالی بے اختیار بول اٹھے کہ حکما کا کیا ذکر خود قرأ میں سے کسی کی یہ معلومات نہیں ہوسکتی،[1]

قاضی عبد الرشید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ خیام سے میں مرو کے حمام میں ملا، اور سورہ معوذتین کے معنی دریافت کئے، یہ بھی پوچھا کہ ان سورتوں میں بعض الفاظ بار بار کیوں آئے ہیں، خیام نے برجستہ جواب دینا شروع کیا، مفسرین کے اقوال انکے دلائل اور شواہد اس تفصیل اور وسعت سے بیان کئے کہ اگر ساری تقریر قلمبند کرلیجاتی تو اچھی خاصی کتاب بنجاتی،[2]

فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے مذہبی علما اس سے مخالفت رکھتے تھے، اس زمانہ میں مذہبی گروہ کے پیشرو امام غزالی تھے، جنھوں نے تہافۃ الفلاسفہ لکھکر فلسفہ کا ابطال کیا تھا، وہ مناظرہ کے لئے خیام کے پاس گئے، اور پوچھا کہ آسمان کے تمام اجزا باہم متشابہ اور متحد الحقیقۃ ہیں، پھر بعض اجزا میں کیا خصوصیت تھی کہ قطبین قرار پائے، خیام مسائل فلسفیہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا، اس نے پہلے تو یہ کہکر ٹالا کہ میں

---

[1] شہرزوری، [2] ایضاً،

اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں بتفصیل لکھ چکا ہوں، پھر جواب دیا تو اس طرح کہ پہلے ابتدائی مراتب بیان کئے، چنانچہ اس مسئلہ سے ابتدا کی کہ حرکت کس مقولہ سے ہے،، پھر اس کو اس قدر پھیلایا کہ یہ مسئلہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ظہر کی اذان کی آواز آئی امام غزالی یہ کہہ کر اٹھ گئے، جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا[1]

نجوم کا فن اگرچہ مہمل چیز ہے، لیکن یونانی حکماء عموماً اس کے قائل تھے، وہی خیالات مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئے، خیام اس فن میں کمال رکھتا تھا، اور اس لئے منجم کہلاتا تھا، ۵۰۸ھ میں بادشاہ وقت نے خواجہ بزرگ صدر الدین محمد بن المظفر کے پاس آدمی بھیجا کہ میں شکار کو جانا چاہتا ہوں، خیام سے کہدو کہ اعمال نجوم کے ذریعہ سے ایسی تاریخ مقرر کرے کہ برف و بارش سے محفوظ ہو، خیام نے دو دن کے غور و فکر کے بعد ایک دن معین کیا، بادشاہ اسی دن سوار ہوا، کوس دو کوس گیا ہوگا کہ بڑے زور کا بادل اٹھا اور چاروں طرف برف بچھ گئی، لوگوں نے خیام کی ہنسی اڑائی، بادشاہ نے چاہا کہ وہیں سے پلٹ جائے، خیام نے کہا ابھی بادل پھٹے جاتے ہیں، اور پانچ دن تک نم بھی نہ ہوگی، اتفاق یہ کہ خیام کی پیشین گوئی پوری اتری[2]،،

تصنیفات تصنیفات بہت کم ہیں، زیج جو تیار کی تھی، اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتہ نہیں لیکن یورپ نے چھاپکر شائع کی ہے، باقی چند رسالے ذیل میں درج ہیں جن کا ذکر شہرزوری نے کیا ہے،

---

[1] شہرزوری [2] تاریخ الحکماء،

طبعیات میں ایک مختصر رسالہ،

وجود کی حقیقت پر ایک رسالہ،

کون اور مسئلہ تکلیف پر ایک رسالہ، (یہ رسالہ آج کل مصر میں چھاپا گیا ہی)

عربی میں بہت سے شعر لکھے ہیں، چند ذیل میں درج ہیں (از شہرزوری)

یدبجر لی الدنیا بل السبعة العلی   بل الافق الاعلی اذا جاش خاطری
اصوم علی الفحشاء جهرا وخفیة   عفافا وافطاری بتقدیس خاطری
وکم عصبة ضلت عن الحق فاهتدت   لطرق الهدی من فیضی المتقاطر
فان صراط المستقیم بصائر   نصبن علی وادی العمی کالقناطر

اذا قنعت نفسی بمیسور بلغة   یحصلها بالکد کفی وساعدی
امنت تصاریف الحوادث کلها   فکن یا زمانی موعدی او مساعدی
وهبنی اتخذت الشعری بین منازلی   وفوق مناط الفرقدین مصاعدی
الیس قضی الرحمن فی حاکمه بات   یعید الی نحس جمیع المساعد
متی باعدت دنیاک کان مصیبة   فوا عجبا من ذا القریب لمباعد
اذا کان محصول الحیاة منیة   فسیان حالا کل ساع وقاعد

رضیت دهرا طویلا فی التماس اخ   یرعی ودی اذا ذو خلة خانا
فکم الفت وکم اخیت غیر اخ   وکم تبدلت بالاخوان اخوانا
وقلت للنفس لما عز مطلبها   بالله ما تالفی ما عشت انسانا

رباعیات | عجیب بات ہے، خیام فلسفہ میں، نجوم میں، فقہ میں، ادب میں، تاریخ میں کمال رکھتا تھا، لیکن اتنے ستاروں کے ساتھ اسکا افقِ شہرت بالکل تاریک ہے، جس چیز نے آٹھ سو برس تک اس کے نام کو زندہ رکھا، وہ چند فارسی رباعیاں ہیں، اور یہی اسکی شہرت کے بال پرواز ہیں، ان رباعیوں کیساتھ مسلمانوں نے جسقدر اعتنا کیا اس سے ہزاروں درجہ بڑھکر یورپ نے کیا،

ہماری کتاب کا اصل موضوع شاعری ہے، اسلئے سب سے پہلے ان رُباعیوں کی تنقید میں ہمکو شاعری کا پہلو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، اگر ان رباعیوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہے، کوئی اخلاقی تعلیم نہیں ہے، کوئی دقیق نکتہ نہیں ہے تو نہ ہو، بحث صرف یہ ہے کہ شاعری اور شاعری کیساتھ زبان کی خوبی اور صفائی ہے یا نہیں؟ یعنی خیام اگر حکیم نہ ہوتا تو کم ازکم شاعر ہوسکتا تھا یا نہیں؟

شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدت اور دلآویزی ہے، شاعر ایک معمولی بات کو لیتا ہے اور ایسے دلکشا اور ندرت آمیز اسلوب سے ادا کرتا ہے کہ سب وجد کرنے لگتے ہیں، اسلوب بیان کی دلآویزی کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، کبھی صرف زبان کی بے تکلفی، روانی اور شستگی یہ کام دیتی ہے، کبھی عام طریقہ کے بدل دینے سے یہ بات پیدا ہوتی ہے، کبھی شاعرانہ طرز استدلال سے، کبھی شوخی و ظرافت سے، کبھی استعارہ و تشبیہ کی ندرت سے، اور سچ یہ ہے کہ اسکی تمام ادائیں متعین اور مشخص نہیں ہوسکتیں، سننے والے کو اتنا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے دل میں چٹکی لے لی، کس نے لی

کیوں لی، یہ کچھ نہیں معلوم،

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

خیام کی رُباعیاں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ہیں، لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں، دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلہ جبر، توبہ استغفار ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سو سو دفعہ کہتا ہے، لیکن ہر دفعہ اسطرح بدل کر کہتا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے،

دنیا کی بے ثباتی اور اس سے عبرت کا مضمون نہایت پامال مضمون ہے، لیکن خیام ہر بار ایک ایسا نیا اسلوب ڈھونڈھ لاتا ہے کہ نیا اثر پیدا ہوتا ہے،

توبہ و استغفار بھی ایک فرسودہ مضمون ہے لیکن جس طرح خیام اسکو ادا کرتا ہے سننے والے کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں، بعض جگہ رقت انگیز طریقہ کو چھوڑ کر استدلال کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اور وہ بظاہر ایسا قوی ہوتا ہے کہ گویا اس کا جواب نہیں ہو سکتا، امثلۂ ذیل کو دیکھو،

جدت اسلوب

رباعی

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن　　بر جانِ دلِ اسیر من رحمت کن
بر پائے خرابات و من بخشائے　　بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

مغفرت کی دعا مانگتا ہے، لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں یعنی ہاتھ اور پاؤں کے لئے (گو وہ اسی کے ہاتھ پاؤں ہیں) اس طریقہ سے دعا کا اثر بڑھتا ہے، کیونکہ اپنے

لئے دعا مانگنا پھر بھی ایک قسم کی ذاتی غرض ہے، اسکے ساتھ نکتہ یہ ہے کہ اعضا کی برات آسانی سے ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ان کا کیا قصور ہے، وہ اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کر سکتے،

ہاتھ اور پاؤں کے مقابلہ میں صنعتِ طباق ہے، اور اس سے بھی ایک لطف پیدا ہوگیا ہے،

در ملکِ تو از طاعت ما ہیچ فزود؟ | وز معصیتے کہ ہست نقصانے بود؟
بگذار و مگیر از اں کہ معلوم شد | گیرندۂ دیری و گذارندۂ زود؟

خدا سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا اگر میں نے اطاعت کی تو کیا تیری سلطنت کو کچھ ترقی ہوگئی، ؟ اور اگر گناہ کیا تو کیا کچھ تیرا نقصان ہوگیا، اے خدا مجھکو چھوڑ دے اور گرفت نہ کر، مجھکو معلوم ہوگیا ہے کہ تو دیر کے بعد پکڑتا ہے اور جلد چھوڑ دیتا ہے،

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا است | تاریک دلم نور صفائی تو کجا است
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی، | آں بیع بود لطفِ عطای تو کجا است

کس شاعرانہ انداز سے مغفرت کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ اے خدا اگر تو بہشت طاعت کے معاوضہ میں دیگا تو یہ تو خرید و فروخت ٹھہری (جو سوداگروں کا کام ہے نہ شاہوں اور شہنشاہوں کا) وہ لطف وہ عطا جس کے قصے سنا کرتے تھے، وہ کہاں ہے، یہی مضمون ہے جس کو شیخ سعدی نے گلستاں میں ادا کیا ہے، اور وہ گلستاں کے خاص محاسن میں شمار کیا جاتا ہے، "بدریوزہ گرمی آمدہ ام نہ بہ تجارت"

آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو
صد سالہ شدم بناز در نعمت تو

صد سال بہ امتحاں گنہ خواہم کرد
تا جرم من است بیش یا رحمت تو

دیکھو کس ادا سے مغفرت چاہتا ہے، کہتا ہے کہ میں سینکڑوں برس دانستہ گناہ کرونگا، مجھکو یہ امتحان کرنا ہے کہ میرا جرم زیادہ ہے، یا تیری رحمت، یعنی دیکھوں ان دونوں میں کون غالب آتا ہے،

فریاد کہ عمر رفت بر بیہودہ
ہم لقمہ حرام ہم نفس آلودہ

فرمودہٴ ناکردہ سیہ رویم کرد
فریاد ز کردہاے نافرمودہ

فرائض کو فرمودہٴ ناکردہ، اور گناہوں کو کردہاے نافرمودہ سے تعبیر کیا ہی،

مشہور ہے کہ ایک دفعہ خیام کی صراحی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور ٹوٹ گئی اس پر اس نے رباعی لکھی،

ابریق می مرا شکستی ربا
بر من در عیش را ببستی ربا

بر خاک بریختی مے لعل مرا
خاکم بدہن کہ سخت مستی ربا

کہتے ہیں کہ اس گستاخی پر خدا نے اسکو سزا دی اور اس کی گردن کج ہو گئی، اس پر اس نے برجستہ کہا،

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
واں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو

من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

یعنی میں نے برائی کی، اب تو اسکی سزا بھی ویسی ہی بری دیتا ہے، تو مجھ میں اور

تجھ میں کیا فرق رہ گیا،

طلبِ مغفرت کا مضمون اکثر شعرا نے باندھا ہے، نظامی کہتے ہیں،

گناہ من ار نامدے در شمار ۔۔۔ ترا نام کے بودے آمرزگار

اردو کا ایک شاعر کہتا ہے،

عوض نہ لے مرے جرم و گناہ بیحد کا ۔۔۔ الٰہی تجھکو غفور الرحیم کہتے ہیں

کہیں کہیں نہ عدو دیکھکر مجھے محتاج ۔۔۔ یہ اون کے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

لیکن خیام کا طرزِ ادا اور استدلال سب سے اچھوتا ہے، وہ شاعرانہ استدلال سے سزا پانے کی حالت میں مجرم اور آقا کی مساوات ثابت کرتا ہے، اور پھر اسکو جملہ خبریہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ استفہام کے طریقہ سے ادا کرتا ہے، جو نہایت موثر اور لاجواب کر دینے والا ہوتا ہے،

شوخی و ظرافت | خیام باوجود حکیم ہونے کے نہایت شوخ اور ظریف الطبع تھا، اسلئے اکثر مضامین کو ظرافت اور شوخی کے پیرایہ میں ادا کرتا ہے مثلاً

اے چرخ زگردشِ تو خرسند نیم ۔۔۔ آزادکنم کہ لائقِ بند نیم

گر میل تو باے خرد و نا اہل است ۔۔۔ من نیز چناں اہل و خردمند نیم

ایشیا کا عام خیال ہے کہ آسمان اربابِ خرد کو آرام اور چین نہیں دیتا، خیام آسمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں تیری چالوں سے بہت تنگ آگیا ہوں، اگر تو احمقوں اور نااہلوں ہی سے محبت رکھتا ہے تو میں بھی کچھ بہت اہل اور عاقل نہیں ہوں

در مسجد اگر بہر نیاز آمدہ ام | با شد کہ نہ از بہر نماز آمدہ ام
یک روز اینجا سجادہ دزدیدم | آں کہنہ شدہ است باز آمدہ ام

گویند کہ مے مخور کہ شعبان نہ رواست | نہ نیز رجب کہ آں مہ خاص خداست
شعبان و رجب مہ خدایند و رسولؐ | ما مے رمضاں خوریم کاں خاصۂ ماست

ایران میں اکثر مہینوں کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً شعبان کو رسول کا مہینہ اور رجب کو خدا کا مہینہ کہتے ہیں، خیام کہتا ہے کہ لوگ ان مہینوں میں شراب پینے سے منع کرتے ہیں کہ یہ خدا اور رسولؐ کے مہینے ہیں اور واقعی ان کی یہ ہدایت بجا ہے اس بنا پر میں رمضان میں شراب پیتا ہوں، کہ یہ خاص ہم لوگوں کا مہینہ ہے،

گویند کہ آں کساں کہ با پرہیز اند | زاں ساں کہ بمیرند بداں ساں خیزند
ما با مے و معشوق از انیم مقیم | تا بو کہ بحشر آں چناں انگیزند

مشہور ہے کہ انسان جس حالت میں مرتا ہے، اسی حالت میں قیامت میں اُٹھیگا خیام کہتا ہے، اسی لئے تو میں رات دن شراب اور معشوق کے ساتھ بسر کرتا ہوں کہ قیامت میں بھی اسی حالت میں اٹھوں،

گویند کہ ماہ روزہ نزدیک رسید | من بعد بگرد بادہ نتواں گردید
در آخر شعبان بخورم چنداں مے | کاندر رمضان مست بخسپم تا عید

ایران میں جتنے شراب خوار ہیں رمضان میں شراب خواری چھوڑ دیتے ہیں خیام کہتا ہے کہ میں شعبان کے آخر میں اتنی پیکر سوؤنگا کہ عید کے بعد نشہ اترے، قاآنی نے

اسی مضمون کو نیچرل بنا دیا ہے،

مے خوردن ایں ماہ روا نیست ولیکن ❊ مستانہ تواں خورد بہ شب یکدو سہ ساغ[ر]

یا خور دبداں گونہ بباید کہ ز مستی ❊ تا شام دگر بر نتواں خاست ز بستر

لیکن ایک اور شاعر نے سب سے لطیف پیرایہ اختیار کیا ہو، ایک غزل میں جسکی ردیف "نمی دانستم" ہے، کہتا ہے،

قرب یک ماہ بہ میخانہ اقامت کردم ❊ اتفاقاً رمضاں بود نمی دانستم

ہر گہ کہ طلوع صبح ازرق باشد ❊ باید کہ بکف جام مروق باشد

گویند بہ افواہ کہ مے تلخ بود ❊ شاید کہ بہر حال کہ مے حق باشد

عربی کا فقرہ ہے "الحق مُرّ" یعنی حق بات تلخ ہوتی ہے، خیام کہتا ہے کہ شراب کا مزا تلخ ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب حق ہے، مرزا غالب نے اسی سے ایک اور مضمون پیدا کیا ہے

نگفتہ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر ❊ برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یعنی تم یہی ہدایت کرتے ہو نہ کہ انسان کو تلخی گوارا کرنی چاہیے اور نصیحت سننی چاہیئے تو ہماری شراب تمھاری نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، ہمکو دوسری تلخی کی کیا ضرورت ہے،

دستے چو منے کہ جام و ساغر گیرد ❊ حیف است کہ آں دفتر و منبر گیرد

تو زاہد خشکی و منم فاسق تر ❊ آتش نشنیدہ کہ در تر گیرد

من در رمضاں روزہ اگر میخوردم ❊ تا ظن نبری کہ بے خبر میخوردم

از محنتِ روزہ روزِ من چوں شب شد	پنداشتہ بودم کہ سحر میخوردم

طبعم بہ نماز و روزہ چوں مائل شد	گفتم کہ مرادِ کلیم حاصل شد

افسوس کہ ایں وضو بیادے بشکست	واں روزہ بہ نیم جرعہ باطل شد

اس میں ظرافت کیساتھ اس بات کا بھی اشارہ ہے، کہ جو لوگ ظاہری نماز روزہ ادا کرتے ہیں، انکی عبادت کی ہستی بس اسی قدر ہے،

گویند کہ فردوسِ بریں خواہد بود	آں جائے ناب و حور خواہد بود

گر ما مے و معشوق گزیدیم چہ باک	چوں عاقبت کار چنیں خواہد بود

جو لوگ اس باتکے قائل ہیں کہ بہشت میں بھی جسمانی آرام و عیش ہوگا اور شراب اور حوریں ملیں گی، ظریفانہ پیرایہ میں انکار کرتا ہے کہ اگر وہاں بھی یہی سب ہوگا تو اگر ہم نے دنیا ہی میں ان چیزوں کو پیشگی اختیار کر لیا تو کیا بُرا کیا،

زاہد گوید بہشت با حور خوش است	من میگویم شراب انگور خوش است

ایں نقد بگیر و دست زاں نسیہ بدار	آواز دہل شنیدن از دور خوش است

مارا گویند دوزخی باشد مست	قولی است خلافِ دل در آں نتواں بست

گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود	فردا بینی بہشت را چوں کفِ دست

یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق اور مست بہشت میں نہ جانے پائیں گے تو دیکھ لینا بہشت چٹیل میدان کی طرح خالی پڑی ہوگی یعنی عشق اور مستی لازمۂ انسانی ہے، اس سے کون شخص خالی ہوسکتا ہے،

گویند بہشت و حور و کوثر باشد | جوے مے و شہد و شیر و شکر باشد
پر کن قدحِ بادہ و بر دستم نہ | نقدے ز ہزار نسیہ بہتر باشد

از ہر چہ خورد مرا شراب اولیٰ تر | با سبز خطاں بادۂ ناب اولیٰ تر
عالم ہمہ سر بسر چو باطل ست خراب | در جاے خراب ہم خراب اولیٰ تر

ما ئیم خریدار مے کہنہ و نو | وانگاہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت | مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

آں بادۂ خوشگوار بر دستم نہ | آں ساغر چوں نگار بر دستم نہ
آں مے کہ چو زنجیر بہ پیچد بر خود | دیوانہ شدم بیار بر دستم نہ

نہ لائق مسجدم نہ درخورد کنشت | ایزد داند گل مرا از چہ سرشت
نہ دین و دنیا و نہ امید بہشت | چوں کافر درویشم و چوں قحبہ زشت

دین دنیا دونوں سے محروم ہونے کی اس سے اچھی کوئی تمثیل نہیں مل سکتی، کافر فقیر اور بدصورت قحبہ یہ دونوں دین و دنیا کسی سے بہرہ یاب نہیں،

دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی دنیا کی بے ثباتی اور عبرت زا ہونا بزرگ پایہ شعرا کا سب سے بڑا موضوع ہے سعدی، حافظ ابن یمین، ناصر خسرو، سحابی بخشی کی تمام کائنات یہی ہے، اس مضمون کی ابتدا اور حقیقت خیام نے کی اور اس درجہ تک اسکو پہنچا دیا کہ سعدی اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر گویا اسی کی سکھائی ہوئی چالیں چلتے ہیں، نصیحت سے قطع نظر خیام کے زور شاعری کا بھی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، اس نے

سو سو دفعہ اس مضمون کو باندھا ہے، لیکن قوت تخئیل سے ہر دفعہ ایک نیا پیرایہ پیدا کردیتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور خنجر ہے جو دل پر چرکے لگا رہا ہے،

خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانے ست — زلف صنمی و عارض جانانے ست

ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے ست — انگشت وزیرے و سر سلطانی است

شیخ سعدی نے اس مضمون کے لئے فرضی حکایتیں لکھی ہیں، مثلاً کہتے ہیں،

شنیدم کہ یک بار در دجلہ — سخن گفت با عابدے کلہ

کہ من فر فرماندہی داشتم — بہ سر بر کلاہ مہی داشتم الخ

ایک اور شعر میں نہایت دردانگیز طریقہ سے اسکو ادا کیا ہے،

زدم تیشہ یک روز بر تل خاک — بگوش آمدم نالۂ دردناک

کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر — کہ چشم و بناگوش و روی است و سر

یعنی میں نے ایک دن مٹی کے ایک تودے پر پھاوڑا مارا، میرے کان میں یہ دردناک آواز آئی کہ میاں ذرا آہستہ، یہاں آنکھیں ہیں، کان ہیں، چہرہ ہے، سر ہے، دیکھو چوٹ نہ لگ جائے، لیکن سعدی کی یہ تمام نقش آرائیاں، خیام ہی کے مرقع کا عکس ہیں، ملاحظہ ہو،

دی کوزہ گرے بدیدم اندر بازار — بر تازہ گلے لگد ہمی زد بسیار

وان گل بزبان حال با او می گفت — من ہمچو تو بودہ ام مرا نیکو دار

سعدی کے شعر میں اگرچہ آہستہ تر! اور اعضا کے معدود ناموں نے ایک خاص اثر پیدا کیا ہے، لیکن طلب رحم کی علت خیام کے ہاں زیادہ قوی ہے یعنی یہ کہ میں بھی تمہاری

ہی طرح تھا، اس لئے مجھ سے یہ سلوک نہ کرو اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے،

پیش از من و تو لیل و نہارے بودہ است | گردندہ فلک نیز بکارے بودہ است
زنہار قدم بخاک آہستہ بنہ | کیں مردمک چشم نگارے بودہ است

اسی مضمون کے اور پیرایے دیکھو

ایں کہنہ رباط را کہ عالم نام است | آرامگہ ابلق صبح و شام است
بزمے است کہ واماندۂ صد جمشید است | قصرے است کہ تکیہ گاہ صد بہرام است

خوش باش کہ غصہ بیکراں خواہد بود | بر چرخ قران اختراں خواہد بود
خشتے کہ ز قالب تو خواہند زدن | ایوان و سرائے دیگراں خواہد بود

اے کوزہ گر آب نوش اگر ہشیاری | تا چند کنی بر گل آدم خواری
انگشت فریدون و کف کیخسرو | بر چرخ نہادہ چہ می پنداری

یعنی اے کمہار کچھ جانتا ہے تو نے چاک پر کیا چڑھا رکھا ہے؟ فریدوں کی انگلی اور کیخسرو کی ہتھیلی،

جامے است کہ عقل آفریں میزندش | صد بوسہ مہر بر زمیں میزندش
ویں کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف | می سازد و باز بر زمیں میزندش

بر سنگ زدم دوش سبوی کاشی[۱] | سر خوش بودم کہ کردم ایں اوباشی
با من بزبانِ حال می گفت سبو | من چوں تو بدم تو نیز چوں من باشی

[۱] یعنی شہر کاشی کا بنا ہوا گھڑا،

ایں کوزہ چو من عاشق زاری بودہ است | واندر طلب شُے نگارے بودہ است
ایں دست کہ بر گردنِ او می بینی | دستے است کہ در گردنِ یارے بودہ است

خمریات | جس طرح عربی زبان میں ابو نواس شراب کا جاندادہ ہے، فارسی میں خیام دورِ جام کا ستم زدہ ہے، وہ جس شفقت جس شوق، جس بیخودی، جس بے اختیاری جوش سے شراب کا نام لیتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ وہ درحقیقت شراب پیتا تھا، اور یہی ظاہری شراب پیتا تھا، افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا صوفی نہ تھا ورنہ حافظ کی طرح یہی شراب شرابِ معرفت بنجاتی،

خیام کا آدھا کلام شراب ہی کے ذکر میں ہے، اکثر مضامین اور خیالات جو اُس نے شراب کے متعلق ظاہر کئے ہیں، خواجہ حافظ نے اُن ہی کو لیکر زیادہ شوخ کردیا ہے، تاہم کہیں کہیں جو بدمستی اور بیخودی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، خواجہ حافظ اب بھی اس حد تک نہیں پہنچے،

من بے مے ناب زیستن نتوانم | بے جام کشیدہ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید | یک جام دگر بگیر و من نتوانم

ما ہیم خریدارِ مے کہنہ و نو | وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت | مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

اس سرمستی اور بے اعتنائی کو دیکھو ایک شخص مذہبی خیالات میں ڈوبا عواقبات کے حالات کا متجسس ہے، خیام کے پاس آتا ہے، اور نہایت تردد اور تفحص کے لہجہ میں

پوچھتا ہے کہ مرنے کے بعد کہاں جانا ہوگا؟ وہ کس بے تکلفی سے جواب دیتا ہے کہ میاں شراب لاکر میرے سامنے رکھدو اور جہاں جی چاہے جاؤ (مجھکو کیا غرض)

بااین ہمہ زیادہ تحقیق وتلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام اگر شراب پیتا بھی تھا، تو رندانہ نہیں بلکہ حکیمانہ پیتا تھا، اگرچہ شرعًا یہ بھی ممنوع اور حرام ہے، خیام کہتا ہے کہ شراب پینے میں ان باتوں کا لحاظ شرط ہے، کس کو پینی چاہیئے؟ کتنی پینی چاہیئے؟ کن لوگوں کی صحبت میں پینی چاہیئے؟ ان شرطوں کا لحاظ رکھا جائے، تو ثابت ہوگا کہ عقلمند کے سوا اور کوئی شراب پی نہیں سکتا، اس لیئے کہ عقلمند ہی ان شرائط کا لحاظ رکھ سکتا ہے،

مے گرچہ حرام است ولے تاکہ خورد   آنگاہ چہ مقدار؟ و دگر باکہ خورد؟
ہر گاہ کہ ایں چہار شرط آید جمع   پس مے نخورد مردم دانا کہ خورد

پھر صاف صاف بتاتا ہے کہ کس طرح پینی چاہیئے،

کم کم خور وگہ گہ خور وتنہا مے خور

چوں ہشیارم، طرب زمن پنہان است   در مست شوم، در خردم نقصان است
حالے است میانِ مستی وہشیاری   من بندہ آنکہ زندگانی آں است

یعنی شراب کی نہ وہ حالت پسندیدہ ہے، جب انسان مست ہو جائے نہ یہ کہ مطلق اثر نہ پڑے مستی اور ہشیاری کے بیچ میں ایک حالت ہے، اور میں اسی کا غلام ہوں

چوں بادہ خوری زعقل بیگانہ مشو   مدہوش مباش، وجہل را خانہ مشو
خواہی کہ مے لعل حلالت باشد   آزار کسے مجوے و دیوانہ مشو

گر بادہ نہ خورم نشان خامی است ‏ ‏ ‏ ‏ ور نیز مدام میخورم بد نامی است

مے شاہ و حکیم و رند باید کہ خورد ‏ ‏ ‏ ‏ ور زیں سہ نہ ، مخور کہ دشمن کامی است

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ شراب پینی گو اعتدال ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو، ہر حال میں حرام ہے، اور جو شخص جواز کا فتویٰ دیتا ہے، سخت اخلاقی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے؛ لیکن اگر تمھارے سامنے دو شخص آئیں، ایک نیک طینت، بے ریا، سچا، دیانت دار ہے لیکن شراب پیتا ہے، دوسرا شراب نہیں پیتا، نماز و روزہ بھی ادا کرتا ہے، لیکن رات دن تکفیر، بدگوئی اور غیبت میں مصروف رہتا ہے، وقف کے مال پر شرعی حیلوں سے تصرف کرتا ہے، احکامِ شرعیہ کو اپنی خواہش کے موافق ڈھالتا رہتا ہے تو تم ان دونوں میں سے کس کو پسند کرو گے؟ غور کرو جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ شراب سے زیادہ گناہ کس بیباکی سے کرتے ہیں، خیام ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے،

تو فخر ہمی کنی کہ مے می نہ خوری ‏ ‏ ‏ ‏ صد کار کنی کہ مے غلام است اورا

خواجہ حافظ نے اسی نکتہ کو نہایت بلیغ پیرایہ میں ادا کیا ہے،

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد ‏ ‏ ‏ ‏ کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است

فلسفہ | فلسفہ کیا چیز ہے؟ حقائقِ اشیاء کا ادراک، ہمارے گرد و پیش جو کچھ نظر آتا ہے اُن پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں، تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ چیزیں ہیں؟ کیونکر وجود میں آئیں، کس چیز سے حاصل ہوئیں؟ مفرد ہیں یا مرکب، ان کے ذاتیات کیا ہیں؟ خواص کیا ہیں؟ لوازم کیا ہیں؟ پھر ہم چند چیزوں کو ساتھ ساتھ یا آگے

پیچھے وجود میں آتا دیکھتے ہیں اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں کوئی باہم خاص تعلق ہے؟
یا اتفاقیہ ان کا ساتھ ہو گیا ہے؟ تعلق ہے تو کس قسم کا ہے؟ کیا نوعیت ہے؟ کیوں ہے؟
غرض یہ اور اس قسم کے جتنے سوالات ہیں فلسفہ کا مایہ خمیر ہیں، اور ان کا جواب دینا فلسفہ
کا فرض ہے لیکن ان سب سوالوں سے مقدم یہ سوال ہے کہ کیا ہم اشیاء کی حقیقت
کو جان سکتے ہیں، ؟ عموماً تمام حکما اس کا جواب اثبات کی صورت میں دیتے ہیں لیکن
ہر زمانہ میں ایسے حکما بھی ہوتے آئے ہیں، اور اب بھی ہیں، جن کی رائے ہے کہ کسی
چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی، ہربرٹ اسپنسر نے تمام اشیاء کی دو قسمیں کی ہیں،
وہ چیزیں جو فوق الادراک ہیں، اور انسان کے دائرہ علم میں نہیں آسکتیں،
وہ چیزیں جو تحت ادراک ہیں پہلی قسم پر اُس نے ایک خاص رسالہ لکھا ہے، اور بتا دیا ہے
کہ ان کے متعلق کسی قسم کی تحقیقات کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، شاپن ہور (جرمن کا
فلسفی)، سرے سے انکار کرتا ہے، یعنی کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی، خیام کا
بھی یہی مذہب ہے، غور کرو، اور خوب غور کرو جن چیزوں کی نسبت ہم کو یقین ہے کہ ہم
جانتے ہیں، ان کو بھی ہم کیا جانتے ہیں، سب سے زیادہ محسوس، بدیہی، اور نمایاں مادہ یا
جسم ہے لیکن غور سے دیکھو، مادہ کو ہم کس حد تک جانتے ہیں، ہم مادہ کے چند خواص
جانتے ہیں ہم جانتے ہیں، کہ مادہ تحلیل ہوتے ہوتے، ایسے چھوٹے چھوٹے اجزا تک
منتہی ہوتا ہے، جو پھر تحلیل نہیں ہو سکتے، اور ان کو اجزائے دیمقراطیسی کہتے ہیں ان
اجزاء میں حرکت، وزن، کششِ اتصالی کششِ ثقل اور چند خواص پائے جاتے

ہیں لیکن یہ اجزا کے خواص اور اعراض ہیں، انکی اصلی حقیقت کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آئے
کہاں سے آئے؟ یہ چیزیں بالکل غیر معلوم ہیں، اس سے بھی زیادہ صاف مثال میں
سمجھو، ہم نے ایک سیب ہاتھ میں لیا ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اسکو جانتے ہیں، اور بداہتہً
جانتے ہیں، لیکن غور کرو، ہم کیا جانتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خاص مقدار رکھتا
ہے، اس میں خوشبو ہے، رنگ ہے، مزہ ہے، لیکن ساخت، خوشبو، رنگ، مزہ یہ سب
تو اوصاف ہیں جن کو قدیم فلسفہ کی زبان میں عرض کہتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز جوہر
قائم بالذات نہیں، حالانکہ سیب قائم بالذات چیز ہے، اسلئے ہمکو سیب کی اصلی
حقیقت کچھ بھی نہیں معلوم ہوئی،

علت و معلول کا سلسلہ جو ہم کسی چیز میں قائم کرتے ہیں، جس قدر تحقیقات بڑھتی
جاتی ہے، یہ سلسلہ ناقابلِ اعتبار ثابت ہوتا جاتا ہے، اور پھر اصلی علۃ کا پتہ نہیں لگتا، اوپر
سے جو چیز گرتی ہے، زمین پر آتی ہے، یونانی حکمار کی حقیقت کے مطابق اسکی وجہ
یہ تھی کہ ان چیزوں کا مرکز زمین ہے، اور ہر چیز مرکز کی طرف کھنچتی ہے، لیکن نیوٹن
نے اسکی غلطی ثابت کی، اور بتایا کہ تمام اجسام میں جذب کی خاصیت ہے، اور چونکہ
زمین بڑا جسم ہے، اسلئے وہ اپنے سے چھوٹے تمام اجسام کو اپنی طرف جذب کرتا ہے،
لیکن اس سے اصل مسئلہ کیا حل ہوا، اس قدر بے شبہہ معلوم ہوا کہ اوپر سے گرنے
کی علت تجاذب اجسام ہے، لیکن تجاذبِ اجسام کی کیا علت ہے، یعنی اجسام میں
جذب کی خاصیت کیوں ہے؟ یہ مسئلہ اب تک اسی طرح لاینحل ہے، غرض اسی طرح دنیا کی

باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اور پر چل کر، پھر وہی لاعلمی پیش آتی ہے، ایک راز کھلتا ہے تو دوسرا راز پیدا ہوتا ہے، ایک گرہ کھلتی ہی، تو دوسری گرہیں پڑ جاتی ہیں،

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود　　　گشت راز دگراں راز کہ افشا میکرد

اسی بنا پر دقیق النظر حکمار کا یہی مذہب ہے، کہ ہمکو کچھ معلوم نہیں، سقراط نے تمام عمر کی تحقیقات کے بعد یہی کہا "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" خیام کا بھی یہی مذہب ہی،

خیام نے اس رائے کو نہایت صراحت اور نہایت کثرت سے بیان کیا ہی،

کس مشکل اسرار فلک نکشاد　　　کس یک قدم از نہاد بیروں ننہاد
چوں بنگرم از مبتدی تا استاد　　　عجز است بدست ہر کہ از ما در زاد

آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند　　　در کشفِ دقیقہ شمع اصحاب شدند
رہ زیں شب تاریک نبردند بروں　　　گفتند فسانہ و در خواب شدند

آنہا کہ جہان زیر قدم فرسودند　　　واندر طلبش ہر دو جہاں پیمودند
آگاہ نمی شوم کہ ایشاں ہرگز　　　زیں حال چناں کہ ہست آگہ بودند

جمعے متفکرند در مذہب و دیں　　　جمعے متحیرند در شک و یقین
ناگاہ منادے بر آید ز کمیں　　　کاے بیخبراں راہ نہ آنست نہ ایں

افسوس کہ سرمایہ ز کف بیروں شد　　　در دست اصل بسے جگرہا خوں شد
کس نامد ازاں جہاں کہ تا پرسم ازو　　　کا حوال مسافران عالم چوں شد

ہر چند کہ رنگ و بوئی زیباست مرا　　　چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا

معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک — نقاش من از بہر چہ آراست مرا

کس را پس پردۂ قضا راہ نشد — وز سرِّ خدا ہیچ کس آگاہ نشد
ہر کس ز قیاس خویش چیزے گفتند — معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نشد

دل سرِّ حیات را کماہی دانست — در موت ہم اسرار الٰہی دانست
امروز کہ با خودی ندانستی ہیچ — فردا کہ ز خود روی چہ خواہی دانست

تمکو خیال ہوگا کہ اگر لاعلمی ہی خیام کا فلسفہ ہے، تو جتنے جاہل ہیں، سب فلسفی ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، سقراط سے لوگوں نے کہا کہ جب تم بھی کچھ نہیں جانتے اور ہم بھی نہیں جانتے تو ہم میں تم میں کیا فرق ہے، اس نے کہا صرف یہ کہ میں یہ جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم نہیں جانتے،

علم عموماً دو قسم کا ہوتا ہے، عالمانہ اور جاہلانہ، زمین، آفتاب، ماہتاب ان سب چیزوں کو ایک گنوار بھی جانتا ہے، لیکن جاہلانہ جانتا ہے ایک کسان بھی جانتا ہے، کہ ایک زمین میں ایک وقت دو اناج پیدا نہیں ہو سکتے، اسی کو علم نباتات کا ایک عالم بھی جانتا ہے، لیکن دونوں کے جاننے میں کس قدر فرق ہے، لاعلمی کا بھی یہی حال ہے، ایک فلسفی بھی جانتا ہے، کہ وہ خدا کی حقیقت کو نہیں جان سکتا، ایک جاہل بھی اس کا اقرار کرتا ہے، لیکن دونوں میں کس قدر فرق ہے،

خیام کو اس لاعلمی پر ناز ہے، اور کہتا ہے کہ ہر شخص اس لاعلمی کے رتبہ تک نہیں پہنچ سکتا،

تو بے خبری بے خبری کار تو نیست | ہر بے خبرے را نہ رسد بے خبری

اسی کو ایک اور شاعر نے شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے،

تا بجائے رسیدہ دانش من | کہ بدانم ہمے کہ نادانم،

یعنی میرا علم اب اس درجہ پہنچ گیا ہی کہ یہ جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا،

ایک اور موقع پر خیام کس ادعا سے کہتا ہے،

رندے دیدم نشستہ بر رنگ زمیں | نہ کفر نہ اسلام نہ دنیا و نہ دیں

نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں | اندر دو جہاں کرا بود زہرۂ ایں

لاعلمی کا فلسفہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دیکھو اس کا اثر کیا ہی،

ہر قسم کی تحقیقات، انکشافات، جدید اطلاعات کا سرچشمہ، یہی لاعلمی کا فلسفہ ہی، اگر ہمکو یقین ہو جائے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں، یا جس چیز کو جانتے ہیں، اسکی تہ تک پہنچ گئے ہیں، تو علمی تجسس کے لئے کیا رہجاتا ہے، ؟ آیندہ ہمکو کیوں تلاش ہوگی، ہم کیوں جد و جہد میں مصروف ہونگے ؟ لاعلمی کا فلسفہ ہمارا شمع راہ ہے، وہ ہمکو ہر قدم پر آگے بڑھاتا ہے، ہم جس قدر جانتے جاتے ہیں، اسکو نہ جاننا کہتے ہیں، اور آگے بڑھتے ہیں، خیام گو یہ فلسفہ سکھاتا ہے کہ تمکو کچھ معلوم نہیں، لیکن معلوم کرنے کی خواہش کی ترغیب دلاتا ہے،

گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت | زمن خبرت کہ بے نوا خواہی رفت،

بنگر چہ کسی ؟ و از کجا آمدۂ ؟ | می داں کہ چہ میکنی ؟ بکجا خواہی رفت

تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کہاں جاؤگے؟ خیام ان سوالوں کی تحقیقات کرنے کی تلقین کرتا ہے، ان سے بڑھکر فلسفہ کے اور کیا مسائل ہو سکتے ہیں،

ایک اور نکتہ نہایت غور کے قابل ہے، اسلامی بے شمار فرقوں کو دیکھو انکے باہمی مسائل مختلفہ کیا ہیں؟ خدا فاعل بالایجاد ہے، یا بالارادہ؟ خدا کے صفات عین ذات ہیں یا خارج؟ قدیم ہیں یا حادث؟ خدا کا کلام نفسی ہے یا لفظی؟ یہ مسائل کس قدر فوق الادراک ہیں، جب خدا کی حقیقت ہی معلوم نہیں تو یہ کیا معلوم کہ اس کے اوصاف کیا ہیں، بایں ہمہ ہر فرقہ کو قطعی یقین ہے کہ اسکو جو کچھ معلوم ہے قطعی ہے، اور اس قدر قطعی ہے، کہ جو شخص اس کے خلاف کہتا ہو وہ گمراہ ہے، جاہل ہے، کور باطن ہے، مرتد ہے، کافر ہے، ملعون ہے، معتزلہ، قدریہ، اشعریہ، حنابلہ، شیعہ، سنی، سب ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ کہتے ہیں، یہانتک کہ جنگ وجدل تک نوبت پہنچتی ہے اور بغداد کے گلی کوچے مسلمانوں کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں،

اگر ان بزرگوں کا خیام کے فلسفہ پر عمل ہوتا یعنی یہ کہ یہ مسائل فوق الادراک ہیں، ہم جس قدر جانتے ہیں، نہ جاننے کے برابر ہے، مذہبی حیثیت سے ہمارا اسی قدر فرض ہے کہ اجمالی ایمان لائیں یعنی یہ کہ خدا ہے، جانتا ہے، دیکھتا ہے سنتا ہے بولتا ہے، باقی یہ تدقیقات کہ ان اوصاف کی حقیقت کیا ہے، اسکی ہمکو شارع نے تکلیف نہیں دی، تو آج بارہ سو برس سے مسلمانوں کے فرقوں میں جو نزاعیں

جنگ و جدل، معرکہ آرائیاں، اور خونریزیاں ہوتی رہیں کیوں ہوتیں،

ہاتف شیرازی نے کیا خوب کہا ہے،

بیا کایں داوریہا را بہ پیش داور اندازیم | کیے از کفر می لافد دگر طامات می بافد

جبر یعنی انسان کا مجبور ہونا، جبر ایک نہایت دقیق مسئلہ ہے اور گو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سے کوئی مفر نہیں، قدریہ کا تمامتر زور استدلال ارادہ پر ہے یعنی یہ کہ انسان کا ارادہ اُس کے اختیار میں ہے، اس لئے انسان مختار ہے لیکن زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ارادہ بھی اسکی اختیاری چیز نہیں ارادہ کے جب تمام اسباب جمع ہو جائیں گے، ارادہ خواہ مخواہ پیدا ہوگا، اسکا روکنا یا نہ پیدا ہونے دینا انسان کے اختیار میں نہیں،

عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ جبر کے نام سے بھاگتے ہیں، اور جبریہ کو کافر بتاتے ہیں خود جبریہ ہیں، لیکن منہ سے اقرار نہیں کرتے، اشاعرہ جبر کے قائل نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ "انسان کو اپنے افعال پر قدرت ہے" لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں، کہ "یہ قدرت مطلقاً کچھ اثر نہیں رکھتی"، تو پھر ایسی قدرت سے کیا فائدہ؟ اسی بنا پر مسلم الثبوت میں لکھا ہے کہ "اشاعرہ کا کسب، اور جبریہ کا جبر دونوں توام بھائی ہیں"، بہرحال ہم اس بحث کا فیصلہ نہیں کرتے جبر صحیح ہو یا غلط خیام جبر کا قائل اور معتقد تھا،

ایزد چو نہ خواست آنچہ من خواستہ ام | کے گردد راست آنچہ من خواستہ ام

گر ہست صواب آنچہ او خواستہ است | پس جملہ خطا است آنچہ من خواستہ ام

نقشیست کہ بر وجود ما ریختہ / صد بوالعجبی ز ما برانگیختہ
من زاں بہ ازیں نمی توانم بودن / کز بوتہ چنیں مرا فرو ریختہ

از آب و گلم سرشتہ من چہ کنم / ویں پشم قصب تو رشتہ من چہ کنم
ہر نیک و بدی کہ از من آید بوجود / تو بر سر من نوشتہ من چہ کنم

سازندۂ کار مردہ و زندہ توئی / دارندۂ ایں چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم صاحب ایں بندہ توئی / کس را چہ گنہ چو آفرینندہ توئی

انہی خیالات کو خواجہ حافظ نے عجیب عجیب پیرایوں میں ادا کیا ہے،

برو اے زاہد و دعوت نکنم سوے بہشت / کہ خدا در ازل از بہر بہشتم نہ سرشت

فلسفۂ زندگی

خیام کا فلسفۂ زندگی بظاہر اپیکورس کی آواز بازگشت ہے یعنی یہ کہ گزشتہ اور آیندہ سے کچھ بحث نہیں، جو کچھ ہے حال ہے اس میں کھاؤ پیو خوش رہو، دگر ہیچ

مصرعہ "چنیں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند"

در وقت بہار اگر بتے حور سرشت / پر مے قدحے دہد مرا بر لب کشت
گرچہ بر ہر کس ایں سخن باشد زشت / سگ بہ ز من ار دگر برم نام بہشت

یک شیشہ شراب و لب یار و لب کشت / ایں جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
قومے بہ بہشت و دوزخ اندر گروند / کہ رفت بدوزخ و کہ آمد ز بہشت

روزے کہ گذشتہ است ازو یاد مکن / فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ بنیاد مکن / حالے خوش باش و عمر بر باد مکن

از درس علوم جملہ بگریزی بہ — واندر سر زلف دلبر آویزی بہ
زاں پیش کہ روزگار خونت ریزد — تو خون پیالہ در قدح ریزی بہ

زاں پیش کہ بر سرت شبیخوں آرند — فرمائی کہ تا بادۂ گلگوں آرند
تو زر نہ اے غافلِ ناداں کہ ترا — در بوتہ نہند و باز بیروں آرند

ایں عقل کہ در راہ سعادت پوید — روزے صد بار خود ترا می گوید
دریاب تو ایں یکدمہ فرصت کہ نۂ — آں ترہ کہ بدروی و آخر روید

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت — در پردۂ اسرار فنا خواہی رفت
مے نوش ندانی از کجا آمدۂ — خوش باش ندانی کہ کجا خواہی رفت

مائیم خریدار مے کہنہ و نو — وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت — مے پیشِ من آر و ہر کجا خواہی رو

یہ فلسفہ کہ انسان نیکی بدی کا کچھ خیال نہ رکھے، جو جی میں آئے کرے، مزے اڑائے بظاہر نہایت خطرناک ہے، لیکن خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں ہو سکتی اُس نے بہت سی رباعیوں میں معاد اور جزا و سزا کا اقرار کیا ہے، اور نکوکاری اور بُرائیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے،

ایشیائی سلطنتوں میں، جاہ و مال کے حاصل کرنے میں جن ذلیل، کمینہ، ناجائز، اور ناپاک ذریعوں سے کام لینا پڑتا ہے، اس کا اندازہ ہمارے ملک میں نہیں ہو سکتا، کم سے کم اسکے لئے کسی ہندوستانی ریاست کا سفر اختیار کرنا چاہئے، خیام کے سامنے زندگی

کا جو نمونہ موجود تھا، وہ یہی تھا کہ ارباب دنیا رات دن جوڑ توڑ، سازش، حیلہ انگیزی، نفاق خوشامد، تگ و دو اور ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، پھر ان سب مصیبتوں سے جو چیز حاصل کرتے تھے، وہ کس قدر ناقابلِ اعتبار اور سریع الزوال ہوتی تھی، آج ایک شخص وزیر اعظم ہے، کل دربدر مارا پھرتا ہے کل تک ایک شخص تاج و تخت کا مالک تھا، آج مسجد کے دروازہ پر گداگری کر رہا ہے، برامکہ نے ابھی تمام عالم کو چھا لیا ہے ابھی خاندان کا خاندان برباد ہو کر نام و نشان تک مٹ گیا، ابو الفضل کل تک ندیمِ خاص تھا، آج دربار میں اس کا سر کٹ کر آرہا ہے،

ان حالات کو دیکھ کر بے شبہہ ایک فلسفی گھبرا اٹھے گا اور کہے گا کہ دنیا ناقابلِ اعتبار ہے، جاہ و منصب کوئی چیز نہیں، خود زندگی کس قدر ہیچ ہے، فریدوں کی خاک سے کمہار کے برتن بنتے ہیں، جمشید کا کالبد، خشت سازی کے کام میں آتا ہے، اسلئے تگ و دو اور تردد و فکر بیکار ہے، تھوڑی سی زندگی ہے، اسکو قناعت، خاموشی، سکون اور اطمینان کے ساتھ گذار دو، کھاؤ، پیو، خوش رہو اور خوشی خوشی دنیا سے چلے جاؤ،

خیام اس بات سے واقف ہے کہ اس قسم کے قانع شخص کو عام لوگ ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ اس پر تعجب کرتا ہے:

این جمع اکابر کہ مناصب دارند — از غصہ و غم زجانِ خود بیزارند
وانکس کہ اسیرِ حرص چوں ایشاں نیست — این طرفہ کہ آدمیش می نہ شمارند

نہایت خوبی سے وہ قناعت اور آزادی کی تعلیم کرتا ہے،

چوں رزق تو آنچہ عدل قسمت فرمود — یک ذرّہ نہ کم شود نہ خواہد افزود

آسودہ زہر چہ نیست می باید شد — وآزادہ زہر چہ ہست می باید بود

خواہی کہ ترا تربیت اسرار رسد — مپسند کہ کس را ز تو آزار رسد

از مرگ میندیش و غم رزق مخور — کیں ہر دو بوقتِ خویش ناچار رسد

خیام جس زندگی کو قابلِ رشک سمجھتا ہے، وہ یہ ہے،

در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد — وز بہرِ نشست آستانے دارد

نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے — گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ابن یمین نے اس زندگی کی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے،

دو تائے نان اگر از گندمست یا از جو — دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو

بہ چار گوشۂ دیوار خود، بخاطر جمع — کہ کس نگوید از ینجا بخیز و آں جا رو

ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمیں — ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

اخلاقی تعلیم | خیام کا فلسفۂ اخلاق نہایت مختصر ہے، لیکن جس قدر ہے، اس مختصر سی دنیا کے لئے کافی ہے،

غیبت مکن و دل کساں را مآزار — در عہدۂ آں جہاں منم، بادہ بیار

بدخواہ کساں ہیچ بہ مقصد نرسد — یک بد نہ کند تا بہ خودش صد نرسد

من نیک تو خواہم و تو خواہی بد من — تو نیک نہ بینی و بہ من بد نرسد

گر شادی ازاں خویشتن میدانی — کاسودہ دمے را بہ غمی بنشانی

درماتم عقل خویش منشیں ہمہ عمر	پندار مصیبت کہ عجب نادانی

اے آنکہ خلاصۂ چہار ارکانی	بشنو سخنے ز عالمِ روحانی
دیوی و ددی و ملک و انسانی	باتست، ہر انچہ می نمائی آنی

یعنی تم شیطان، درندہ، فرشتہ، انسان، سب کچھ ہو سکتے ہو، اب جو چاہو ہو جاؤ، تم کہو گے کہ یہ ایسی کیا اچھوتی تعلیم ہے، سب اہلِ مذہب اسی کی تعلیم دیتے ہیں، ہاں یہ سچ ہے لیکن اہلِ مذہب نے اپنی فیاضی کا دائرہ محدود کر دیا ہے، اُن کے نزدیک نیکی، احسان، بھلائی، ہمدردی، غمخواری، ان تمام اوصاف کا محل صرف اپنے ہم مذہب ہیں، لیکن خیام کے نزدیک آفتاب کی روشنی دشت و چمن، دونوں پر یکساں پڑتی ہے،

خیام کی اخلاقی تعلیم میں، ریاکاری سب سے بڑا جرم ہے، اور اس نے جس خوبی سے اس کی پردہ دری کی ہے، آج تک کسی نے نہیں کی، سعدی اور حافظ، ریاکار زاہدوں اور پیشواؤں کی دھجیاں اڑانے میں نہایت نامور ہیں اور نہایت عجیب عجیب نادر پیرایوں میں ان لوگوں کے پترے کھولتے ہیں، لیکن خیام نے ایک رباعی میں اس مضمون کا خاتمہ کر دیا ہے،

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی	ہر لحظہ بدام دیگرے پابستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم	تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

یعنی ایک زاہد نے ایک فاحشہ عورت سے کہا کہ تو بدمست ہے، تو خیال نہیں کرتی

کہ تو نے کس چیز کو چھوڑا اور کس چیز کو اختیار کیا ہے، اس نے جواب دیا کہ میں تو جیسا اپنے آپ کو ظاہر میں دکھلاتی ہوں ویسی ہی ہوں بھی، کیا آپ بھی اپنے آپ کو جیسا دکھلاتے ہیں ایسے ہی حقیقت میں بھی ہیں،

ظاہر و باطن کے یکساں نہونے کی برائی کا پیرایہ اس سے زیادہ اچھوتا، نادر اور موثر و عبرت خیز نہیں ہوسکتا تھا، خیام نے اس بات پر بھی خوب غور کیا تھا، کہ کن کن اسباب سے انسان کو خواہ مخواہ ہی ریا میں گرفتار ہونا پڑتا ہے، اسلئے وہ ان موقعوں سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے،

در راہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند | با خلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا | در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

یعنی رستہ اسطرح چلو کہ کوئی تم کو سلام نہ کرے، لوگوں کے ساتھ اس طرح بسر کرو کہ لوگ تمھاری تعظیم کے لئے قیام نہ کریں، مسجد میں جاؤ تو اس طرح کہ لوگ تم سے امام بننے کی خواہش ظاہر نہ کریں، مطلب یہ کہ ایسی سادگی، بے تکلفی، خاموشی سے زندگی بسر کرو کہ لوگ تم کو مقدس نہ خیال کریں، یہ ظاہر ہے کہ انسان جب لوگوں کی نظر میں مقدس ہوجاتا ہے تو اسکو سینکڑوں باتیں ایسی کرنی پڑتی ہیں جن سے اس کا تقدس قائم رہے حالانکہ وہ باتیں بہ تکلف کرتا ہے، اگر اس منصب پر وہ نہ پہنچتا تو اس خودداری اور حفظِ مراتب کی اسکو کیا ضرورت تھی،

خیام کا فلسفۂ اخلاق زہاد اور علماء کے فلسفۂ اخلاق سے نہایت بلند ہے، یہ مقدس

گروہ کسی کام کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس پر عذاب یا ثواب ہوگا، ان لوگوں کو اگر اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اس فعل پر عذاب نہیں ہوگا، یا خدا اوس کو بخش دیگا، تو پھر ان کو کچھ پروا نہ ہوگی، خیام کسی کام کے کرنے کے وقت صرف یہ دیکھتا ہے کہ خود یہ کام کیسا ہے، اگر وہ کام برا ہے تو اس سے اسکو کچھ تسلی نہیں ہوتی، کہ خدا اسکو بخش دے گا، اس کے نزدیک یہی بڑا عذاب ہے کہ خدا دیکھ رہا تھا، اور اس نے جرم کا ارتکاب کیا۔

با نفس ہمیشہ در نبردم چہ کنم　　　ز کردۂ خویشتن بہ دردم چہ کنم

گیرم کہ ز من در گزرانی بہ کرم　　　زیں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

یعنی اے خدا میں نے مان لیا کہ تو میرا گناہ معاف کر دیگا، اور عذاب نہ دیگا، لیکن یہ کیا کم عذاب ہے کہ تیری نظر کے سامنے میں نے ایسا فعل کیا۔

فقہا کی نسبت خیام کی رائے

خیام کے فلسفہ، اخلاقی تعلیم اور آزادی خیال کا نمونہ تم نے دیکھا، ایسا شخص فقہا کی نسبت جو رائے رکھ سکتا ہے، تم خود سمجھ سکتے ہو، وہ کہتا ہے اور کس قدر سچ کہتا ہے

با این دو سہ ناداں کہ چناں میدانی　　　از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند

خوش باش کہ از خری ایشاں بہ مثل　　　ہر کو نہ خر است کافرش می دانند

غور کرو، امام غزالی، امام رازی، محی الدین عربی، شیخ الاشراق، ان میں سے ہر شخص فقہا کی تکفیر کا زخم خوردہ ہے، کیوں؟ صرف اسلئے کہ یہ لوگ فقہا کے سے عامیانہ اور لغو عقائد اور خیالات نہیں رکھتے تھے، اسی نکتہ کو خیام اس تلخ جملہ میں ادا کرتا ہے، کہ جو شخص

ان تکفیر کرنے والوں کی طرح سے گدھا نہیں ہے اسکو یہ لوگ کافر کہتے ہیں،

خیام نے گو شاعری کے پردہ میں دل کے پھپھولے توڑے لیکن افسوس ہے، کہ فقہا کی سخت گیری کی وجہ سے وہ بھی اسرار اور حقائق کے ظاہر کرنے کی جرات نہ کر سکا چنانچہ خود کہتا ہے،

اسرار جہاں چنانکہ در دفتر ماست ... گفتن نہ تواں کہ آں وبال سر ماست

چوں نیست دریں مردم دنیا اہلے ... نتواں گفتن ہر انچہ در خاطر ماست

افسوس! ظاہر پرستوں کی گیر و دار نے خدا جانے کتنے عجیب و غریب اسرار او حقائق دلوں ہی میں دفن کرا دیے، آج آزادی کا زمانہ ہے لیکن اب وہ حقائق اور اسرار کہاں بازاری اور عامیانہ باتیں زبان پر آئیں تو اس سے کیا حاصل!!!

انچہ در کار ست نتوانی تو گفت ... انچہ می گوئی تو خود در کار نیست

خیام اور یورپ | یہ عجیب بات ہے کہ خیام کی قدر دانی، ایشیا سے زیادہ یورپ نے کی، اور کرنی چاہیے تھی، خیام کے خیالات، یورپ سے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ آج اگر موجود ہوتا تو شاید یورپین بنجاتا،

عمر خیام کی نسبت ۱۸۹۶ء تک جو کچھ یورپ میں لکھا گیا وہ وصایا وغیرہ نہایت محدود ماخذوں سے تھا، مگر پروفیسر ژکوسکی (ZHUKOOSKI) کے قابل یادگار مضمون نے خیالات میں تغیر عظیم برپا کر دیا اور اب پروفیسر راس، ہیرن الین (HEYONALLEN) وغیرہ نے انگریزی میں عمدہ ترجمے اور تذکرے شائع کئے ہیں ان سے پہلے انگلستان

فٹز جیرلڈ (Fitzgerald) کے مشہور ترجمہ کے علاوہ میکارتھی (Macarthy)
نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا مگر گارنر (Garner) کا ترجمہ عالمانہ اور
مطلب خیز تھا، ون فیلڈ (Whinfield) نے ۱۸۸۳ء میں دو کتابیں ایک
میں صرف ترجمۂ رباعیات اور دوسری میں رباعیاں اور ان کے مقابل میں ترجمہ شائع
کیں، نکلسن فرانسیسی (Nicholason) نے فٹز جیرلڈ سے ایک سال بعد فرنچ میں
ایک ترجمہ شائع کیا تھا، باڈن اسٹیڈ (Bodenstedt) نے جرمن میں ایک ترجمہ
چھاپا ہی، اور چند رباعیوں کا ترجمہ ہالینڈ کی زبان میں بھی ہو گیا ہی،

پروفیسر لکھتے ہیں کہ اگر وہ تمام کتابیں اور رسالے جمع کئے جائیں، جنمیں عمر خیام
کا ترجمہ یا حال شائع ہوا ہے تو درحقیقت ہماری زندگی میں یہ کام پورا نہیں ہو سکتا،

آکسفورڈ میں ایک نہایت قدیم نسخہ ہے، اسکو ہیرن الین نے عکس میں چھاپا
ہے، ایک عمدہ نسخہ پیرس میں ہے، مگر آکسفورڈ والے سے پرانا نہیں،

انوری

محمد نام اوحد الدین لقب، انوری تخلص ابیورد کے علاقہ میں بدنہ ایک گاؤں ہے جو مہنہ کے مقابل واقع ہے، انوری یہیں پیدا ہوا، یہ دولت شاہ کا بیان ہے لیکن عرفی کہتا ہے ع "انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز" اس علاقہ کو خاوران بھی کہتے ہیں، اس مناسبت سے انوری نے پہلے اپنا تخلص خاوری رکھا تھا پھر اپنے استاد عمارہ کی فرمایش سے بدل کر انوری کر دیا،

انوری نے علوم وفنون کی تحصیل طوس کے مدرسہ منصوریہ میں کی، اور تمام درسی علوم وفنون حاصل کئے، ریاضی میں خصوصیت کے ساتھ کمال پیدا کیا، دولت شاہ کا بیان ہے کہ انوری ایک دن مدرسہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک شخص بڑے جاہ وتجمل سے گذرا، انوری نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پایۂ تخت کا شاعر ہے، انوری نے اسی وقت تعلیم وتعلم کو خیرباد کہا، اور رات بھر میں قصیدہ لکھکر تیار کیا جس کا مطلع یہ ہے،

گر دل بحر و دست کان باشد   دل و دست خدائگان باشد

صبح کو دربار میں جاکر قصیدہ پڑھا، سنجر نہایت سخن شناس تھا، بہت محظوظ ہوا، کہا نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجالا کر عرض کی،

جز آستان توام در جہاں پناہے نیست | سر مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا، سنجر رادکان سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں چند قصیدے لکھکر پیش کیے جن میں سے ایک یہ ہے،

باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را | ویں حال کہ نو گشت زمین را و زماں را

ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں۔ اس کو کبھی اٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدہ میں کہتا ہے،

خسروا! بندہ را چو دہ سال است | کہ ہمی آرزوے آں باشد

کز ندیمان مجلس او نہ شود | از مقیمانِ آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتدائی نہیں، بلکہ دس برس کی امیدواری کے بعد لکھا گیا ہے، انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے، اسکی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا لیکن دربار تک رسائی حاصل نہیں ہوئی تھی جسکی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا امیر معزی تھا، اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا، اس کا حافظہ نہایت قوی تھا یعنی صرف ایک بار کے سننے میں قصیدہ یاد کر لیتا تھا، جب کوئی شاعر دربار میں آتا تھا قصیدہ سناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ میری تصنیف ہے، چنانچہ قصیدہ کا قصیدہ خود پڑھکر سنا دیتا، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا، انوری کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پرانے کپڑے پہن، پاگلوں

کی صورت بناکر معزی کے پاس گیا، اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھکر لایا ہوں، آپ پیش کرا دیجئے، معزی نے کہا کیا لکھا ہے، پڑھکر سناؤ، انوری نے پڑھا،

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ ۔۔۔ زہے میر و زہے میر و زہے میر

معزی نے کہا یوں کہتے تو مطلع ہو جاتا،

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ ۔۔۔ زہے ماہ و زہے ماہ و زہے ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے، انوری سے کہا کل آنا انوری دوسرے روز پہنچا تو معزی خود ساتھ لیکر دربار میں گیا، اور کہا کہ جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے، سناؤ، انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا،

گر دل و دست بحر و کاں باشد ۔۔۔ دل و دست خدائیگاں باشد

شاہ سنجر کہ کمترین خدمش ۔۔۔ در جہاں بادشاہاں باشد

دو شعر پڑھ کر رک گیا، اور معزی کی طرف خطاب کرکے کہا کہ یہ قصیدہ آپ کا ہے، تو باقی اشعار سنائیے، معزی چپ رہا، انوری نے پورا قصیدہ سنایا، سنجر نہایت محظوظ ہوا اور ندیمانِ خاص میں داخل کیا[1]، رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ آں جاہ و جلال، دو دفعہ انوری کے مکان پر جاکر اسکی عزت افزائی کی[2]،

انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہدِ حکومت میں اتفاق سے سبعۂ سیارہ برج

---

[1] یہ پوری تفصیل تاریخ حبیب السیر میں ہے[2] خزانۂ عامرہ۔

میزان میں جمع ہوئے، انوری نے اس بنا پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئیگا کہ تمام مکانات برباد ہوجائیں گے، لوگوں نے ڈر کر تہ خانے اور سرد آب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر اُن میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا، سنجر نے انوری کو بلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے فریدکاتب نے اس پر قطعہ لکھا،

گفت انوری کہ از جہت بادہائے سخت	ویراں شود عمارت و کہ نیز بر سری
در سال حکم او نہ وزید است ہیچ باد	یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترکِ ملازمت کرکے نیشاپور چلا آیا، اب اسکی شہرت دور دور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امرا و روسا کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجئے ۵۲۳ھ میں سلطان احمد بیروزشاہ نے اس کو خط بھیجکر بلایا اور ساتھ لیکر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری یہ سنکر کہ دریاے جیحوں راہ میں پڑتا ہے، اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچکر سلطان احمد سے معذرت چاہی، اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا، مطلب کی بات اس طرح ادا کی،

ایں حال[1] کہ در بلخ کنوں دارم	از خوفِ پریشانی و گمراہی
زیں بیش اگر وہم و گماں بردے	آں لحظے کو تہ منظر شاہی

[1] اس قصیدہ کی شرح میں ابوالحسن فراہانی نے اس قصیدہ کا شانِ نزول یہی لکھا ہے،

بر عبرۂ جیحوں نہ بہ آموزش | چوں بط بہ طبیعت شدمی راہی

سلطان احمد نے اسی کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لیکر آئے انوری روانہ ہوا لیکن دریائے جیحوں کے کنارے پہنچکر اس کے اوسان جاتے رہے، رہبر جو ساتھ تھا، ڈھارس دلانے کے لئے لنگ باندھکر دریا میں اترا، تیرتا ہوا دور تک گیا اور چاروں طرف چکر لگا کر دکھلایا کہ گھبرانے کی بات نہیں، انوری بہ ہزار خرابی کشتی میں بیٹھا گھاٹ پر شاہی اہتمام تھا، اور اسپ خاصہ سواری کے لئے آیا تھا، انوری نے آداب شاہی کے لحاظ سے گھوڑے پر سوار ہونے میں تامل کیا، لیکن پیش خدمت کے اصرار سے سوار ہوا، اور دربار میں آیا، قصیدہ راہ میں لکھ رکھا تھا، دربار میں پہنچکر پڑھا، دیکھو تمام واقعات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

جبذا بخت مساعد کہ سوے حضرت شاہ | مرومی کرد و ہم داد پس از چندیں گاہ،

اندر آمد ز در حجرۂ من صبحدمے | روز بہمن جبنہ یعنی دوم بہمن ماہ

سال بر پانصد وسی وسہ تاریخ عجم | گفت بر خیز کہ از شہر بدر شد ہمراہ

چہ روے راہ ترد و قضی الامر فقم | چہ کشتی نقش تخیل "بلغ السیل زباہ"،

چوں بر انگیخت مرا رفت چراغے افروخت | بے تحاشی چو فقی کہ بود از اشباہ

تاکہ من جامہ بپوشیدم و بیروں رفتم | بہ تماشاے کہ ود ائم نہ رہی کرد و نہ راہ

او برون بردیدم فرش و آورد دستور | محلے بست مرا کرد چو شاہے برگاہ،

ہمچناں جملہ راہم بسلامت می برد | نہ دراں طبع ملالت نہ دریں طوع اکراہ

تا به حدّے که مرا داد ہمے میخ و کفش — تا بجائے که ہمی داد خرم را جو و کاہ

چوں به جیحوں برسیدیم زمن ہوش برفت — گفت لاحول و لا قوة الا باللہ

رفت و بربست ازارے و به جیحوں در جست — و اندراں جست به یکدم بگذشت او بشناہ

باز باز آمد و گفتا که بدیدی سہل است — در نشیں خیز و مکن وقت گزشتن بیگاہ

کشتی آورد و نشستیم در و ہر دو بہم — چوں دو یار او ہمه یاری ذمن ہائے خواہ

او چو شیرے به یکے گوشۂ کشتی بنشست — من سر اندر زن[۱] و بیروں زن ہمچو روباہ

آخر الامر چو کشتی بسلامت بگذشت — جستم از کشتی و آمد به لب کشتی گاہ

عرصه دیدم چو جان چو لئے نجوشی — شادی افزائے چو جان و جدائی غم کاہ

گفتم اے جنت بہشت است سواد بر — گفت راضی مشو از روضۂ رضواں به گیاہ

باش تا شہر به بینی، ز در و بام کے — باش تا قلعه به بینی و در و عرض سپاہ

تا دریں بودم، گردے ز در شہر بخاست — گفتم آں کیست مرا گفت جنیبت کش شاہ

آمد القصه و آورد جنیبت پیشم — دیدۂ من چو دراں شکل و شبه کرد نگاہ

بوسه دادم سمش، و زانوے رکابش ہر سہ — گفتم اے روز براق از تو چو رنگ تو سیاہ

به سعادت به سر آخر خود باز خرام — که ترا پایه بلند است و مرا پایه کوتاہ

ایں ہمی گفتم و داد دست ہمی کوفت کسے — ترک فرماں ہمه حال گناہ است گناہ

---

[۱] سر اندر زدن: منہ اندر کر لینا، یعنی لومڑی کی طرح کبھی منہ باہر نکالتا تھا اور کبھی اندر کر لیتا تھا۔

اقسام سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت دلچسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اسکی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا، اس کے ساتھ طبیعت میں تنک ظرفی اور کم حوصلگی تھی ذرا کسی سے رنج ہوا اور اُس کی ہجو کا طومار باندھ دیا، اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانہ کو دشمن بنا لیا تھا، چنانچہ سلطان علاء الدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے، سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہان کا رئیس تھا خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کر کے دربار میں بھیجدو، ملک طوطی نے فخر الدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں، فخر الدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا، اُس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا، اسلئے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا،

حذار حذار من بطشی و فتکی — فهی الدنیا تقول بملاء فیہا

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا، ملک طوطی کے دربار میں سفارشیں پہنچائیں، سلطان علاء الدین کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے ملک طوطی کو لکھا کہ انوری کو میرے دربار میں بھیجدو، ہزار بکریاں صلہ میں دوں گا، ملک طوطی نے انوری کو بلا کر کہا کہ تمہارے معاوضہ میں مجھ کو ہزار بکریاں ملتی ہیں، انوری نے کہا علاء الدین مجھکو ہزار بکریوں کے بدلے خریدتا ہے، اور آپ مفت

بھی نہیں لیتے، ملک طوطی کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اپنے مقربین میں داخل کیا[1]۔

انوری کے مخالف شعرا نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھ کر اس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑتا تھا، چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا، تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمایش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کردی[2]، اس کے چند اشعار یہ ہیں،

چار شہر ست خراساں را بہ چار طرف ۔۔۔ کہ وسطِ شاں بہ مسافت کم صد در صد نیست
گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد ۔۔۔ نہ چناں ہست کہ البتہ دام و دد نیست
بلخ را عیب اگر چند باد باش کنند ۔۔۔ بہ ہر بیخرد بے نیست کہ صد بخرد نیست
مصر جامع را چارہ نبود از بد و نیک ۔۔۔ معدنِ زر و گہر بے سرِ ب لب بد نیست
حبذا شہر نشاپور کہ در ملک خدا ۔۔۔ گر بہشت است ہمین ست و گرنہ خود نیست

اہلِ شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچی، لیکن قاضی حمید الدین جنکی تصنیف سے مقامات حمیدی ہے، اور جنکی شان میں انوری نے لکھا ہے،

بہ مدح و ثنا گر کنم رائے نظمے ۔۔۔ نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم
ولیکن بہ مدح جناب حمیدی ۔۔۔ اگر وحے باشد ہراساں فرستم

---

[1] لب اللباب عوفی یزدی و مجمع الفصحا تذکرہ فخر الدین مروزی [2] مجمع الفصحا، تذکرہ فتوحی مروزی و ریاض الصافین تذکرہ انوری، دولت شاہ نے لکھا ہے کہ خود انوری نے یہ ہجو لکھی تھی لیکن یہ غلط ہے

انھوں نے انوری کی حمایت کی اور اُسکی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدہ میں ذکر کیا ہے،

اے مسلماناں فغاں از دور چرخ چنبری

چونکہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم، صفی الدین عمر، مفتی تاج الدین حسن محتسب نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اسلئے قصیدہ میں سب کا ذکر کیا ہے اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے میں اسکی ہجو کیونکر کہہ سکتا ہوں،

بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی اور گوشہ گزین ہو کر بیٹھا، سلطان علاء الدین غوری جہانسوز نے دربار میں طلب کیا، لیکن اسنے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا

کلبۂ کاندر و بہ روز و بہ شب	جاے آرام و خورد و خواب من است
جایکے دارم اندرہ کہ از و	چرخ در عین رشک تاب من است
ہر چہ در مجلس ملوک بود،	ہمہ در کلبۂ خراب من است
رحل اجزا و نان خشک درو	گرد خوان من و کباب من است
قلم کوتہ و صریر خوشش،	زخمہ و نغمۂ رباب من است
خرقۂ صوفیانۂ اطلس	از ہزار اطلس انتخاب من است
ہر چہ بیرون بود ازیں کم و بیش	حاش للسامعین عذاب من است
خدمت بادشہ کہ باقی باد	نہ بیاز و ے خاک آب من است

زیں قدر راہ رحمتم بستہ است | آں کہ او مرجع و مآب من است
ویں طریق از نمایش است خطا | چہ کنم ایں خطا صواب من است
نیست ایں بندہ را زبان جواب | جامۂ و جلیے عن جواب من است

مدح اور ہجو کے ساتھ غزل کہنی بھی چھوڑ دی، کسی نے پوچھا تو جواب دیا۔

دی مرا عاشقکی، گفت غزل می گوئی | گفتم از مدح و ہجا دست بیفشاندم ہم
گفت چوں؟ گفتمش آں جانب گمراہی بود | حالت رفتہ دگر باز نیاید ز عدم
غزل و مدح و ہجا ہر سہ ازاں می گفتم | کہ مرا شہوت و حرص و غضبے بود بہم

اخیر شعر کا مضمون اگرچہ عربی سے ماخوذ ہے، لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انوری شاعری کی حقیقت سے واقف تھا، یعنی یہ کہ شاعری، جذباتِ انسانی کے اظہار کا نام ہے، شہوت، حرص، غصہ، سب جذبات ہیں، اور یہی جذبات غزل و مدح اور ہجو کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں،

انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی، اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا،

انوری بخلاف اکثر شعرا کے اکثر علومِ متداولہ میں کمال رکھتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے

گرچہ دربستم در مدح و غزل یکبارگی | ظن مبر کز نظم الفاظ و معانی قاصرم
بلکہ بر ہر علم کز اقران من داند کسے | خواہ جزوی باشد آں را خواہ کلی قادرم
منطق و موسیقی و ہیات شناسم اندکے | راستی باید بگویم با نصیب وافرم

وز الٰہی انچہ تصدیقش کند عقلِ صریح | گر تو تصدیقش کنی بر شرح و بسطش ماہرم
وز طبیعی رمز چند از چند بے تشویر ہست | کشف آنم کرد اگر جا شد بنا شد ناظرم
نیستم ہم جاہل از اعمالِ احکامِ نجوم | ور ہمی باور نہ دانی رنجہ شو من حاضرم
این ہمہ بگذار با شعر مجرد آمدم | چون سنائی ہستم آخر گرنہ ہمچون صابرم
قدر من صاحب قوام الدین حسن انداز آنکہ | صدر او را یادگار ناصر الدین طاہرم

ان کمالات کی وجہ سے تمام لوگ اس کی عزت کرتے تھے، سلطان سنجر اس جاہ وجلال کا بادشاہ اس کے گھر آتا تھا، فتوحات کا یہ حال تھا کہ جلال الوزرا کے ہاں سے سالانہ پانچ سو اشرفیاں مقرر تھیں، با ایں ہمہ چونکہ طبیعت کا دنی تھا اور زبان قابو میں نہ تھی، اسلئے ذلتیں اٹھاتا تھا، ایک وزیر کی مدح میں قطعہ لکھا اور اخیر میں یہ شعر لکھے،

تو کہ از دور ہمی بینی پوشیدہ مرا | حال بیرون و درونم نہ ہمانا دانی
طاق بو طالب نعمہ است کہ دارم زبرون | وز درون پیرہن بو الحسن عمرانی

یعنی میرے بدن پر مدت کے پھٹے پرانے کپڑے ہیں، چادر ابو طالب کی دی ہوئی ہے اور پیراہن ابو الحسن عمرانی کا عنایت کیا ہوا ہے، وزیر نے ناراض ہو کر، فتوحی مروزی کو حکم دیا کہ جواب لکھے، چنانچہ اس نے ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

از پس آنکہ بہ یک مہر دو الف ملکی | داشت در بلخ ملک شاہ تو ارزانی
وز پس آنکہ ہزار دگرت داد وزیر | قرض آں پیر سر خشتی زچہ می بستانی
از پس آنکہ ز انعام جلال الوزرا | بتو ہر سالہ رسد مہرے پانصد کانی

اے بہ دانائی معروف چرا میگوئی	در ثنائے کہ فرستادہ از نادانی
طاق بوطالب نعمہ است کہ دائم بود[۱]	وز درون پیرہن بوالحسن عمرانی
چہ بخیلی کہ بجنبد ز زر و سیم و نعمت	طاق و پیراہنے دوخت ہمی نتوانی
پانزدہ سال فزوں باشد تا کشتہ شدہ است	بوالحسن آنکہ ز احسانش سخن میرانی
پیرہن کہنۂ او گرت بجائیست ہنوز	پس مخواں پیرہنش کو زرہ خفتانی
باقی عمر بش آں پیرہن و طاق ترا	سزد ار مدحی ابرام و دگر بستانی

یعنی ابوالحسن عمرانی کو مرے ہوئے آج پندرہ برس ہو گئے، اتنی مدت تک اسکا دیا ہوا پیرہن موجود ہے، تو پیرہن کاہے کو ہے زرہ ہے، اور اس کے ہوتے اب کسی پیرہن کی کیا حاجت ہے،

لطیفہ۔ ایک دفعہ انوری راہ میں چلا جاتا تھا، ایک شخص کو دیکھا کہ اشعار پڑھ رہا ہے، انوری نے خیال کیا تو اسی کے اشعار تھے، پوچھا کہ آپ کا تخلص کیا ہے، ؟ اس نے کہا "انوری" انوری نے کہا، شعر کے چور پہلے بھی سنے تھے، شاعر چرانے والا آج دیکھا،

کلام پر رائے انوری جس پایہ کا شاعر تھا، اس سے زیادہ بہت خوش قسمت تھا، ایران میں تین شاعر پیغمبر سخن تسلیم کئے گئے، ان میں ایک انوری بھی ہے چنانچہ مشہور ہے

در شعر سہ تن پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبی بعدی

۱؎ مجمع الفصحا، تذکرہ فتوحی مروزی،

ابیات وقصیدهٔ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

ہاتفی نے مثنوی کی رعایت سے اس کو اس طرح بدل دیا ہے،

در شعر سہ تن پیمبر انند | قولے است کہ جملگی برانند
فردوسی و انوری و سعدی | ہرچند کہ لا نبی بعدی

آباقاآن خاں کے زمانہ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ انوری اور ظہیر فاریابی دونوں میں کس کو ترجیح ہے، سب نے مجد ہمگر[1] کو ثالث قرار دیا اور ایک منظوم استفتا لکھا،

اے آں زمین وقار کہ بر آسمان فضل | ماہ خجستہ فضلے و خورشید انوری،
جمعے ز ناقدانِ سخن گفتہ ظہیر | ترجیح می نہند بر اشعارِ انوری
جمعے دگر برین سخن انکار می کنند | فی الجملہ در محلِ نزاع اند و داوری
رجحان یک طرف تو بد لیشان نما کہ ہست | زیر نگین طبع تو ملکِ سخنوری،

مجد ہمگر نے جواب لکھا،

جمعے ز اہل خطۂ کاشاں کہ بردہ اند | از ارباب فضل و دانش گوی سخنوری
کردند بحث در سخن ایشان نظم | تا خود کہ سفتہ بہ دُر در سخنوری
در انوری مناظرہ شان نت در ظہیر | تا مرکراست پایۂ بہتر ز شاعری
انصاف چوں نیافت گردہ از دگر گروہ | ہر بندہ را گزید نظر شاں بہ داوری
در کانِ طبع آں جو گشتم گراں گراں | در قعر بحر ایں چو نمودم شناوری

[1] مجد ہمگر اس درجہ کا شاعر تھا کہ بعضوں نے اسکو شیخ سعدی کا ہم پلہ مانا ہے،

شعر کے برآمدہ چو در شاہوار | نظم دگر برآمدہ چون مہر خاوری

شعر ظہیر اگرچہ برآمد ز جنس شعر | برتر ز انوری نہ زند لاف شاعری

بر اوج مشتری نہ رسد تیر نظم او، | خاصہ کہ در ثناگری و مدح گستری

طعم رطب اگرچہ لذیذ است و خوش مذاق | کے بہ بود ز خاصیت قند عسکری

انیست اعتقاد رہی خوش قبول کن | گر تو مقید سخن مجد ہمگری

زاد ایں نتیجہ نیم شب از آخر رجب | در خاؤ عین و دال ز ہجر پیمبری

امامی ہروی[1] نے بھی اس فیصلہ سے اتفاق کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں،

اے سائل مسائل فکرت دریں سوال | معذور نیستی بحقیقت چو بنگری

تمیز راز بہر تناسب دریں دو طور | ہیچ احتیاج نیست بدیں شرح گستری

کیں معجز است و آں سحر آں شمع و ایں چراغ | ایں ماہ و آں ستارہ و آں حور و ایں پری

انوری ظہیر سے بلکہ اپنے تمام معاصرین سے بڑھکر ہو تو ہمکو انکار نہیں، لیکن اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ فردوسی اور سعدی کے پہلو میں اس کو جگہ دی جائے، قطعہ[2] مشہور اور مجد ہمگر کے فیصلہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انوری قصیدہ گوئی میں پیغمبر تھا جس طرح فردوسی اور سعدی مثنوی اور غزل میں تھے، لیکن یہ اور بھی حیرت انگیز ہے

[1] یہ وہی امامی ہیں جن کو مجد ہمگر نے شیخ سعدی پر ترجیح دی تھی، اور شیخ سعدی نے ناراض ہو کر کہا تھا   ہمگر بہمر خود نکرد دست نماز   شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

[2] مجالس المومنین تذکرہ انوری، ہمگر کے قطعہ کے چند شعر ہم نے چھوڑ دیئے ہیں،

قصیدہ کا جو انداز چلا آتا تھا، اس پر انوری نے کچھ اضافہ نہیں کیا، اور جس قدر کیا اس میں اس کے اور ہمعصر شریک ہیں، انوری کے قصائد کے خصوصیات یہ بتائے جاتے ہیں کہ اس نے جدید مضامین پیدا کئے، مبالغہ کو ترقی دی، نئی تشبیہیں پیدا کیں، لیکن عبدالواسع جبلی، ازرقی اور ظہیر ان باتوں میں انوری سے کسی طرح کم نہیں، انوری نے ایک قصیدہ میں ہلال کی تشبیہ سے مدح کی طرف گریز کیا ہے، اور وہ انوری کے محاسن اشعار میں محسوب ہے،

دوش سلطان چرخ آئینہ فام ۔۔۔ آنکہ دستور شاہ راست غلام

از کنار نبردگاہِ افق ۔۔۔ چوں بدست غروب داد زمام

دیدم اندر سوادِ طرۂ شب ۔۔۔ گوشوار فلک زگوشۂ بام

گفتم آں نعل خنگ دستور است ۔۔۔ قرۃ العین و فخر آلِ نظام

لیکن یہ تشبیہ اور گریز منطقی رازی سے ماخوذ ہے، وہ کہتا ہے،

مہ گردوں مگر بیمار گشتہ ۔۔۔ کہ نالید و تنش بگرفت نقصان

بسان گوئے سیمیں بود اکنوں ۔۔۔ برآمد بر فلک چو نوکِ چوگان

تو گفتی خنگ صاحب تاختن کرد ۔۔۔ فگند ایں نعل زریں در بیاباں

اس میں جو لطافت اور ندرت ہے انوری کے ہاں نہیں، ظہیر فاریابی نے بھی اس تشبیہ کو لیا ہے، لیکن چند اور تشبیہیں اضافہ کر کے اسکو زیادہ دلآویز کر دیا ہے،

پیدا شد از کرانۂ میدانِ آسمان ۔۔۔ شکلِ ہلال چوں سرِ چوگانِ شہریار

من باخرد بہ حجرۂ خلوت شتافتم | گفتم کہ اے نتیجۂ الطافِ کردگار
باز ایں چہ نقشِ بوالعجب و شکلِ نادرست | کز کارگاہِ غیب ہمے گردد آشکار
گردوں زجا بلند کہ؟ بریدہ است ایں طراز | گیتی زساعد کہ؟ بودست ایں سوار
گفت آنچہ برشمردی ازاں جملہ ہیچ نیست | دانی کہ ہیچ باتو بگویم بہ اختصار
نعل سمندِ شاہِ جہان ست کاسماں | ہرماہ برسرش بنہد از بہرِ افتخار

وطن کی ناقدری میں انوری کامشہور شعر ہے،

بہ شہرِ خویش دروں بے خطر بود مردم | بہ کانِ خویش درون بے بہا بود گوہر

لیکن یہ بالکل میر معزی کے شعر کا سرقہ ہے

مردم بہ شہرِ خویش نہ دارد بسے خطر | گوہر بہ کانِ خویش ندارد بسے بہا

غرض انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں کوئی معجزہ موجود نہیں، البتہ اپنے معاصرین یعنی ادیب صابر، ازرقی، لامعی، رشید الدین وطواط، عبدالواسع جبلی، معزی وغیرہ سے بعض باتوں میں ممتاز ہے، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے،

سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اور شعرار کی طرح اسکا کلام مدح پر محدود نہیں، وہ ہر طرح کے واقعات اور معاملات ادا کرتا ہے، جس سے زبان کو وسعت حاصل ہوتی ہے، آج کوئی شخص اگر عام معاملات ادا کرنا چاہے تو اس کو الفاظ میں، بندش میں، ترکیب میں، انوری کے سوا اور شعرائے کلام سے بہت کم مدد ملیگی،

ایک قصیدہ میں شاعری کی برائی اور اس کا غیر ضروری ہونا بیان کیا ہے،

اس میں وہ تمام خیالات ظاہر کئے ہیں جو آج کل شاعری کے بیکار ثابت کرنے میں پیش کئے جاتے ہیں، اس نے ثابت کیا ہے کہ شاعر کا رتبہ حلال خور سے بھی کم ہے، اسلئے کہ حلال خور دنیا کے لئے ضروری ہے لیکن شاعری کی کیا ضرورت ہے؟ ایک ادنیٰ اسی چیز کے بنانے میں بواسطہ اور بلا واسطہ سینکڑوں آدمی کی شرکت کی ضرورت پڑتی ہے لیکن شاعر کون سا کام انجام دے سکتا ہے، مدحیہ شعر کہہ کر صلہ کا طالب ہونا کس قدر لغو ہے، ممدوح نے کب کہا تھا کہ تم اسکی مدح کرو، البتہ وہ شاعر قدر کے قابل ہے، جو کسی کی مدح وغیرہ نہیں کرتا، ان تمام خیالات کو انوری نے نہایت صفائی و برجستگی سے ادا کیا ہے

اے برادر بشنوی رمزی ز شعر و شاعری　　تا ز ما مشتے گدا کس را بمردم نشمری

زانکہ از کناس ناکس در ممالک چارہ نیست　　حاش للہ تا ندانی این سخن را سرسری

زانکہ گر حاجت فتد تا فضلۂ را کم کند　　تا قلے باید، تو نتوانی کہ خود بیروں بری

کار خالد کے بجعفر مے شود ہرگز تمام　　آں یکے جولاہگی داند وگر بذری گری

باز گر شاعر نہ باشد، ہیچ نقصان نا وفتد　　در نظام عالم از روے خرد گر بنگری

آدمی را چوں معونت شرط کار شرکت است　　ناں ز کناسی خوری بہ زاں بود کز شاعری

آں شنیدستی کہ سہ صد کس بباید پیشہ ور　　تا تو نا دانستہ بے آگہی نانے خوری

در ازاے آں اگر از تو نباشد یارے　　آں نہ ناں خوردن بود، وانی چہ باشد بری

چوں نہ داری بر کسے حقی حقیقت آں کہ ہست　　مقابل
ہم تقاضا ریش گاوے باہم بجا

از چہ واجب شد بگو؟ آخر بدیں آزار مرد　　آنکہ میخواہی ازو، یا آنکہ زو مستکبری

او ترا گے گفت؟ کایں گلترہ ہا را جمع کن
تا ترا لازم شود چنداں شکایت گستری

عمر خود خود میکنی ضائع از و تاواں مجو؟ (نحویات)
ہم تو حاکم باش تا ہم زاں کہ بفروشی خری

دشمنِ جان من آمد شعر چندش پرورم
اے مسلماناں فغاں از دست دشمن پروری

شعر دانی چیست؟ دور از روے تو حیض الرجال
قائلش گو خواہ حیواں باش خواہی تستری

اینکہ پرسد ہر زماں ایں کون خران گاؤ ریش
کانوری بہ یا فتوحی در سخن یا سنجری

راستی بہ بوفراس آمد نگار شاعراں
واں نہ از ضعفِ سخن بل از کمال قادری

زانکہ ہمچوں دیگراں مدح و ثنا ہرگز نہ گفت
پس ہر نج او گویدت من دیگرم تو دیگری

مرد را باید کہ حکمت نیز دامن گیر دش
تا شفاے بوعلی خواند نہ ژاژ بحتری

جس زمانہ میں غزوں (تاتاریوں) نے سلطان سنجر کو گرفتار کرلیا، اور کئی برس تک قید میں رکھا، تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی، اہلِ خراسان نے احمد سلیمان سے استغاثہ کرنا چاہا، انوری سے درخواست کی کہ ان عبرت انگیز واقعات کو نظم میں ادا کردے، انوری نے فرمائش کی تعمیل کی،

بر سمرقند اگر بگذری اے بادِ سحر
نامہ اہل خراساں بہ برِ خاقان بر

نامۂ مطلع او، رنج تن آفتِ جاں
نامہ مقطع او درد دل و سوز جگر

نامہ بر رقمش، آہِ شہیداں پیدا
نامہ در شکنش، خونِ شہیداں مضمر

تاکنوں حال خراسان و رعایا بودہ است
بر خداوندے ل خاقان پوشیدہ مگر

اے کیومرث بقا، بادشہ کسریٰ عدل
اے منوچہر لقا خسرو افریدون فر

قصهٔ اہلِ خراساں بشنو از سرِ لطف	چوں شنیدی، ز سرِ رحم در ایشاں بنگر
ایں دلِ افگار جگر سوختگاں می گویند	کاے دل و دولت و دیں را ز تو شادی و ظفر
خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزاں	نیست یک تن ز خراساں کہ نشد زیر و زبر
بر بزرگانِ زمانہ شدہ خرداں سالار	بر کریمانِ جہاں گشتہ لئیماں مہتر
شاد الّا بہ درِ مرگ نہ بینی مردم	بکر جز در شکمِ مادر نیابی دختر
بر مسلماناں زاں شکل کنند استخفاف	کہ مسلماں نہ کند صد یک آں با کافر
خلق را زیں غم فریاد رس اے شاہ نژاد	ملک را زیں ستم آزاد کن اے پاک سیر
رحم کن رحم بر آں قوم کہ جویند جویں	از پس آنکہ نخوردندے از ناز شکر
رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند نمد	از پس آنکہ از اطلس شاں بودے بستر

کسی دوست کو دعوت میں بلایا ہے، اور نظم میں رقعہ لکھا ہے،

ندارد مجلسِ ما بے تو نورے	اگرچہ نیست مجلس درخورِ تو
چہ فرمائی چہ گوئی مصلحت چیست	تو آئی نزدِ ما، یا ما برِ تو

دربارداری اور دریوزہ گری سے توبہ کی تو یہ قطعہ لکھا،

من و ایں عہد کہ با قحبۂ رعنای جہاں	بعد ازاں عشق نبازم نہ بسہو و نہ بعمد
قوت دادن اگر نیست مرا باکے نیست	قوتِ ناستدن ہست فللہ الحمد

یعنی اگر دوسروں کو دینے کا مقدور نہیں تو یہ قدرت تو ہے کہ دوسروں سے کچھ نہ لوں

علم کی بے قدری پر اس طرح غصہ ظاہر کرتا ہے،

اے خواجہ مکن، تا بتوانی طلب علم | تا در طلبِ اتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز | تا دادِ خود از کہتر و مہتر بستانی
فرعونؔ عذابِ بد و ریشِ مرصع | موسیٰؑ کلیم اللہ و چوبی و شبانی

یعنی فرعون کافر ہوکر داڑھی میں موتی پروتا تھا، اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ ہوکر بکریاں چراتے تھے،

عوام کی بے تمیزی کو ایک فرضی قصہ میں ادا کرتا ہے،

روبہے می دوید در غم جاں، | روبہے دیگرش بدید چناں،
گفت خیر است؟ باز گوئی خبر | گفت خرگیری کند سلطاں
گفت تو خر نۂ چہ می ترسی | گفت آرے ولیک آدمیاں
می ندانند و فرق می نہ کنند | خر و روباہ شاں بود یکساں

شیخ سعدیؒ نے "ایں ہم بچۂ شتر است" کا لطیفہ غالباً یہیں سے لیا ہے،
بات چیت، خط کتابت میں ایشیائی تکلفات سے انوری بھی تنگ آگیا تھا، چنانچہ کہتا ہے اور کس بے تکلفی سے کہتا ہے،

تکلف میانِ دو آزاد مرد | بود ناپسندیدہ و سخت کام
بیا تا تکلف بیک سو نہیم | نہ از تو رکوع و نہ از ما قیام
بہ سنت کنم اقتدا زیں سپس | سلامٌ علیکم، علیکم سلام

ہجو | انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی شریعت ہوتی تو انوری

دین کہ من خادم ہمی پروازم اکنوں حریت　　　سامری گو تا بیاید گو شمال لامساس

سنائی کے قصیدے کا جو جواب لکھا ہے، اس میں اکثر قافیے اسی قسم کے آئے ہیں، مثلاً

بر و جانِ پدر تن در مشیت وہ کہ در افتد　　　زیاجوج تمنا رخنہ در سد ولو شئنا

بلے از جاھدوا اکثیر ست تست این رتبہ　　　ولیک از جاھدوا ہم بر نخیزد ہیچ بے فینا

(یعنی جاھدوا فینا)

چوں مراد خویش را با ملک رے کردم قیاس　　　در خراساں تازہ بنہادم اقامت را اساس

چوں غنیمت را مقابل کردہ شد با امنی　　　عقل سی روز و طمع ہاے بود در اسابداس

انظرونا نقتبس من نورکم کے گفت چرخ　　　کافتاب از آفتاب ہمت کرد اقتباس

تا کہ باشد این مثل کالیاس احدی الراحتین　　　باے اندر راحتے کو را نباشد بیم یاس

بے سپیدہ دم شب خذلاں خواہت چنانکہ　　　تا بصبح حشر میگوید احادٌ ام سداس

متنبی کے اس مطلع کی طرف اشارہ ہے، احادٌ ام سداسٌ فی احاد،

دوستاں با یک جگر پُر خوں کہ اینک قد مضے　　　دشمناں با کید گر پر خندہ کاینک قد ھلث

آدم از نسبت وجود تو یافت　　　اختصاصِ خلقتہ بیدی

دوش با آسماں ہمے گفتم　　　بر سبیل سوال مطلب لیے

کاے علی! اخرج این حشم برکیست　　　ہمت گفت قد ضنیت علی

میر آب ست و حق ہمی گوید　　　کہ من الماء کل شیٔ حے

خصم تو و قاعدۂ ملک او　　　آں شدہ از بدو جہاں مستقیم

چوں دو بنا بود برافراشتہ　　زاں دو یکے محدث و دیگر قدیم

زلزلۂ قہر تو شاں کرد پست　　زلزلۃ الساعۃ شئ عظیم

جو لوگ انوری کی پیغمبری کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں اُسکی مضمون آفرینیوں سے استدلال کرتے ہیں،

متنبی نے مضمون باندھا تھا کہ ممدوح گو انسانوں میں داخل ہے لیکن انسانوں سے فائق ہے جس طرح نافہ کہ ہرن کے خون سے بنا ہے، لیکن خون سے اس کو کچھ نسبت نہیں ہے،

فان تفق الانام وانت منھم　　فان المسک بعض دم الغزال

اس سے ترقی کرکے شراب انگور کی مثال دی ہے،

فان فی الخمر معنی لیس فی العنب

یعنی گو شراب انگور سے بنتی ہے لیکن یہ انگور سے بڑھکر ہے، ممدوح کا بھی یہی حال ہے

انوری نے ان سب تشبیہوں کو گرد کر دیا،

در جہانی واز جہاں بیشی،　　ہمچو معنی کہ در بیاں باشد

یعنی اے ممدوح تو دنیا میں ہے، لیکن دنیا سے زیادہ ہے، جس طرح عبارت میں معنی ہوتے ہیں کہ عبارت ذرا سی ہوتی ہے اور مضمون نہایت وسیع ہوتا ہے،

زحرص خدمت او سرنگوں ہمے آیند　　بوقت زادن از ارحام مادراں طفلاں

بچے عموماً ماں کے پیٹ سے سر کے بھل پیدا ہوتے ہیں، انوری اس کا سبب یہ قرار دیتا

ہے کہ انسان فطرۃً ممدوح کی خدمت کے خواہشمند ہیں، اس لئے دنیا میں آتے ہیں تو سر کے بل آتے ہیں، مبالغہ جو عوام کے نزدیک شاعری کی ایک اعلیٰ صفت ہے، انوری اس میدان میں سب سے آگے ہے،

ممدوح کی مدح میں ع اے بیش زآفرینش وکم زآفریدگار

ع چیست کاں بر تو روانیست مگر عزّ و جل

بزرگواری کاندر کمال قدرت خویش نہ ایزد ست چو ایزد بزرگ بے ہمتاست

گر صبا از کف و دست تو دزدوقت بہار درم افشاں و مداد شاخ بروں دست چنار

انوری اور یورپ انوری کی خوش قسمتی میں ایک نمبر یہ بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ یورپ نے اس کے کلام کے ساتھ نہایت اعتنا کیا، روس کے پروفیسر والن ٹن ژدکوسکی نے ۱۸۸۳ء میں بمقام سینٹ پٹر سبرگ انوری کے کلام اور اسکی سوانحعمری پر ایک کتاب لکھی جس کا یہ نام ہے "میٹرمیس فار اے بیوگرفی اینڈ کیرکٹرسٹک اسکیچ" یہ کتاب ۱۷۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس کے عنوانات حسب ذیل ہیں،

دیباچہ	از صفحہ ۱ تا ۷	
مقدمہ	۸ تا ۲۴	
باب اول	۱ تا ۳۰	اسمیں انوری کی سوانحعمری ہے،
باب دوم	۳۱ تا ۷۸	مشتمل بر خصوصیات انوری
باب سوم	از ۷۹ تا ۹۹	مشتمل بر شروح کلام انوری

پروفیسر براؤن نے اس کتاب کا حال تفصیل سے لکھا ہے، ناظرین اسکو ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ اہل یورپ ہر زبان کے متعلق، کیا کیا نکتہ سنجیاں اور دیدہ ریزیاں کرتے ہیں کہ ہم انکی تقلید بھی نہیں کر سکتے،

نظامی،

الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلص، باپ کا نام مؤید
تھا وطن عام طور پر گنجہ مشہور ہے، لیکن دراصل قم کے رہنے والے تھے، چنانچہ خود سکندر نامہ
میں فرماتے ہیں،

چو در گرچہ در بحر گنجہ گُمم ولے از قہستان شہر قمم

قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہے، اصل وطن یہاں تھا، لیکن چونکہ قم صدر
مقام ہے، اسلئے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا نام لیتے ہیں، نظامی کے والد بزرگوار
وطن چھوڑ کر گنجہ میں آئے، نظامی[1] یہیں پیدا ہوئے، سال ولادت کسی نے بیان نہیں کیا،
لیکن چونکہ بروایت صحیح سن وفات ۵۹۶ھ ہے اور ان کی عمر عموماً ۶۳ برس کی بیان
کیجاتی ہے، اس لئے سال ولادت ۵۳۳ھ سمجھنا چاہیے،

نظامی کا خاندان علمی خاندان تھا، ان کے بھائی قوامی مطرزی مشہور شاعر ہیں، انکا
ایک قصیدہ ہے جس میں تمام صنایع شاعری جمع کر دیئے ہیں،

نظامی نے ابتدا میں درسی علوم کی تحصیل کی، ان کے کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے

۱؎ یہ امین رازی اور لطف علی آذر کی تحقیق ہے لیکن سکندر نامہ کے جس شعر سے امین رازی نے استدلال کیا ہے
وہ موجودہ نسخوں میں مذکور نہیں، تفرش کی مزید تفصیل اور نظامی کی جائے ولادت لطف علی آذر سے ماخوذ ہے

کہ علمی مسائل ان کے پیش نظر ہیں، خود بھی دعویٰ کرتے ہیں،

ہر چہ ہست از دقیقہاے نجوم | با یکایک نہفتہاے علوم
خواندم و سر ہر ورق جستم | چوں ترا یافتم ورق شستم

سلسلۂ طریقت میں واخی فرج زنجانی سے بیعت تھی،

نظامی اگرچہ درویشانہ طبیعت رکھتے تھے، لیکن شاعری بھی ازل سے ساتھ لائے تھے، گھر میں پہلے سے شاعری کا چرچا تھا، اس لئے درسی علوم سے فارغ ہو کر تصنیف کا قلم ہاتھ میں لیا، تو حرف موزوں نکلے، مشق روز بروز بڑھتی گئی، اور کلام کا شہرہ دور دور پہنچا، یہانتک کہ اُس زمانہ کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کو لازمۂ سلطنت سمجھا، اور فرمایش کر کے اُن سے اپنے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں، اسباب اسکے مقتضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا لیکن یہ سعادت دور والوں کی قسمت میں لکھی تھی، سب سے پہلے جس کو یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام شاہ[1] تھا، نظامی نے مخزن اُسرار ۵۵۹ھ میں اسی کے نام پر لکھی، اور صلہ میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں، ایک قطار شتر، اور انواع و اقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے،

---

[1] سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے منکوجک غازی کو جو قائم بامراللہ کا منظور نظر تھا، ازرنجان اور کماخ وغیرہ کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا تھا اس کے خاندان میں سے بہرام شاہ نے بہت جاہ و جلال حاصل کیا، یہاں تک کہ سلطان قلیج ارسلان سلجوقی بادشاہ روم نے اسکو اپنی لڑکی بیاہ دی، بہرام شاہ نہایت فیاض اور بلند ہمت تھا، یہی بہرام، نظامی کا ممدوح ہے، جن کے نام پر انھوں نے مخزن الاسرار لکھی، (از ہفت اقلیم امین رازی)

مخزن کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا،

نظامی کا وطن گنجہ سلجوقیوں کی حدود حکومت میں واقع تھا، اور اس زمانہ میں اس سلسلہ میں سلطان طغرل بن ارسلان فرماں روا تھا، وہ نہایت دلیر، شجاع اور غزل پرور بادشاہ تھا، علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا، شعر و شاعری کا بھی مذاق تھا، چنانچہ یہ رباعی اسکی مشہور ہے،

دی روز چناں وصال جاں افروزی | وامروز چناں فراق عالم سوزی
حیف است کہ در دفتر عمرم ایام | آں را روزے نویسد ایں را روزی[1]

طغرل نے سلطنت کا تمام کاروبار اتابک محمد بن ایلدگز کے ہاتھ میں دیدیا تھا، جو ابتدا میں غلام تھا اور ترقی کرتے کرتے امیر الامراء کے منصب پر پہنچ گیا تھا، محمد ابن ایلدگز کا بھائی قزل ارسلان جس کی مدح میں ظہیر فاریابی کا یہ شعر مشہور رہی،

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے | تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

کاروبار سلطنت میں برابر کا شریک تھا،

اس زمانہ میں نظامی نے شیریں خسرو لکھنی شروع کی تھی، کتاب کا ابھی آغاز تھا کہ اس کے چرچے دور دور پھیل گئے، طغرل کو خبر ہوئی، اسی وقت فرمان بھیجا کہ ایسی کتاب لکھئے کہ یادگار رہجائے، چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں،

چو سلطان جہاں شاہ جواں بخت | کہ برخوردار باد از تاج و از تخت

---

[1] حبیب السیر،

بہ سلطانی بہ تاج و تخت پیوست	بجای ارسلان بر تخت بنشست
من ایں گنجینہ را دم می کشادم	بنای ایں عمارت می نہادم
اشارت رفتگی از درگاہ معمور	بہ شغل بندہ القاکر د منشور
کزیں نیساں تحفۂ عالی بسازد	کہ عقل از منش گردن فرازد

جس زمانہ میں نظامی یہ مثنوی لکھ رہے تھے، ان کے ایک دوست جو مذہب میں نہایت تعصب رکھتے تھے، ان کے پاس آئے اور نہایت ناراضی کے لہجہ میں کہا کہ کافروں کے جھوٹ سچ قصے لکھنے سے کیا فائدہ،

فسون بت پرستاں لنگن از مشت	فسوں خوانی مکن بر ژند زردشت
در توحید زن کاوازہ داری	چرا رسم مغاں را تازہ داری

لیکن نظامی نے جب مثنوی کے چند اشعار پڑھکر سنائے، تو انھوں نے بیساختہ کہا،

چنیں سحرے تو دانی ساز کردن	بتے با کعبۂ انباز کردن

شیریں خسرو جب انجام کو پہنچی تو محمد بن یلدگز جو درحقیقت تاج و تخت کا مالک تھا وفات کر چکا تھا، اور اس کا بھائی قزل ارسلان اس کا قائم مقام مقرر ہوا تھا اسکو شیریں خسرو کے تمام ہونے کی خبر پہنچی تو نظامی کی طلبی کا فرمان بھیجا، قاصد فرمان لیکر آیا، نظامی نے آداب شاہی کے مطابق فرمان کو پہلے سر پر رکھا، پھر تین جگہ بوسہ دیکر کھولا، چنانچہ شیریں خسرو کے خاتمہ میں خود فرماتے ہیں،

مثالِ شاہ را بر سر نہادم	سہ جا بوسیدم و سر بر کشادم

اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوئے، اور دشت و بیابان طے کرتے ہوئے قریبًا ایک مہینہ میں پائے تخت میں پہنچے، قاصد نے جاکر دربار میں اطلاع کی، قزل ارسلان نے شمس الدین محمد کو حکم دیا کہ خود جاکر ان کو ساتھ لائے، دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ مجلسِ عیش آراستہ ہے، ساز چھڑ رہے ہیں گانا ہو رہا ہے، بادہ و جام کا دور چل رہا ہے، قزل ارسلان نے فورًا ان کے ادب سے گانا بجانا بند کرا دیا، اور تخت سے اٹھکر تعظیم بجالایا، پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہر طرح کی باتیں ہوتی رہیں، بیچ بیچ میں بزرگانہ نصیحتیں بھی کرتے جاتے تھے، مدحیہ نظم لکھ کرے گئے تھے، اسکو سنانا چاہا، قاعدہ یہ تھا کہ شعرا اپنا کلام خود نہیں پڑھتے تھے، بلکہ کسی خوش لہجہ سے پڑھواتے تھے، جو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتا تھا اور اسکو راوی کہتے تھے، چنانچہ راوی نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا، یہ بھی دستور تھا کہ جب قصیدہ پڑھا جاتا تھا تو شاعر کھڑا ہو جاتا تھا، اور قصیدہ کے ختم ہونے تک کھڑا رہتا تھا، نظامی نے بھی اس قاعدہ کو بجالانا چاہا، لیکن قزل ارسلان نے قسم دلا کر منع کیا،

چو بر پا ایستادم گفت بنشیں　　　　به سوگندم نشاند ایں منزلت بیں

راوی نے مدح کے بعد شیریں خسرو کا قصہ شروع کیا، بادشاہ نظامی کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے نہایت شوق میں سن رہا تھا اور بار بار بیساختہ تحسین کرتا جاتا تھا، نظامی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے میرا نام زندہ کر دیا، اسکا صلہ دینا میرا فرض ہے، پھر پوچھا کہ بھائی صاحب (اتابک پہلوان محمد بن ایلدگز) نے آپ کی جاگیر میں جو دو گاؤں دیئے تھے، وہ آپ کو ملے یا نہیں، انھوں نے کہا،

بلے شاہ سعید از خاص خویشم | پذیرفت آنچہ فرمودی ز پیشم
چو رخت عمر او کشتی رواں کرد | مرا نے جملہ عالم را زیاں کرد

قزل ارسلان نے ایک گاؤں جس کا نام حمدونیاں تھا، اپنی طرف سے جاگیر میں دیا،[1]

معلوم نہیں، جان کر یا غلطی سے، گاؤں جو جاگیر میں دیا گیا وہ غیر آباد اور بنجر تھا، چنانچہ نظامی نے شیریں خسرو میں، اسکی شکایت اس تقریب سے کی ہے کہ حاسدوں نے مجھکو طعنہ دیا، میں نے جواب میں کہا کہ غیر آباد ہے تو کیا، بادشاہ کا عدل اس کو آباد کر دیگا،

نظامی کی شہرت اب اس قدر عالمگیر ہو گئی تھی کہ اور سلاطین کو بھی آرزو ہوئی کہ ان سے اپنے نام پر تصنیفات لکھوائیں کہ اس ذریعہ سے ان کا نام بھی یادگار رہجائے ان میں علم و فضل کی قدر دانی کے لحاظ سے سب سے ممتاز منوچہر خاقان کبیر جلال الدنیا والدین شاہ اخستان تھا جو سلاطین شروانیہ کے سلسلہ کا درۃ التاج تھا، یہ خاندان خالص ایرانی النسل یعنی بہرام چوبیں کی یادگار تھا، منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا، خاقانی ابو العلاء گنجوی (استاد خاقانی) ذو الفقار شروانی، شاہفور وغیرہ شعراء اسی کے خوان کرم کے زلہ خوار تھے، ابو العلاء گنجوی، اسی کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اور خاقانی کو افضل الشعراء کا خطاب اسی نے عنایت کیا، منوچہر نے اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھ کر بھیجا کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان نظم کیجئے، چنانچہ دیباچہ میں خود کہتے ہیں،

[1] یہ تمام حالات تفصیل کے ساتھ خود نظامی نے شیریں خسرو کے خاتمہ میں لکھے ہیں،

در حال رسید، قاصد از راہ	آورد مثال حضرت شاہ،
بنبشتہ بہ خط خوب خوشیم	دہ پانزدہ سطر نغز بیشم
کاے محرم حلقۂ غلامی	جادو سخن جہاں نظامی
خواہم کہ بہ یاد عشق مجنوں	گوئی سخنے چو دُر مکنوں

خط پہنچا تو نظامی کو تردد ہوا، اتفاق سے ان کے صاحبزادے محمد جن کی عمر اسوقت ۱۴ برس کی تھی، اس وقت موجود تھے، اُنھوں نے بھی تحریک کی، نظامی نے کہا جان قصہ کی شہرت میں کلام نہیں، لیکن جہاں کی سرگذشت ہے، وہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں، باغ وبہار چشمہ وسبزہ زار، رقص وسرود، شاہی دروبار، خیل وحشم، جاہ وجلال کسی چیز کا پتہ نہیں، خشک ریگ زار، اور کوہستان میں میں کیا صنعت گری دکھاؤں گا،

نے باغ ونہ بزم شہریاری	نے رود ونہ می نہ کامگاری
بر خشکی ریگ و سختی کوہ،	تا چند سخن رود در اندوہ

یہی بھید ہے کہ آجتک کسی نے اس قصہ کو ہاتھ نہیں لگایا، صاحبزادہ نے کہا یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسا موثر اور عجیب وغریب واقعہ نظم کی آرایش سے محروم رہجائے، غرض نظامی نے بادشاہی ارشاد کی تعمیل شروع کی، اور کچھ کم چار مہینے میں انجام کو پہنچائی، سالِ اتمام رجب ۵۸۴ھ ہے،

من گفتم ودل جواب می داد	خاریدم، و چشمہ آب می داد

این چار ہزار بیت واکثر — گفتم بہ چہار ماہ کمتر

گر شغل دگر حرام بودے — در چاردہ شب تمام بودے

تاریخ عیاں کہ داشت با خود — ہشتاد و چہار بود و پانصد (۵۸۴ھ)

نظامی نے اس مثنوی کے صلہ میں بادشاہ سے یہ خواہش کی کہ ان کے صاحبزادے ولیعہد سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کئے جائیں،

۱۴ر رمضان ۵۹۳ھ میں سلطان غیاث الدین کرپ[1] ارسلان علاء الدین آقسنقری کی فرمایش سے ہفت پیکر لکھی، جس میں بہرام گور کا قصہ ہے،

قزل ارسلان کے مرنے کے بعد، اس کا بھتیجا یعنی محمد بن ایلدگز کا فرزند ارجمند ابوبکر نصرۃ الدین [illegible]ھ میں مسند آرا ہوا، نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا اس وقت تک اُنھوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، سلاطین وقت کی فرمایش سے لکھی تھیں، لیکن سکندرنامہ اپنی خواہش سے لکھا، اور ابوبکر نصرۃ الدین کے نام سے موسوم کیا، یہ کتاب ۵۹۹ھ میں انجام کو پہنچی، چنانچہ خود سکندرنامہ بحری کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،

بپایاں شد این داستان دری — بہ فیروز فالی و نیک اختری

زہجرت چناں بر دہم یادگار — نود نہ گزشتہ ز پانصد شمار

کتاب لکھکر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، تو مقررہ رقم کے علاوہ سواری کا گھوڑا بیش قیمت کپڑے، خلعت وغیرہ عطا ہوا[2]،

[1] اسکا حال نہ معلوم ہو سکا [2] سکندرنامہ بحری کے خاتمہ میں یہ تصریح ہو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اساتذہ سے میں نے سنا ہے کہ سلاطین وقت نظامی کی اسقدر عزت کرتے تھے، کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی، ان کے بیٹے سے بیاہ دی تھی، میں نے کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں دیکھا، لیکن سکندر نامہ بحری کے خاتمہ سے اس قدر بہ تصریح ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے اپنی صاحبزادی اور اپنے فرزند محمد کو، نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا، چنانچہ کہتے ہیں،

دو گوہر برآمد ز دریاے من	فروزندہ از روی شان راے من
یکے عصمت مریم یافتہ	یکے نور عیسیٰ بروتافتہ
فرستادہ ام ہر دو را نزد شاہ	کہ یاقوت را درج دارد نگاہ
عروسے کہ دور از مادر بود	بہ از پردہ دارش برادر بود
بباید چو آید بہ شہریار	چنیں پردگی را چناں پردہ دار
چو من نزل خاص تو جا دادہ ام	جگر نیز با جان فرستادہ ام

آخیر شعر سے صاف یہ راز کھل جاتا ہے،

اس کتاب کی تصنیف کے وقت اُنکی عمر ۶۳ برس کی تھی، چنانچہ جہاں اور حکما کے مرنے کا الگ الگ عنوان قائم کیا ہے، اپنے نام کی بھی سرخی قائم کی ہے، اسکے ذیل میں لکھتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۹) لیکن تعجب ہے کہ نقد رقم صرف ہزار لکھی ہے، اگر یہ ہزار دینار بھی فرض کر لیے جائیں تب بھی ایسی رقم ہے جو نہ نظامی کے شایان ہے، نہ ایک مشرقی بادشاہ کے چہرے پر کھلتی ہے،

نظامی چو این داستان شد تمام — بہ عزم شدن تیز برداشت گام

فزون بود شش نہ شصت و سہ سال — کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال

اس کتاب پر انکی شاعری اور عمر دونوں کا خاتمہ ہوا، سالِ وفات میں سخت اختلاف ہے، دولت شاہ میں ۵۹۹ھ لکھا ہی، لیکن یہ خود نظامی کی تصریح کے خلاف ہی، تقی کاشی نے ۶۰۶ھ لکھا ہے، جامی ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں، لیکن اس قدر قطعی ہی کہ ۵۹۹ھ کے بعد اُن کی وفات ہوئی ہی اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے،

چونکہ انھوں نے تمام عمر گوشۂ عزلت سے قدم نہیں نکالا، نہ لوگوں سے زیادہ ملتے جلتے تھے، اسلئے ان کی زندگی کے حالات و واقعات بہت کم معلوم ہیں، عام تذکرہ نویس، ان کے اس وصف کے نہایت مداح ہیں کہ وہ بادشاہوں کی خوشامد اور درباداری سے بالکل پاک تھے، البتہ جو سلاطین ان کے ساتھ ارادت و اعتقاد کیساتھ پیش آتے تھے، ان پر بزرگانہ عنایت کرتے تھے، لیکن انکی کتابوں میں سلاطین کی جو مدحیں ہیں ان میں وہی حد سے زیادہ مبالغہ، خوشامد اور تملق ہی جو عام مداحوں کا انداز ہی، اس سے بڑھکر یہ کہ جس بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں اسطرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہی کہ ان کو اسکے سوا، کسی دربار سے تعلق نہیں، اور وہ اسکو فرمانروائے عالم سمجھتے ہیں، بے شبہ انھوں نے مدحیہ قصائد نہیں لکھے لیکن مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں، ملاحظہ ہو،

ولایت ستان گیتی پناہ — فریدون کمر ملکہ خاقان کلاہ

ستارہ کہ بہ چرخ ساید سرش | نہ دہ سکۂ عبدہٗ بہ درش
چو تیر از کمانِ کمیں افگند | سرِ آسماں بر زمیں افگند
فرنگ و فلسطینؔ رہبانؔ و م | پذیرا ئے فرمان مہرش چو موم

اس سے زیادہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ بادشاہوں کے سامنے اپنے آپکو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں، وہی ہوتی ہے جو گداپیشہ شاعروں کا انداز ہے، یعنی حضور کا نمک خوار ہوں، غلام ہوں، بندۂ درگاہ ہوں، حضور کی ذراسی توجہ سے میرے سارے کام بنجائیں گے، حضور ہی میری مشکلوں کو حل کر سکتے ہیں،

کلام | پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے، دولت شاہ کا بیان ہے کہ اس میں غزلیں، موشحات اور صنائع کے بیس ہزار شعر تھے، تذکروں میں چند قصائد، قطعات اور غزل کے جستہ جستہ اشعار پائے جاتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انہی کی بدولت وجود میں آئیں، لیکن غزلیں پھیکی اور بے مزہ ہیں، ملاحظہ ہو،

خوشا جانے کزو جانے بیاسود | نہ درویشے کہ سلطانے بیاسود
نکوئی بہ نکو روئے بماناد | کہ از لبہاش دندانے بیاسود
بہ عمر خود پریشانی مبیناد | دلے کز وے پریشانے بیاسود

مرا گوئی کہ چونی؟ چونم اے دوست | جگر پُر درد دل پُر خونم اے دوست
شنیدم عاشقاں را مے نوازی | مگر من زاں میاں بیرونم اے دوست

پیش تو کردہ ام عیان حال تباہ خویش را | تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہ خویش را
سر زنشم مکن کہ تو شیفتہ تر زمن شوی | گر نگری در آئینہ روے چو ماہ خویش را

خلقی جمالی اے مہ زحبش چہ نام داری | تو بجز خطے وخالے زحبش کدام داری
حبشی منم بہ درتن ہمہ سوختست خونم | ختنی توئی کہ در بر ہمہ سیم خام داری
حبشی است رنگ رویت ختنی ست رنگ رویت | تو میان این دو کشور بہ کجا مقام داری
حبشی سفید نبود، ختنی نمک ندارد | تو بغایت سفیدی نمکے تمام داری

انہی بوڑھے غزلوں میں، کبھی کبھی بڑے شوخ جملے بھی زبان سے نکل جاتے ہیں،

بوسہ می خواہم ازاں لب تو چہ می فرمائی | گر صوابست بگو ورنہ خطائے بکنم
میں لب کا ایک بوسہ چاہتا ہوں کیا رائے ہے | مناسب ہو تو بہتر، ورنہ نامناسب ہی کیا جائے

قصیدے بہت ہیں، لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں، سنائی کا انداز ہے، اخلاق اور تصوف کو ترکیب دیکر کہتے ہیں، لیکن سنائی سے بہت پیچھے ہیں، اس لیے مقبول نہ ہو سکے، البتہ ایک قطعہ نہایت صاف، شستہ اور پر لطف کہا ہے، جس کا آج تک جواب نہ ہو سکا،

دوش رفتم بہ خرابات و مرا راہ نبود | می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نہ بد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار | یا کہ من ہیچ کسم ہیچ کسم در نکشود
پاسے از شب بگذشت بیشتر یا کمتر | رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است! دریں وقت کرا میخواہی | بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود

گفتمش در بکشا، گفت برو ہرزہ مگوی — کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود

ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند — کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود

ایں خرابات مغان ست درو زندہ اند — شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود

ہرچہ در جملۂ آفاق در ینجا حاضر — مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود

گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشان بزنی — خاک پاے ہمہ شو تاکہ بیابی مقصود

عصمت بخاری اور عرفی نے قوافی بدل کر اس کا جواب لکھا ہے، لیکن جواب نہ ہو سکا، عصمت کا قطعہ یہ ہے،

سرخوش از کوی خرابات گذر کردم دوش — بہ طلب گاری ترسابچۂ بادہ فروش

پیشم آمد بہ سر کوچہ پری رخسارے — کافرے عشوہ گرے زلف چو زنار بدوش

گفتم ایں کوی چہ کوی است ترا خانہ کجاست — اے مہ نو خم ابروی ترا حلقہ بگوش

گفت تسبیح بہ خاک افگن و زنار بہ بند — سنگ بر شیشۂ تقوی زن و پیمانہ بنوش

بعد ازاں پیش من آتا بتو گویم سخنے — راہ بنمایم اگر بر سخنم داری گوش

دیں برافگندہ و مدہوش دویدم در پیش — تا رسیدم بہ مقامے کہ نہ دیں ماند و نہ ہوش

دیدم از دور گروہے ہمہ دیوانہ و مست — از خم بادۂ عشق آمدہ در جوش و خروش

بے می و مطرب و ساقی ہمہ در عیش و سرود — بے می و جام و صراحی ہمہ در نوشا نوش

چوں سر رشتۂ ناموس برفت از دستم — خواستم تا سخنے پرسم ازو گفت خموش

ایں نہ کعبہ است کہ بے پا و سر آئی بہ طواف — ویں نہ مسجد کہ چنیں بے ادب آئی بخروش

ایں خرابات مغان است و درو مدآنہ — از دم صبح ازل تا بقیامت مدہوش

قصیدہ میں ان کی یہ خصوصیت لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ان کو مختلف درباروں سے تعلق تھا، اور جس قدر مثنویاں لکھیں سب کسی نہ کسی فرماں روا کے نام پر لکھیں، تاہم قصیدہ کو انھوں نے مداحی سے آزاد رکھا، اور یہ بتایا کہ شعر کی اس عمدہ صنف سے اور بھی مفید کام لیے جا سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر کوئی نہ چلا، قصیدے اس وقت سے آج تک خوشامد کی طرز میں ادا کیے جاتے ہیں،

نظامی کی شاعری

نظامی نے شاعری کو جس طرح ترقی دی اور جو باتیں اس میں پیدا کیں ان کو ہم تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں، لیکن پہلے ان سب کو اجمالاً لکھ دینا چاہیے تاکہ یکجائی طور سے سب باتیں پیشِ نظر ہو جائیں، ان کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں،

(۱) جامعیت، یعنی شاعری کی ہر صنف کو انھوں نے ترقی دی،

(۲) زورِ کلام،

(۳) بلاغت

(۴) جدتِ استعارات اور تشبیہات

(۵) ایجاد و اختراع اور قوتِ تخیل،

(۶) اولیات یعنی بہت سی باتیں اول انہی نے ایجاد کیں،

اب ہم ایک ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں،

جامعیت | ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں وہ خاص خاص انواعِ شاعری میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی رزم کا مرد میدان ہے، عشقیہ شاعری میں اسکو کمال نہیں، سعدی اخلاقی اور عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہیں، لیکن رزم میں پھیکے ہیں، چنانچہ سکندر نامہ کی طرز پر شاطر اصفہانی کی جو حکایت بوستان میں لکھی ہے، اگرچہ اس میں اپنا پورا زور صرف کر دیا ہے، لیکن وہ بوڑھاپن نہیں جاتا، ایک مصرع نہایت زور شور کا ہے، دوسرے ہی دفعۃً پست ہو جاتے ہیں، خیام صرف فلسفہ لکھ سکتا ہے، حافظ صرف غزل لکھ سکتے ہیں، بخلاف اس کے نظامی نے رزم، بزم، فلسفہ، عشق، اخلاق سب کچھ لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے، لاجواب لکھا ہے، البتہ مدح ان سے نہیں بن پڑتی، لیکن مدح کوئی شاعری نہیں، شاعر بھاٹ نہ ہو تو اسکی شاعری میں کیا نقص ہے،

نظامی کی انواعِ شاعری پر الگ الگ بحث آگے آتی ہے،

اولیات، نظامی بہت سی باتوں کے موجد ہیں،

مثلاً سب سے پہلے انہی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں، جسکی تقلید اس وقت سے آج تک تمام بڑے بڑے شعرا کرتے آئے ہیں، چنانچہ اُن کے خمسہ پر تمام اکابر شعرا نے خمسہ لکھا ہے،

مخزن اسرار اور ہفت پیکر کی بحر کو اول انہی نے مثنوی میں داخل کیا،

سب سے پہلے انہی نے ایک مثنوی (مخزن اسرار) میں پانچ نعتیں لکھیں اور

ہر ایک کا جدا رنگ ہے،

سب سے پہلے انہی نے فلسفیانہ مباحث کو نظم کیا،

سب سے پہلے انہی نے ساقی نامہ کا خاکہ قائم کیا،

سب سے پہلے انہی نے قصیدہ کو مدح سے پاک کیا،

زور کلام نظامی سے پہلے شعرا کا کلام، صفائی، سادگی، شستگی تک محدود رہا تھا اور انہی چیزوں کے کمال سے شاعری کے کمال کا اندازہ کیا جاتا تھا، نظامی پہلے شخص ہیں، جس نے ترکیبوں میں چستی اور کلام میں زور، بلندی اور شان و شوکت پیدا کی، عرفی اور ابوالفضل کی نظم و نثر کا زور مشہور ہے، مگر دونوں پر نظامی ہی کا ہے، یہانتک کہ طغرا نے کہدیا کہ ابوالفضل نے سکندر نامہ ہی کو لیکر نثر کر دیا ہے،

فردوسی کے زمانہ تک روزمرہ اور بول چال کی زبان خالص فارسی تھی، چنانچہ مثنویوں کی زبان وہی رہی، البتہ قصائد میں جس سے لفاظی اور علمی قابلیت کا اظہار بھی مقصود ہوتا تھا، عربی الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے شامل ہو جاتی تھیں یہانتک کہ علوم عربیت کے گھر گھر پھیل جانے سے روزمرہ کی زبان بھی وہی مخلوط العربیۃ فارسی ہو گئی، اب عربی الفاظ کا جدا کرنا، فارسی زبان کا بدمزہ اور بے اثر کر دینا تھا، اسلئے نظامی نے اس باب میں فردوسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ اسی زبان کو لیا جو ملک اور قوم کی عام زبان تھی، لیکن ان کی نکتہ سنجی یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے جو لفظ انکے ہاں آتے ہیں وہ ہوتے ہیں کہ اس کا ہم معنی کوئی لفظ اس انداز اور شان و شوکت کا تمام زبان میں نہیں

مل سکتا، یہی بات ہے کہ ان کے کسی مضمون کو جب کوئی شاعر اپنے لفظوں میں ادا کرنا چاہتا ہے، تو وہ شان قائم نہیں رہتی، مثلاً اُن کا یہ شعر کمند کی تعریف میں ہے،

کمند اژدہاے مسلسل شکنج　　　دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

سعدی اسی مضمون کو لیکر یوں تصرف کرتے ہیں،

کمند اژدہاے دہن کردہ باز　　　بہ صید ہژبراں پرخاش ساز

دونوں کے مضمون اور معنی میں جو فرق ہے، اس سے یہاں بحث نہیں، لیکن الفاظ کی ساخت اور ترکیب پر غور کرو، کس قدر فرق ہے، مسلسل شکنج، تاراج، گنج، یہ الفاظ اور انکی پرزور ترکیب، سعدی کے ہاں کہاں ہے،

فردوسی، سعدی اور نظامی کے ہاں جو مضامین مشترک ہیں، اُن کا باہم موازنہ کرو، بلاغت سے قطع نظر، الفاظ کی شکوہ شان اور ترکیبوں کی چستی اور نظم ونسق میں نظامی کا کلام علانیہ ممتاز نظر آئیگا، نمونہ کے لئے ہم صرف دو ایک مثالیں درج کرتے ہیں،

فردوسی خدا کی ذات اور عالم غیر عنصری کے ادراک کی حد سے خارج ہونے کو اس طرح ادا کرتا ہے،

نیابد بدو نیز اندیشہ راہ　　　کہ او برتر از نام واز جایگاہ

سخن ہرچہ زیں گوہراں بگذرد　　　نیابد بدو راہ جان وخرد

ازیں پردہ برتر سخن گاہ نیست　　　بہ ہستیش اندیشہ را راہ نیست

نظامی اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں،

اساسے کہ در آسمان و زمی است	بہ اندازۂ فکرت آدمی است
شو و فکرت اندازہ را رہنموں	سر از حد اندازہ نارد بروں
بہر پایۂ دست چنداں رسد	کہ آں پایہ را حد بپایاں رسد
چو پایاں پذیرد حد کائنات	نماند در اندیشہ دیگر جہات
نیندیشد اندیشہ افزوں ازیں	کہ ہستی نہ، بلکہ بیروں ازیں

اسی مضمون کے قریب قریب یہ اشعار ہیں،

چناں برکشیدی و بستی نگار	کہ بہ زاں نیارد خرد در شمار
چناں بستی ایں طاق نیلوفری	کہ اندیشہ رانیست زو برتری
چناں آفریدی زمین و زماں	ہماں گردش انجم و آسماں
کہ چنداں کہ اندیشہ گردد بلند،	سر خود بروں نا ورد زیں کمند

شاید تمکو خیال ہو کہ فردوسی کے بہت سے الفاظ، اب نامانوس ہیں، نظامی ان کے بجائے متداول الفاظ لاتے ہیں، اس کے سوا نظامی کو یہ موقع حاصل ہے کہ جہاں فارسی الفاظ سے شان و شکوہ نہ پیدا ہو سکے، وہاں عربی الفاظ سے کام لیں، فردوسی اپنے التزام کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، نظامی جہاں خود فردوسی کی بولی بولتے ہیں، وہاں بھی یہ فرق قائم رہتا ہے، عناصر کی ابتدا اور ان کی ترکیب کو دونوں نے لکھا ہے اور خالص سادہ فارسی میں لکھا ہے، فردوسی

از آغاز باید کہ دانی درست	سر مایۂ گوہراں از نخست

یکے آتشے برشدہ تابناک ‏ میان باد و آب از بر تیرہ خاک
نخستیں کہ آتش ز جنبش دمید ‏ ز گرمیش پس خشکی آمد پدید
وزاں پس ز آرام سردی نمود ‏ ز سردی ہماں باز تری فزود
چو ایں چار گوہر بجائے آمدند ‏ ز بہر سپنجی سرائے آمدند
گہر ہا یک اندر دگر ساختہ ‏ ز ہر گونہ گردن بر افراختہ

یعنی عناصر (گوہر) کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلے آگ بلندی پر پیدا ہوئی، اسکے پیچھے ہوا پھر پانی، پھر خاک، آگ حرکت سے پیدا ہوئی، اسکی حرارت کی وجہ سے یبوست پیدا ہوئی پھر سکون کی وجہ سے برودت کا وجود ہوا، برودت نے رطوبت پیدا کی، یہ عناصر باہم ترکیب پاکر عالم بنا، **نظامی**

ز گشت سپہر آتش آمد پدید ‏ کہ آتش بہ نیروی گردش دمید
ز نیروے آتش ہواے کشاد ‏ کہ مانند او گرم دارد نہاد
بہ باد ے گرائیدہ شد گوہرش ‏ کہ گردندگی دور بود از برش
چکید از ہوا تر ے در مغاک ‏ پدید آمد آبے چناں نغز و پاک
چو ہر چار گوہر بہ امر خدائے ‏ گرفتند بر مرکز خویش جائے
مزاج ہمہ در ہم آمیختند ‏ وز و رستنہا بر انگیختند

ان اشعار میں امر، مرکز، مزاج کے سوا باقی تمام الفاظ فارسی ہیں، لیکن فردوسی کے الفاظ اور ترکیب الفاظ میں وہ بلندی اور شان نہیں جو نظامی کے ہاں ہے، گشت سپہر، نیرو،

نہاد، گرایندہ، گردندگی، مغاک، مغز، ان الفاظ اور ان کی حسنِ ترکیب نے جو بات پیدا کی
مذاقِ صحیح اس کا اندازہ کر سکتا ہے،

اسی مضمون کو ایک اور جگہ لکھا ہے،

نخستیں طلسمے کہ پرداختند	زمیں بود و ترکیب ازو ساختند
چو نیروی جنبش در دکرد کار	بافسردگی زود آمد بکار
ازو ہر چہ رخشندہ و پاک بود	سزاوار اجرامِ افلاک بود
دگر بخشہا کاں بلندی نداشت	بہر مرکزے مایۂ می گذاشت
یکے بخش ازو آتشِ روشن است	کہ بالا تریں طاقِ ایں گلشن است
دگر بخش ازو باد جنبندہ خواست	کہ تا او نہ جنبد نداند کواست
سوم بخش ازو آب راوق پذیر	کہ ہستش ز راوق گری ناگزیر

ان اشعار میں اکثر فلسفیانہ اصطلاحات کو عربی کے بجائے فارسی میں ادا کیا ہے۔ مثلاً

عربی	فارسی	عربی	فارسی
قوتِ حرکۃ	نیروی جنبش	قسر	افسردگی
نوع	بخش	مادہ	مایہ
متحرک بالطبع	جنبندہ خو	سیال	راوق پذیر

نظامی کے اشعار کا سعدی سے مقابلہ کرو، تو یہ فرق اور واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً نظامی
انقلاباتِ زمانہ اور واقعاتِ عالم کی عبرت انگیزی کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

فلک بر بلندی، زمیں بر مغاک | یکے طشت خوں شد یکے طشت خاک
نوشتہ بریں ہر دو آلودہ طشت | زخونِ سیاوش بسے سرنوشت

سعدی اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں،

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک | بگوش آمدم نالۂ دردناک،
کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر | کہ چشم و بنا گوش و روی است و سر
جوانی شد و زندگانی نماند | جہاں گوہماں چوں جوانی نماند

عہدِ شباب کی حسرت کو دونوں نے لکھا ہے، نظامی کہتے ہیں،

چو بادِ خزانی در اُفتد بہ باغ | زمانہ دہد جائے بلبل بہ زاغ
بود برگ ریزاں چو شاخِ بلند | دلِ باغبان زاں شود دردمند
بنال اے کہن بلبلِ سال خورد | کہ رخسارۂ سرخ گل گشت زرد
دو تا شد سہی سروِ آراستہ | کدور شد از باغ بر خاستہ
فرو ماند دستم زمے خواستن | گراں گشت پایم ز برخاستن
تنم گونۂ لاجوردی گرفت | گلم سرخی انداخت زردی گرفت
ہمیوں روندہ زرہ ماند باز | بیا لیں گہ آمد سرم را نیاز

سعدی لکھتے ہیں،

چو بادِ صبا بر گلستاں وزد | چمیدن درختِ جواں را سزد
نزیبد مرا با جواناں چمید، | کہ بر عارضم صبحِ پیری دمید

شمارست نوبت بریں خواں نشست | کہ ما از سخنم بشستیم دست
گل سرخ ما وہم نگر زرد ناب | فرورفت چوں زرد شد آفتاب
گلستان ما را طراوت گذشت | کہ گلدستہ بند وچو پژمردہ گشت

قوت تخیل | شاعری کے تمام نازک اور مشکل مقامات میں ان کی جدت اور اختراع کی عجیب وغریب صناعیاں نظر آتی ہیں، قصہ کے خاکے کھینچنے میں، ترتیب واقعات میں، تمہید میں، واقعہ نگاری میں، بندشِ مضامین میں، تشبیہات میں، استعارات میں، مبالغوں میں ہر جگہ نیا انداز نظر آتا ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُنکی قوتِ تخیل (امیجنیشن) کس قدر قوی اور زبردست ہے،

بادشاہ کی مدح لکھتے ہیں، اور یہ تمہید اُٹھاتے ہیں،

علم برکش اے آفتاب بلند | خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دُہلِ رعد چوں کوسِ شاہ | بخند اے لب برق چوں صبحگاہ
ببار اے ہوا قطرۂ ناب را | بگیر اے صدف در کُن آں آب را
برآ اے دُر از قعر دریاے خویش | بہ تاجِ سرِ شاہ کن جاے خویش

قدیم خیال یہ تھا کہ آفتاب کی گرمی سے بخارات پیدا ہوتے ہیں، اس سے بادل پیدا ہوتے ہیں، بادل برستا ہے، تو سیپ کے منہ میں جو قطرے پڑتے ہیں، موتی بنجاتے ہیں، ان خیالات کی بنا پر نظامی کہتے ہیں،

او آفتاب، علم اُٹھا، او سیہ پوش بادل، آہستہ آہستہ چل،

اور رعد نقارۂ شاہی کی طرح کڑک، اور بجلی صبح کی طرح ہنس، اور ہوا قطرے برسا، اور سیپ قطرہ کو لیکر موتی بنا، اور موتی دریا کی تہ سے نکل، اور نکل کر بادشاہ کے تاج پر جگہ لے،

بات اتنی تھی کہ بادشاہ کا تاج جواہر نگار ہے، لیکن شاعر کو قوتِ تخئیل کے ذریعہ سے یہی بات اس صورت میں نظر آتی ہے کہ عالم کا تمام کاروبار صرف بادشاہ کی اوج دشان بڑھانے کے لئے ہے، اسکی قوتِ خیالیہ اس سے بھی آگے بڑھتی ہے، ممدوح کے بل پر اسکو تمام عالم اپنا محکوم نظر آتا ہے، اور وہ حکمانہ انداز سے آفتاب، بادل، رعد، برق اور ہوا کو حکم دیتا ہے کہ اپنے اپنے کام انجام دیکر موتی تیار کرو تاکہ بادشاہ کے تاج پر ٹانکے جائیں، اس کے ساتھ انداز بیان کے زور الفاظ کی شوکت اندش کی دروبست کو دیکھو کہ طلسم کا عالم نظر آتا ہے، پھر خیال کرو کہ ایک ایک مختلف حالت کو کس طرح صرف ایک ایک مصرع میں کھپا دیا ہے،

مثال ۲ ۔ سکندر نامہ میں متعدد جگہ آفتاب کے غروب اور طلوع کو بیان واقعہ کی حیثیت سے لکھا ہے لیکن ہر جگہ ایک نیا پیرایہ قائم کیا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں،

چو یاقوت خورشید را دزد برد	بہ یاقوت جستن جہاں پے فشرد
بہ دزدی گرفتند مہتاب را	کہ ایں بردآں گوہر ناب را

یعنی جب آفتاب کا یاقوت چوری گیا تو زمانہ نے یاقوت کے ڈھونڈھنے کیلئے دوڑ دھوپ شروع کی، آخر چاند کو جاکر پکڑا کہ اُس نے یہ جوہر چرایا ہے، چونکہ آفتاب کے غروب کے

بعد چاند نکلتا ہے، اس لئے اسکو چور قرار دیا،

کہ چوں آتش روز روشن گذشت   برآمد دود و شد گنبد تیز گشت

شب از ماہ بر بست پیرایۂ   شگفتے بود نور در سایۂ،

یعنی جب دن کی آگ بجھ گئی تو دھواں اُٹھا (یعنی رات) اور گنبد (آسمان) میں بھر گیا، رات نے چاند کا زیور پہنا، لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ سایہ میں نور نظر آتا ہے.

دگر روز کیں ساقیِ صبح خیز   زمی کرد بر خاک، یاقوت ریز

چو خورشید بر زد سر از گنج نیل   فروشست (یعنی دھوپ) گردوں قبار از نیل

چو در برقع کوہ رفت آفتاب   سر روز روشن، فرو شد بخواب

شب تیرہ چوں اژدہاے سیاہ   ز ماہی بر آورد سر سوے ماہ

سیہ کرد بر شبروان راہ را   فرو برد چوں اژدہا ماہ را

سیاہِ سحر چوں علم بر کشید   جہاں، حرفِ شب اقلم در کشید

چو سلطانِ شب، چتر بر سر گرفت   سوادِ جہاں را ہ عنبر گرفت

ستارہ چناں گنجے از زر فشاند   کہ مہد زمیں گاؤ بر گنج راند

کہ چوں شاہ چین بت صبح را بار داد   عروس مدائن در بہ دینار داد

چو شب در سر آورد کحلی پرند   (رات / ستارہ / آفتاب) سر مہ در آمد بہ مشکیں کمند

استعارات اور تشبیہات نظامی کی خصوصیات شاعری میں نمایاں خصوصیت استعارات اور تشبیہات کی جدت ہے، استعارہ اور تشبیہ اگر صرف حسنِ کلام اور تفنن

طبع کے کام آئے تو وہ کوئی بڑی چیز نہیں لیکن بعض استعارے یا تشبیہات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر اصل مضمون پر پڑتا ہے یعنی مضمون کا زور بڑھ جاتا ہے، جو بات صفحوں میں ادا ہو سکتی ہے، ایک لفظ سے ادا ہو جاتی ہی، صورتِ واقعہ کی تصویر اسطرح سامنے آجاتی ہے، کہ کسی اور طرح سے نہیں آسکتی تھی، اس قسم کے استعارات اور تشبیہیں اور شعراکے ہاں بہت کم پائی جاتی ہیں، لیکن نظامی کا کلام ان سے بھرا پڑا ہی، مثلاً دارا جب زخم کھا کر گرا ہی اس موقع پر اس واقعہ کو یوں ادا کرتے ہیں،

نسب نامۂ دولتِ کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے بُرد باد

دارا سلسلۂ کیانی کا اخیر فرماں روا تھا، اور اس کے مرنے سے گویا، اس عظیم الشان خاندان کی تاریخ مٹ گئی، اس مضمون کو تشبیہ نے کس قدر موثر اور بلند کر دیا، دارا کو خاندان کیانی کا نسب نامہ کہا یعنی جس طرح نسب نامہ میں تمام خاندان کے نام درج ہوتے ہیں دارا کا وجود گویا تمام خاندان کا وجود ہے، اور اس کے دیکھنے سے کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس سب کی مجموعی عظمت و شوکت آنکھوں میں پھر جاتی ہی، پھر اس کے مرنے کو یوں بیان کیا کہ نسب نامہ کیانی کا ایک ایک ورق اڑ گیا، اسی مضمون کو ایک اور تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کیا ہی،

بہار فریدون و گلزار جم زباد خزاں گشت تاراجِ غم

سکندر نے جب دارا کی سسکتی لاش کو اپنے زانو پر رکھ لیا ہی اس موقع پر کہتے ہیں،

سپہر خستہ را بر سر ران نہاد شبِ تیرہ بر روز رخشاں نہاد

سکندر نے جب دارا کو گستاخانہ جواب لکھا ہی تو دارا کہتا ہی،

ازاں ابرِ عاصی چناں ریزم آب	کہ نارو دگر دست بر آفتاب
اس سرکش بادل کو اسطرح نچوڑ دونگا	کہ پھر آفتاب پر ہاتھ نہ بڑھا سکے

سکندر نے جب ایک حبشی سردار پر حملہ کیا ہو تو حملہ کی تیزی اور زور کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

بہ کبک دری چوں؟ درآید عقاب	چگونہ؟ جہد بر زمیں آفتاب
ازاں تیز تر خسرو پیلتن	بہ تندی در آمد بہ آں اہرمن

آفتاب سورج کو بھی کہتے ہیں، اور دھوپ کو بھی، اس موقع پر بلاغت کے انداز کو دیکھو تشبیہ سے ابتدا نہیں کی، بلکہ مخاطب سے کہتے ہیں، کہ تم کو خیال ہو کہ عقاب چکور پر کیونکر گرتا ہی، دھوپ کس طرح زمین پر دفعتہً چھا جاتی ہے؟ اس سے مقصد یہ ہو کہ پہلے مخاطب کے ذہن میں اچھی طرح یہ سماں قائم ہو جائے، پھر کہتے ہیں "اس سے بھی زیادہ تیزی اور زور کے ساتھ سکندر نے اس دیو پر حملہ کیا"۔ حملہ کی خاص حالت سے قطع نظر کر کے سکندر کو آفتاب اور حریف کو زمین سے تشبیہ دینا، یوں بھی موزوں تھا، تشبیہ مرکب نے اس لطف کو اور دوبالا کر دیا،

سکندر نے جب ایک روسی پہلوان پر کمند پھینکی ہے، اس موقع پر کہتے ہیں،

کمند عدو بند را شہریار | بینداخت چوں چنبرِ روزگار

کنایہ تھا کہ سکندر نے اس طرح کمند پھینکی کہ حریف کسی طرح اس سے بچ نہیں سکتا تھا، اس مضمون کو چنبرِ روزگار کی تشبیہ نے کس قدر پر زور کر دیا،

رسول اللہ صلعم نے جب خسرو پرویز کو خط لکھا ہے تو خط میں عرب کی رسم کے مطابق اپنا نام خسرو کے نام سے پہلے لکھا تھا، خسرو نے خط کھولا تو چونکہ ایران میں بادشاہ کا نام عموماً تمام تحریروں میں پیشانی پر لکھا جاتا تھا، رسول اللہ صلعم کا نام سرنامہ میں دیکھکر خسرو سخت جھلا اٹھا، اور خط کو پرزے پرزے کرکے پھینکدیا، اس موقع کو نظامی نے شیرین خسرو میں جہاں لکھا ہی خسرو کی جھلاہٹ اور برہمی کو اس طرح تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کرتے ہیں،

چوں عنواں گاہِ عالم تاب را دید | تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید

دیوانہ کتا جب کسی کو کاٹ کھاتا ہی، تو سگ گزیدہ پانی کو دیکھکر بڑے زور سے جھجکتا ہی،

اب تشبیہ کے تمام اجزا پر خیال کرو، رسول اللہ صلعم کا خط آب شیرین ہی، خسرو نے چونکہ رسول اللہ صلعم کے خط سے بے ادبی کی ہی، اسلئے شاعر اسکو سگ نجس سمجھتا ہے، فوری اور شدت کی جھلاہٹ، سگ گزیدہ کی اس مخصوص حالت سے بڑھکر نہیں ہو سکتی، ان سب باتوں کو پیش نظر رکھو، تو نظر آئیگا، کہ یہ مضمون جس طرح اس تشبیہ سے ادا ہو سکتا تھا اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا تھا،

قدما اور متاخرین کی خصوصیات جدا جدا ہیں اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ گو قدما کی متانت، پختگی، جزالت کے مقابلہ میں متاخرین کا کلام سبک معلوم ہوتا ہی، تاہم متاخرین کی بعض بعض خصوصیتیں اس قابل ہیں کہ اُن پر رشک کیا جائے، ان میں ایک تشبیہات کی لطافت اور استعارات کی نزاکت ہے، قدما آس پاس کی چیز دل سے

سادہ سادہ تشبیہیں پیدا کرتے تھے، استعارے بھی سادے اور سہل المأخذ ہوتے تھے لیکن متاخرین کے زمانہ میں تمدن بہت ترقی کر گیا تھا، اسلئے انسانی احساسات نازک اور لطیف ہو گئے تھے، اس بنا پر اب قدما کی تشبیہیں بے مزہ ہو گئی تھیں اس کو مادیات کے ذریعہ سے یوں سمجھو کہ جب کسی قوم کا تمدن، ابتدائی حالت میں ہوتا ہے تو وہ نہایت تیز اور کرخت خوشبو کو پسند کرتی ہے، اور کم درجہ کی خوشبو کو اس کا دماغ اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتا، یہی سبب ہے کہ عرب مشک اور عنبر اور ہندو تلسی اور ناز بو کی خوشبو پسند کرتے تھے، لیکن آج چونکہ ہر چیز میں لطافت پیدا ہو گئی ہے، مشک اور تلسی کی خوشبو سے بعض وقت دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے، اب گلاب اور کیوڑہ کا عطر درکار ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھکر انگریزی عطر محبوب ہے، جو اس قدر لطیف ہوتا ہے کہ عام آدمیوں کو اسکی خوشبو محسوس بھی نہیں ہوتی، استعارہ اور تشبیہ کا بھی یہی حال ہے استعارہ اور تشبیہ کی یہ لطافت، متاخرین کا خاصہ ہے، مثلاً قدما معشوق کے چہرہ کو آفتاب سے اور اسکی ہنسی کو خندۂ صبح سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن متاخرین کے مذاق میں ایک شاعر کہتا ہے، ع صبح زخورشید رخت خندہ،

یعنی معشوق کا چہرہ ہنسا تو صبح پیدا ہو گئی، یعنی صبح خود معشوق کی ہنسی کا نام ہے،

استعارہ اور تشبیہ کی اس لطافت اور نزاکت کے موجد نظامی ہیں، انھوں نے اس کثرت سے نازک اور لطیف استعارے اور تشبیہیں پیدا کیں، کہ متاخرین میں سے بھی کسی ایک شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

بہ باغ شعلہ در، دہقان انگشت　　بنفشہ می درو و لالہ می کشت

کہنا یہ تھا کہ انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں کم ہو جاتا تھا اور آگ بھڑکتی جاتی تھی، اسکو اس طرح ادا کیا کہ انگیٹھی کا دہقان، شعلوں کے باغ میں بنفشہ کاٹتا جاتا تھا، اور لالہ بوتا جاتا تھا،

در آمد نقشبند مانوی دست　　زمیں را نقشہا ے بوسہ می بست

کہنا یہ تھا کہ مصور جب دربار میں آیا، تو آداب دربار کے موافق زمین بوس کرتا آتا تھا، اسکو اس طرح یہ ادا کیا کہ مصور بوسوں سے نقش و نگار کرتا آتا تھا،

بہ نوشیں لب آں جام را نوش کرد　　زلب جام را حلقہ در گوش کرد

پیالہ پینے کے وقت لب کی جو ہیئت پیدا ہوتی ہے اسکو حلقہ سے تشبیہ دی ہے، اور اس بنا پر پیالہ کو لب کا حلقہ بگوش قرار دیا ہے،

ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ　　زمرد را بہ مروارید بستہ

شبنم کو موتی سے اور سبزہ کو زمرد سے تشبیہ دی ہے، اس بنا پر کہتا ہے کہ ہوا نے سبزہ پر جو موتی بکھیر دیئے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمرد میں موتی ٹانک دیئے ہیں،

ز گیسو گہ کمر ے کرد و گہ تاج　　بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

معشوقہ جو زلفوں کا کبھی جوڑا باندھتی تھی اور کبھی کمر پر چھوڑ دیتی تھی، اسکو تاج و کمر سے تشبیہ دی ہے،

قلم کی تعریف، ع　مشک در جیب لعل در داماں،

عاشق و معشوق کا ہمکنار ہونا،

شبارہ وزے دگر خفتند مدہوش | بنفشہ در سمن و نسرین در آغوش

نوشابہ کا جواب دینا،

بہ پاسخ نمودن زنِ ہوشمند | ز یاقوت سربستہ بکشاد بند

ازان سیمگوں سکۂ نو بہار | درم ریز کن بر لبِ جوئبار

آغازِ بہار میں جو شگوفے کھلتے ہیں، انکو بہار کا سکہ قرار دیا ہے،

ز باریدن ابر کافور بار | سمن رستہ از دستہائے چنار

یعنی چنار کے پتوں پر جو برف گرتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چنار کے ہاتھوں پر چنبیلی کے پھول کھلے ہیں،

سمنبر غافل از نظارۂ شاہ | کہ سنبل بستہ بد بر نرگسش راہ

یہ اُس وقت کا بیان ہے کہ شیریں نہا رہی تھی، اور زلفوں کو چہرہ پر چھوڑ دیا تھا شعر کا مطلب یہ ہے کہ شیریں کو خسرو کے نظارہ کی خبر نہ تھی، کیونکہ سنبل نے نرگس کا راستہ روک رکھا تھا،

کشادہ طاقِ ابرو تا سر دوش | کشیدہ طوقِ غبغب تا بناگوش

خواب نرگس، خمار دیدۂ او | ناز نسرین، درم خریدۂ او

چو بر فرقِ آب می انداخت از دست | فلک بر ماہ مروارید می بست

سمن ساقی و نرگس جام بر دست | بنفشہ در خمار و سرخ گل مست

بنفشہ تابِ زلف افگندہ بر دوش | کشادہ باد نسرین را بناگوش

گونہ گونہ گلے شگفتہ درو　　سبزہ بیدار آب خفتہ درو

بعض اوقات تشبیہ سے ہیبت اور عظمت مقصود ہوتی ہے، اس قسم کی تشبیہات آج تک کسی نے نظامی سے بڑھکر بلکہ ان کے برابر بھی نہیں پیدا کیں، مثلاً

کمند اژدہائے مسلسل شکنج　　دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

زمیں کو بساطے بد آراستہ　　غبارے شد، از جائے برخاستہ

دراں دجلہ خوں بلند آفتاب　　چو نیلوفر، افگندہ زورق در آب

ز شمشیر برگشتہ جائے نبود　　کہ در غارِ شے اژدہائے نبود

زخم کو غار اور تلوار کو اژدہا سے تشبیہ دی ہے،

اے مدنی برقع و مکی نقاب　　سایہ نشیں چند بود آفتاب

تاج تو و تخت تو دارد جہاں　　تخت زمیں آمد و تاج آسماں

ز بس خوں کہ گردو آمد اندر مغاک　　چو گوگرد سرخ آتشیں گشت خاک

نہنگ خدنگ از کمین کماں　　نیا سود بر یک زمیں یک زماں

شاعری کی لطافت اور رنگینی کا ایک بڑا راز یہ ہے کہ بے جان چیزوں کو صاحب ادراک قرار دے کر اُن کی نسبت ارادی کام منسوب کئے جائیں، مثلاً عرفی کہتا ہے؛

نہ گفت و من نشنودم، ہر آنچہ گفتن داشت　　کہ در بیاں نگہش کرد بر زباں تقدیم

لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت　　فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم،

یعنی اس نے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے سن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں، اسکی نگاہوں نے زبان سے پیشدستی کی، جب ہونٹوں نے نگاہ سے اپنی باری مانگی تو سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا، یا مثلاً

راضیم از نگہ شوق کہ گوید ہمہ باز
از زباں نچہ دم غرض تمنا ماند

متاخرین نے اس طرز کو نہایت وسعت دی، اور اس سے نہایت لطیف اور رنگین نئے نئے اسلوب پیدا کئے، لیکن اس طرز کے موجد نظامی ہیں، شیریں خسرو میں لکھتے ہیں،

نہاں با دشاہ می گفت آں بنا گوش
کہ مولاے توام، ما، حلقہ در گوش

چو سر پیچید گیسو مجلس آراست
بچو رخ گر دید گردن عذر ہا خواست

بگویم غمزہ را تا وقت شبگیر
ہمندش را برقص آرد بیک تیر

بگویم زلف را تا یک فن آرد
تکلیفش بہ ارسن در گردن آرد

نظامی کے یہ مضامین، متاخرین کے شمع راہ بنے، جس کی روشنی میں انکو گوناگوں اسالیب کا سلسلہ ہات آگیا، نظامی نے جب (پہلے شعر میں) بنا گوش کی نسبت یہ باندھا کہ اسی نے چپکے سے بادشاہ سے کہا، تو بے تکلف ایک شاعر اسکو یوں بدل کر کہہ سکتا ہے،

ع
زلف او خم شدہ در گوش سخن می گوید

شعر کے سینکڑوں انواع ہیں، لیکن بڑی قسمیں یہ ہیں، رزمیہ، عشقیہ، فلسفیانہ، اخلاقی اور جذبات انسانی کا اظہار، اور مناظر کی تصویر، ان میں سے ہر نوع کو نظامی نے لیا ہے

معراجِ ترقی تک پہنچا دیا ہے،

سکندر نامہ میں انھوں نے لکھا ہو کہ سکندر کے حالات تین حیثیتیں رکھتے ہیں، سلطنت، نبوت، فلسفہ وحکمت میں تینوں قسم کے حالات لکھونگا، اور تفصیل سے لکھونگا،

گروہیش خوانند صاحب سریر ولایت ستاں بلکہ آفاق گیر

گروہے ز دیوان دستور راو بہ حکمت نوشتند منشور او

گروہے زپاکی ودیں پروری پذیرا شدندش بہ پیغمبری

من از ہر سہ دانہ کہ دانا فشاند درختے برومند خواہم نشاند

چنانچہ سکندر نامہ بری میں کشورستانی اور سکندر نامہ بحری میں پیغمبری کے واقعات اور فلسفیانہ بحثیں ہیں،

فارسی میں فلسفیانہ مسائل ناصرِ خسرو کے سوا کسی نے ادا نہیں کئے، لیکن ناصر خسرو نے تمام اصطلاحیں وہی عربی کی قائم رکھی ہیں، اس بنا پر عام خیال یہ ہے کہ فارسی میں فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، بو علی سینا کی کتاب حکمت علائیہ سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ نظامی نے فلسفیانہ مسائل اس حد تک لکھ دیے ہیں کہ زبان کی کم مایگی کی شکایت نہیں ہو سکتی، اور اگر متاخرین بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتے تو فارسی زبان ایک فلسفیانہ زبان بنگئی ہوتی،

سکندر نامہ بحری میں انھوں نے ایک خاص داستان سکندر اور حکماے یونان کی فلسفیانہ بحثوں کے متعلق لکھی ہو، اس میں ارسطو، فلاطون، والیس، بلیناس، سقراط،

فرفوریوس (یارفیرس) ہرمس کے اقوال اور رائیں لکھی ہیں، ہندوستان کے ایک حکیم نے سکندر سے سوالات کئے تھے، سکندر کی زبان سے اُن کے جوابات لکھے ہیں، ان تمام بحثوں میں فلسفہ کی اصطلاحیں فارسی میں ادا کی ہیں، عربی الفاظ جا بجا آتے ہیں، لیکن اس حد تک کہ زبان نامانوس اور روسا تیر و ژند نہ بنجائے

ایک ہندو حکیم نے سکندر سے سوال کیا تھا کہ نظر بد کیا چیز ہے؟ اس میں کہاں سے تاثیر پیدا ہوتی ہے؟ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی چیز کو پسند کیا جائے تو اس کی ترقی کا سبب ہوتا ہے بخلاف اس کے بد نظر جس چیز کو پسند کرتا ہے، اسی کو نظر لگتی ہے، سکندر نے جواب دیا کہ انسان جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو آنکھ سے شعاعیں نکل کر اس چیز پر پڑتی ہیں، شعاع ہوا سے گذر کر اس چیز تک پہنچتی ہے، اب ہوا میں اگر سمیت ہے تو یہ شعاعیں بھی اس سے آلودہ ہو کر زہریلی ہو جاتی ہیں اور اس چیز کو جا کر نقصان پہنچاتی ہیں،

اس سے قطع نظر کرکے کہ سوال وجواب دونوں طفلانہ ہیں، یہ دیکھو کہ نظامی ان باتوں کو کن الفاظ میں ادا کرتے ہیں،

دگر بار ہندو در آمد بہ گفت — گہر کرد باز نوک الماس جفت

کہ بہ چشم بد شاہ دہ مرا — ز چشم بد آگاہئے دہ مرا

چہ نیرو ست، در جنبش چشم بد — کہ نیکوی خود را کند چشم زد

ہمہ چیز را کازمایش رسید — چو دیدہ پسندد، فزائش رسید

جزاورا کہ ہرچہ پسند آورد | سرو گردنش زیر بند آورد
بہر حرفے چونکہ دیدیم ژرف | درستی ندیدیم در ہیچ حرف
ہمیں یک کماندار شد از نخست | بر آماج گہ تیر او شد درست
بگو تا چہ پیروست نیرئے او
جهاندار گفتا کہ طالع شناس | چنیں آرد از روی معنی قیاس
کہ برہر چہ گردد نظر جائگیر | گذر بر ہوائے کند ناگزیر
بر آں چیز کارد نظر تاختن | کند با ہوا رای دم ساختن
بنہ چوں در آرد بہ آں رخت گاہ | ہوا نیز یابد بر آں رخنہ راہ
ہوا گر ہوائے بود سودمند | درارکان آں چیز ناید گزند
مزاج ہوا گر بود زہرناک | بیندازد آں چیز را در مغاک
ہوائے بدست آں کہ در چشم زد | بدارد بہ ہمراہئے چشم بد

موجودات کی ابتدا، اور انکی ترتیب، افلاک، عناصر، سلسلہ علل، ان تمام بحثوں کے متعلق، یونانی حکمار کی رائیں نقل کی ہیں، اور ان تمام مباحث میں بہت کم عربی کے الفاظ کو دخل دیا ہے،

اخلاقی شاعری | نظامی کی شاعری کا بڑا حصہ اخلاق کے متعلق ہے، مخزن اسرار کے سوا جو خاص اسی مضمون پر لکھی ہے، اور مثنویوں میں بھی جا بجا اخلاقی ہدایتیں موقع بموقع لکھی ہیں، چنانچہ کسی صاحب ذوق نے خاص اس قسم کے اشعار کو اُن کے پنج گنج

سے چن کر یکجا جمع کر دیا ہے اور اخلاق کے ۲۵ عنوان قرار دیکر ایک ایک عنوان کے نیچے تمام مثنویوں کے وہ اشعار نقل کر دیئے ہیں، جو اس عنوان سے تعلق رکھتے تھے ہینے اس مجموعہ کا ایک نہایت خوشخط نسخہ، عالمگیری کتب خانے کا حیدر آباد میں دیکھا تھا

جذبات انسانی | شاعری کی اس اہم اور لطیف نوع کو نظامی نے جس رتبہ پر پہنچایا، قدما میں فردوسی کے سوا اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اور انصاف یہ ہے کہ فردوسی بھی اس خصوصیت میں اُن کی ہمسری نہیں کر سکتا، فردوسی نے جہاں جذبات کا اظہار کیا ہی معمولی اور سادہ حالت کو ادا کیا ہی، بخلاف اس کے نظامی نہایت نازک لطیف اور دقیق پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہیں، مثلاً دارا جب زخمی ہو کر گرا ہی تو سکندر اس کے پاس گیا ہے، اور دارا نے اس سے حسرت ناک باتیں کی ہیں، فردوسی نے اس موقع پر وہی معمولی افسوس اور عبرت کے کلمات ادا کر دیئے ہیں، جو ہر شخص کے خیال میں آسکتے ہیں، لیکن نظامی کی نظر ان نازک اور دقیق نکتوں تک پہنچی ہی، جہاں ہر شخص کا وہم رسائی نہیں پا سکتا، دارا کوئی معمولی آدمی نہ تھا، بلکہ دنیا کے وسیع خطہ کا شاہ اور شاہنشاہ تھا، شکست کھانے اور خود اپنے نوکروں کے ہات سے زخمی ہو کر مرنے کا سکو صدمہ ہی اور اس وجہ سے افسوس، حسرت اور بیکسی کے خیالات اسکے دل میں ہجوم کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی شاہنشاہانہ ادعا، غرور اور تمکنت کا نشہ بھی سر میں ہی، اسلئے اسکے غمزدہ اور عاجزانہ الفاظ بھی صولت اور رعب کے لہجہ میں ادا ہوتے ہیں، اسکی آہیں بھی نعرہ جنگ ہیں، اسکی پر حسرت نگاہیں بھی برق غضب ہیں، نظامی ان تمام

خصوصیات کو دکھاتے ہیں

چو در موکبِ قلبِ دارا رسید — ز موکب روان ہیچ کس را ندید

تنِ مرزباں دید در خاک و خوں — کلاہِ کیانی شدہ سرنگوں

بہ بازوے بہمن بر آسودہ مار — ز رویین دژ افتادہ اسفندیار

بہارِ فریدوں و گلزار جم — ز بادِ خزاں گشتہ تاراجِ غم

نسب نامۂ دولتِ کیقباد — ورق بر ورق ہر سوے بردہ باد

سکندر فرود آمد از پشتِ بور — در آمد بہ بالینِ آں پیل زور

بہ بالیں گہِ خستہ آمد فراز — ز درعِ کیانی گرہ کرد باز

سرِ خستہ را بر سرِ راں نہاد — شبِ تیرہ بر روزِ رخشاں نہاد

چو دارا بروش نگہ کرد و دید — بہ سوزِ جگر آہ از دل کشید

چنیں داد دارا بہ خسرو جواب — کہ بگذار تا سر نہم من بہ خواب

رہا کن کہ در من رہائی نماند — چراغِ مرا روشنائی نماند

سپہرم بداں گونہ پہلو درید — کہ شد در جگر پہلوم ناپدید

رہا کن کہ خوابِ خوشم مے برد — زمیں آب و چرخ آتشم مے برد

سرِ سروراں را رہا کن ز دست — تو مشکن کہ ما را جہاں خود شکست

چو من زیں ولایت کشادم کمر — تو خواہ افسر از من ستاں خواہ سر

اگر تاج خواہی ربود از سرم — یکے لحظہ بگذار تا بگذرم

مبیں سرورا درسر افگندگی ‏ چناں شاہ را در چنیں بندگی

دریں بندم از زحمت آزاد کن ‏ بہ آمرزش ایزدی یاد کن

چوگشت آفتاب مرا روی زرد ‏ نقابے بمن درکش از لاجورد

مگرداں سر خفتہ را از سریر ‏ کہ گردونِ گرداں برآرد نفیر

تو اے پہلواں کامدی سوے من ‏ نگہدار پہلو ز پہلوے من

کہ با آں کہ پہلو دریدم چو میغ ‏ ہمے آید از پہلوم بوے تیغ

چہ دستے کہ با ما درازی کنی ‏ بہ تاجِ کیاں دستبازی کنی،

نگہدار دستت کہ دارا ست ایں ‏ نہ پنہاں چو روز آشکارا ست ایں

زمیں را منم تاج تارک نشیں ‏ مجنباں مرا تا نہ جنبد زمیں

اس واقعہ کو فردوسی نے بھی لکھا ہے، لیکن زور اور اثر نہیں، چنانچہ اس موقع کے اشعار ہم درج کرتے ہیں،

برانم کہ از پاک دادار خویش ‏ بیابی تو پاداشِ گفتارِ خویش

یکے آنکہ گفتی کہ ایراں تراست ‏ سر تاج و تختِ دلیراں تراست

بمن مرگ نزدیک تر زانکہ تخت ‏ بپرداخت تخت از نگوں گشتہ بخت

برین است فرجام چرخِ بلند ‏ خرامش ہمہ رنج و سر دش گزند

بدو می نگر تا نگوئی کہ من، ‏ فزونم ازیں نامدار انجمن

بدو نیک ہر دو ز یزداں شناس ‏ وزو دار تا زندہ باشی سپاس

نمودار گفتار من، من بسم | بریں داستان عبرت ہر کسم
که چنداں بزرگی و شاہی و گنج | مرا بود و از من بند کس برنج
ہماں نیز چنداں سلیح و سپاہ | گراں مایہ اسپان و تخت و کلاہ
ہماں نیز فرزند و پیوستگاں | چہ پیوستگاں داغ دلخستگاں
زمین و زماں بندہ بد پیش من | چنیں بود تا تخت بد خویش من
چو از من ہماں بخت بیگانہ شد | ہمہ کاخ و ایوان چو ویرانہ شد
ز نیکی جدا ماندہ ام زیں نشان | گرفتار در دست مردم کشاں
ز فرزند و خویشاں شدہ نا اُمید | سیہ شد جہاں، دیدگانم سفید
ز خویشاں کسے نیست فریادرس | امیدم بپروردگارست و بس
بدیں گونہ خستہ بخاک اندرم | ز گیتی بدامِ ہلاک اندرم
برین است آئین چرخ رواں | اگر شہریاری اگر پہلواں
بزرگی بفرجام ہم بگذرد | شکاراست مرگش ہمی بشکرد
سکندر ز دیدہ بباریدخوں | براں شاہِ خستہ بخاک اندروں
چو دارا بدید از دل درد اوی | سرِ شک رواں بر رخ زرد اوی
بدو گفت بگرمی کز و سود نیست | ز آتش مرا بہرہ جز دود نیست

مناظر | مناظر قدرت کو جا بجا لکھا ہے، اور جہاں لکھا ہے، نیچر کی تصویر کھینچدی ہے
مناظرِ قدرت میں باغ و بہار ایک عام موضوع ہے جس پر تمام شعرا نے طبع آزمائیاں کی

ہیں، اور داد سخن دی ہی، لیکن نظامی یہاں بھی سب سے علیحدہ اور سب سے ممتاز ہیں، تمام شعرا نے صرف بہار کا سماں دکھانے پر اکتفا کیا ہی، لیکن نظامی نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ بہار میں ایک رنگین مزاج پر کس طرح نشہ سا چھا جاتا ہی، وہ باغ میں جاتا ہے، پھولوں سے کھیلتا ہی، گلدستے بنا کر درختوں پر اچھالتا ہی، نہر کے کنارے بیٹھ جاتا ہی اور شگوفے توڑ توڑ کر نہر میں بہاتا ہی، حوض کے پاس چنبیلی کے پھولوں کا بچھونا بچھاتا ہی بغل میں معشوق ہے، اسکی زلفوں کے حلقے اپنی گردن میں ڈالتا ہی، اور دنیا سے آزاد ہو جاتا ہے، مرغان چمن سے فرمائش کرتا ہے کہ ہاں پھر اسی انداز سے اڑنا ساتھ ہی ساز بھی چھیڑتا جاتا ہے، اور قابو سے باہر ہوا جاتا ہی،

بیا باغباں خرمی ساز کن — گل آمد در باغ را باز کن،

نظامی بباغ آمد از شہر بند — بیارای بستاں بہ چینی پرند،

ز جعد[1] بنفشہ بر انگیز تاب — سر نرگس مست برکش ز خواب

ز سیمائے سبزہ فرو شوی گرد — کہ روشن بہ شستن شود لاجورد

درختاں شگفتند در طرف باغ — برافروختہ ہر گلے چوں چراغ

بہ مرغ زباں بستہ آواز دہ، — کہ پرواز پارینہ را ساز دہ

سرائیدہ کن نالۂ چنگ را — بر آور بہ رقص ایں دل تنگ را

سر زلف معشوق را طوق ساز — برافگن ز گردن خود ایں طوق باز

[1] یہ نکتہ بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ نظامی نے ان باتوں کو بجائے خبر کے انشا کے پیرایہ میں ادا کیا ہی اور یہ زیادہ بلیغ ہی،

ریاحین سیراب را دستہ بند | برافشاں بہ بالاے سرو بلند
ازاں سگوں سکۂ نوبہار | درم ریز کن بر لب جوئبار
بہ پیرامن بر کہ آب گیر | زسوسن در افگن بساطِ حریر

عشقیہ | ایران کی شاعری کا اصل مایۂ ناز عشقیہ شاعری ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ عشق و عاشقی کے معاملات اور راز و نیاز جس رنگینی اور دلفریبی سے ایرانی شاعری نے ادا کیے، دنیا کی اور کوئی زبان اس انداز سے ادا نہیں کرسکتی، اس قسم کی شاعری کے لئے غزل مخصوص کردی گئی ہو، اور اس کے موجد شیخ سعدی خیال کئے جاتے ہیں، نام کے لے غزل کی بنیاد ان سے بھی بہت پہلے پڑ چکی تھی لیکن انصاف یہ ہو کہ وہ قدما کے بوڑھے غزنے ہیں،

بے شبہہ غزل کے موجد سعدی ہیں، لیکن غزل کی اصلی روح یعنی عشقیہ شاعری کی ایجاد نظامی کا خاص کارنامہ ہے، عشقیہ مثنویاں نظامی سے پہلے بھی لکھی گئیں جنمیں سے فردوسی کی یوسف زلیخا آج بھی موجود ہے لیکن مثنویاں وہی قدما کی غزلیں ہیں نظامی نے عشقیہ شاعری کی جس طرح بنیاد ڈالی اور اُسکو ترقی دی اُسکی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) عشق و عاشقی کے خیالات کے ادا کرنے کے لئے ایک خاص زبان درکار ہے، جس کے الفاظ نازک، لطیف اور شیریں ہوں، خاص قسم کے استعارات اور تشبیہیں ہوں، ان میں دلآویزی اور دلفریبی ہو، یہ زبان خاص نظامی نے پیدا

کی ہے، قدما کی عشقیہ مثنویوں کا نظامی کی مثنویوں سے مقابلہ کرو تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے،

غزل کے مہماتِ مضامین یہ ہیں معشوق کے حسن کی تعریف، ادا اور ناز و غمزہ کے کرشمے، انگ انگ اعضا کا بیان اور انکی تشبیہات، عاشق و معشوق کے معاملات یعنی راز و نیاز، اصرار و انکار، سوال و جواب، عجز و غرور، وغیرہ ان تمام مضامین کو نظامی نے اس وسعت، تنوع، رنگینی اور لطافت سے ادا کیا ہے کہ انکا ہر ہر شعر سینکڑوں غزلوں کا سرمایہ ہے، چند مثالیں ذیل میں درج ہیں،

شیریں کا غسل کرنا،

چو قصد چشمہ کرد آں چشمۂ نور	فلک را آب در چشم آمد از دور
پرندِ آسمان گوں بر میاں زد	بشد در آب و آتش در جہاں زد
تنِ صافش کہ می غلطید در آب	چو غلطد قاقمے بر روی سنجاب
چو بر فرق آب مے انداخت از دست	فلک بر ماہ، مروارید می بست
ز ہر سو شاخِ گیسو، شانہ می کرد	بنفشہ بر سرِ گل، دانہ می کرد
در آب انداختہ از گیسوان شست	نہ ماہی بلکہ ماہ آوردہ در دست

شیریں آراستہ ہو کر خسرو کے سامنے آتی ہے،

پس آنگہ ماہ را پیرایہ بر بست	نقاب آفتاب از سایہ بر بست
فرو پوشید گلنارے پرندے	بزد ہر شاخ گیسو چون کمندے

سر آغوشے بر آمودہ بگوہر
بہ رسم چینیاں افگندہ بر سر

بدیں طاؤس کردائے ہمائے
رواں شد چوں تدروے در ہوائے

ایک موقع پر جب خسرو نے شیریں سے زیادہ اختلاط کرنا چاہا ہو، تو وہ برہم ہو کر اٹھی ہے، اس حالت میں اس کا تن کر کھڑا ہونا، پیشانی کا غصہ سے سمٹنا، چہرہ کا کھل جانا بدن ڈھکنے میں حسن کا اور چمکنا، بالوں کو کبھی سمیٹنا اور کبھی چھوڑ دینا، ان تمام اداؤں کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

بگفت این و چو سرو از جای برخاست
جبیں را گرد کرد و فرق را آراست

یہ کہہ کر سرو کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی
پیشانی سمٹ گئی اور قد تن گیا

بداں آئین کہ خوباں را بود دست
زنخداں می کشاد و زلف می بست

اس خاص انداز سے جسمیں معشوقوں کو کمال ہوتا ہے
چہرہ کھولنے اور بال سمیٹنے لگی،

جمال خویش را در خز و خارا،
بپوشیدن ہمے کرد آشکارا

اپنے حسن کو حریر اور کمخواب میں جس قدر
چھپاتی تھی، اسی قدر اور کھلتا تھا'

گہے بر فرق تند آشفتہ می بود
گرہ می بست بر مہ مشک می سود

کبھی زلفوں پر جھلاتی تھی اس میں
گھونگھر بناتی تھی اور چاند پر مشک ملتی تھی

بزیور راست کردن دیر می شد
کہ پایش بر سر شمشیر می شد،

زیور کے سنبھالنے میں دیر ہوئی جاتی تھی
کیونکہ جلدی کیوجہ سے گویا اسکا قدم تلوار پر تھا

ز گیسو گہ کمر می کرد گہ تاج
بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

زلفوں کو کبھی کمر سے لپیٹتی تھی اور کبھی سر پر جوڑا باندھتی تھی — جو کمر بند اور تاج بنجاتی تھی اور اس کمر بند اور تاج کا خسرو بھی محتاج تھا

ایک موقع پر شیریں جب دھکر اٹھی تو اس ادا سے اٹھی جس میں لگاوٹ بھی پائی جاتی تھی، اسکی تصویر اس طرح کھینچی ہی،

به چشمے نازِ بے اندازہ می کرد — به دیگر چشم عذرے تازہ می کرد
چو سر پیچید گیسو مجلس آراست — چو رخ گردید گردن عذرہا خواست
نمود اندر ہزیمت شاہد الپست — بگو گرد سفید آتش ہمی کشت
غلط گفتم نمودش تختہ عاج — کہ شہ را نیز باید تخت یا تاج
حسابے دیگر آں بودش دراں کوی — کہ پشتم نیز محرابے است چوں روی
دگر وجہ آنکہ گر وجہے شد از دست — ازاں روشن ترم وجہے دگر ہست
چہ خوش نازیست نازِ خوبرویاں — ز دیدہ راندہ را از دیدہ جویاں
بہ چشمے خیرگی کردن کہ برخیز — بہ دیگر چشم دل دادن کہ مگریز

منہ پھیر کر بھاگنے کی توجیہیں کس قدر شاعرانہ ہیں، یعنی اسکو یہ دکھانا تھا کہ جس طرح میرا چہرہ محرابی اور روشن ہے، اسی طرح پیٹھ بھی محرابی اور بلوری ہی،

غزلیہ شاعری کا ایک بڑا میدان معشوق کا ناز و غرور ہے، نظامی نے داستان کی داستان اس مضمون پر لکھی ہی، جس کا ہر شعر غزل کا کام دیسکتا ہے،

خسرو نے جب شیریں کو شاہی اقتدار کا زور دکھانا چاہا ہے تو وہ کہتی ہی،

ہنوزت در سر از شاہی غرور است — دریغا کیں غرور از عشق دور است

ابھی تک تیرے سر میں سلطنت کا غرور ہے — لیکن افسوس، عشق کو غرور سے کیا نسبت

دریں گرمی کہ آہِ سرد باید — دل آسان است با دل درد باید

اس گرمجوشی میں کہ آہ سرد کی ضرورت ہے — دل آسان ہے لیکن دل میں درد مشکل ہے

ہنوزم ہندوان آتش پرستند — ہنوزم چشم چوں ترکان مستند

ابھی تک ہندو، مجھکو پوجتے ہیں — ابھی تک میری آنکھیں ترک ہیں

ہنوزم لب پر آبِ زندگانی است — ہنوزم آب در جوی جوانی است

ابھی تک میرے ہونٹوں میں آبِ حیات ہے — ابھی تک میرے چشمہ میں آبِ شباب ہے

بہ غمزہ گرچہ ترکی دلستانم، — بہ بوسہ دل نوازی نیز دانم

اگرچہ غمزہ کے لحاظ سے میں ترک ہوں — لیکن بوسہ سے میں دلداری بھی کرسکتی ہوں

برو تا بر تو نکشانم بخون دست — کہ در گردن چنیں خونم بسے ہست

ہٹ جا! ایسا نہ ہو کہ میں تیرے لہو پر ہاتھ ڈالدوں — ایسے اور بہت سے خون میری گردن پر ہیں

خسرو نے جب شاپور کے ہاتھ شیریں کو بلا بھیجا ہے، تو وہ کہتی ہے،

اگر خسرو نہ کیخسرو بود شاہ — بباید گردنش سر پنجہ با ماہ

بگویم غمزہ را تا وقتِ شبگیر — سمندش را بہ رقص آرد بیک تیر

فرستم زلف را تا یک فن آرد — شکیبش را رسن در گردن آرد

میں زلف کو بھیجدوں گی کہ چالاکی سے — خسرو کے صبر کو گرفتار کرکے لائے

مزاجی کردم واو خواست پنداشت — دروغے گفتم واو راست پنداشت

میں نے تو دل لگی کی تھی تو وہ تقاضا سمجھے	میں نے جھوٹ کہدیا تھا وہ سچ سمجھ گئے

خسرو ایک مرتبہ چند ندیموں کے ساتھ مستی کی حالت میں شیریں کے مکان پر گیا شیریں نے اس کی یہ حالت دیکھکر کوٹھے سے اترنا مناسب نہ سمجھا، خواصوں کو بھیجا کہ شہ نشین میں فرش کرکے وہیں خسرو کو بٹھائیں، خسرو کوٹھے پر جانا چاہتا ہے، شیریں منظور نہیں کرتی، اس موقع کا سماں اور سوال وجواب کا انداز دیکھو،

رقیبے را بہ نزد خویش خواند	کہ مارا نازنیں بر در چرا ماند
ایک خواص کو اپنے پاس بلایا اور کہا	کہ مجھکو نازنین نے باہر کیوں بٹھایا
دروں شو، گو نہ شاہنشہ غلامی	فرستاد است نزدیکت پیامی
اندر جا کر کہو کہ ایک شاہنشہ نے نہیں بلکہ	ایک غلام نے پیغام بھیجا ہے،
کہ مہمانے بہ خدمت مے گراید	چہ فرمائی؟ درآید یا نیاید
کہ ایک مہمان خدمت کے لئے آیا ہے	کیا ارشاد ہے؟ اندر آئے یا نہ آئے،
بدیں زاری پیامِ شاہ می گفت	شکر لب می شنید و آہ می گفت
بادشاہ کا عاجزانہ کلام شیریں	سنتی تھی اور افسوس کرتی تھی،
کنیزے کاردان را گفت آں ماہ	بخدمت خیز و بیروں شو سوی شاہ
ایک ہوشیار کنیز سے شیریں نے کہا کہ	بادشاہ کے پاس جا،
فلاں تشتی طاق دیبا را بروں بر	بزن با طاق ایں ایواں برابر
مخمل کے تھان لے جا کر	شہ نشیں میں بچھادے

بنہ بر پیشگاہ و شقہ بر بند	پس آنگہ شاہ را گو کاے خداوند
اور پردے باندھ کر	بادشاہ سے کہہ
نہ ترک ایں سرا ہندوی ایں بام	شہنشہ را چنیں داد است پیغام
اس گھر کی ترک (یعنی معشوق) نے نہیں بلکہ	ہندو (غلام) نے حضور کو یہ پیغام دیا ہے

اس کے بعد خسرو اور شیریں سے دوبدو گفتگو ہوئی ہے، خسرو کہتا ہے کہ تم نے دروازہ کیوں بند کر دیا، شیریں جواب دیتی ہے،

حدیث آں کہ در بستم روا بود	کہ سرمست آمدن پیشم خطا بود
چوں من خلوت نشیں باشم تو مخمور	ز تہمت ہاے مردم کے بود دور
تو می خواہی مگر کز راہِ دستاں	بہ نقلانم خوری چوں نقلِ مستاں
بدست آری مرا چوں غافلاں مست	چو گل بوی کنی و اندازی از دست
رہا کن نام شیریں از لبِ خویش	کہ شیرینی دہانت را کند ریش
تو در عشقِ من از مالی و جاہے	چہ دیدی جز خداوندی و شاہے
تو ساغر می زدی با دوستاں شاد	قلم شاپور می زد تیشہ فرہاد

اس کے مقابلہ میں رندانہ شوخیاں دیکھو، شیریں جب کسیطرح راضی نہیں ہوتی تو خسرو اس سے کہتا ہے،

بہ گستاخی در آمد کے دلارام	گرفتہ چند خواہی بد، بیارام
خسرو نے گستاخانہ کہا کہ اے معشوق	یہ برہمی کب تک، ذرا نرم ہو

چو می خوردی و میدادی بمن یار | چرا باید که من مستم تو ہشیار

تم نے شراب پی اور مجھکو بھی پلائی لیکن یہ خلافِ انصاف ہے کہ میں مست ہوجاؤں اور تم ہوش میں رہو

شمار بوسہ خواہد بود کارم | تو می دہ بوسہ تا من می شمارم

میرا کام صرف بوسہ کا گننا ہوگا | تم بوسہ دیتی جاؤ میں گنتا جاؤں گا

یعنی یہ کام تمہارا ہی ہے، لیکن میں اسکو تمہاری خاطر سے انجام دیدوں گا،

سکندر نے جب کنیزک چینی سے اختلاط کرنا چاہا ہے تو وہ غرور کے لہجہ میں اپنے اوصاف بیان کرتی ہے، بادشاہ اور کنیز کا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن اس موقع پر نظامی نے جدت آفرینی سے سکندر کا ایک ایک وصف بیان کرکے اس کے مقابلہ میں اسکے ترجیح کی وجہیں کنیز کی زبان سے ادا کی ہیں،

ملک گر ز جمشید بالاتر است | رخِ من ز خورشید زیباتر است

شہ ار کیقباد بلند افسر است | مرا افسر از مشک و از عنبر است

شہ ار چوں سلیمان شود دیو بند | مرا در جہاں ہست دیوانہ چند

شہ ار زانکہ عالم گرفت ای شگفت | من آں را گرفتم کہ عالم گرفت

اگرچہ کمند جہانگیر شاہ | فتادہ است در گردنِ مہر و ماہ

کمندے من از زلف بر ساز مش | نہ ترسم بہ گردن در اندازمش

گر او را کمندے بود ماہ گیر | مرا ہم کمندے بود شاہ گیر

گر او ناوک اندازد از دور دست | مرا غمزۂ ناوک انداز ہست

سکندر بہ حیواں خطا می رود | من اینجا سکندر کجا می رود
اگر راہِ ظلمات می بایدش | سرِ زلفِ من راہ بنمایدش
لبِ من کہ یاقوتِ رخشاں در و است | پسے چشمۂ آبِ حیواں در و است

رزمیہ | شاہ نامہ کو سو برس سے اوپر ہو چکے تھے، اس عرصہ میں زبان میں بڑا انقلاب ہوگیا تھا، سینکڑوں الفاظ بالکل متروک ہوگئے تھے، اکثر الفاظ حروف زائد گرا کر خوبصورت قالب میں ڈھل چکے تھے، عربی کے نئے نئے مانوس الفاظ داخل ہوتے جاتے تھے، زبان کے انقلاب کے ساتھ مضامین کی طرز ادا کی روش بھی بدل گئی تھی، استعارات اور تشبیہات میں لطافت و نزاکت آگئی تھی، طبیعتیں مضمون آفرینی کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں، ان باتوں سے شاہنامہ کی عالمگیر آواز دھیمی پڑنے لگی تھی، قصے زبانوں پر رہ گئے تھے لیکن اشعار بھولتے جاتے تھے، اس بنا پر قوم کے شجاعانہ جذبات کے زندہ رکھنے کیلئے ایک دوسرے شاہنامہ کی ضرورت تھی جو سکندر نامہ کے قالب میں نمودار ہوا،

سکندر نامہ کے ہیرو کے انتخاب میں غلطی ہوئی، لیکن مجبوری تھی، قومی تاریخ فردوسی کے حصہ میں آچکی تھی، رسول اللہ صلعم کے غزوات اور خلفاء کے معرکوں میں شاعری کی گنجائش کم تھی کیونکہ اصلیت سے بال برابر بھی ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے اور شاعری کے لئے کچھ نہ کچھ آب و رنگ چڑھانا ضرور تھا، خود کہتے ہیں،

چو نظمِ گذارش بود راہ گیر | غلط کردنِ رہ بود ناگزیر
مرا کار با نغز گفتاریست | ہمہ کارِ من خود غلط کاریست

دگر بے شگفتے، گزاری سخن ندارد نوی، نامہ ہاے کہن

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی مشہور کشورستان کی داستان اختیار کیجائے اس حیثیت سے سکندر کا کوئی ہمسر نہ تھا، ایشیا اور یورپ دونوں اس کو مانتے تھے، البتہ یہ افسوس ہے کہ نظامی نے مذہب ملا دیا، یعنی ذوالقرنین کو سکندر بنادیا، جو صریح قرآن مجید کے خلاف ہے،

سکندرنامہ میں اگرچہ شاعری کے محاسن بہت زیادہ ہیں، باایں ہمہ شاہنامہ کے برابر مقبول نہ ہوسکا، اس کے خاص اسباب ہیں،

۱- سکندرنامہ میں اکثر جگہ تعقید ہے، جو بات کہنا چاہتے ہیں، اس طرح صاف صاف نہیں کہہ سکتے کہ زبان سے نکلنے کے ساتھ دل میں اتر جائے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے شرحیں اور حاشیے لکھے گئے، اس پر بھی بہت سے مقامات لاینحل رہ گئے، اور اکثر جگہ زبردستی مطلب پہنانا پڑا،

۲- کتاب کا ہیرو ایک غیر شخص یعنی سکندر تھا اسلئے ایرانیوں کو اسکے واقعات سے ایسی دلچسپی اور محبت نہیں ہوسکتی تھی جو خود اپنی قوم سے ہوسکتی تھی، شاہنامہ کے مقبول ہونے کا بڑا گر یہ تھا کہ خود اپنی قوم کی داستان تھی،

۳- تمام کتاب میں صرف ایک شخص کی داستان ہے، پڑھنے والا اکتا جاتا ہے بخلاف اس کے شاہنامہ میں سینکڑوں اشخاص کے واقعات اور گوناگوں حالات ہیں ایک غذا سے جی گھبرائے تو اور طرح طرح کے الوانِ نعمت موجود ہیں،

۴۔ تمام کتاب میں کوئی درد انگیز اور عبرت خیز واقعہ نہیں ہی، بخلاف اس کے شاہنامہ میں رستم وسہراب، منیژہ وبیژن، جمشید وضحاک کی داستانیں نہایت پر اثر اور حسرت آمیز ہیں،

باوجود ان باتوں کے سکندرنامہ نے جو قبولیت حاصل کی، تعجب انگیز ہے،

شاہنامہ کے سو ڈیڑھ سو ہی برس بعد سکندرنامہ لکھا گیا، اور شہرت عام پا گیا، سکندرنامہ کو آج چھ سو برس کا زمانہ گذر چکا، اس مدت میں اس طرز پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں لیکن ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا، سکندرنامۂ جامی آئینۂ سکندری، ہمای ہمایوں، اکبرنامہ سلیمان نامہ[1]، ان کا نام کس نے سنا ہے،؟

رزمیہ نظم کا یہ اصول ہے کہ پہلے حربی باجوں کے بجنے، دارو گیر، ہنگامہ شور و غل اور عام ہلچل کا نقشہ کھینچا جائے، پھر فوجوں کی حملہ آوری، زور شور، جوش و خروش کا ذکر کیا جائے، پھر آلاتِ جنگ یعنی تیر و کمان، تیغ و سناں، نیزہ و خنجر کی کارستانیاں دکھائی جائیں، پھر ایک ایک پہلوان کا معرکہ میں آنا رجز پڑھنا، مبارز طلب ہونا حریف سے لڑنا، داؤں پیچ کرنا، مرنا یا مارنا، ان باتوں کا ذکر کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ میدانِ جنگ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، سکندرنامہ میں یہ سب باتیں ہیں اور کمال کے درجہ پر ہیں،

حربی باجوں کا ذکر

---

[1] یہ سب مثنویاں سکندرنامہ کی طرز پر اور اسکے جواب میں لکھی گئی ہیں،

درآمد بہ غرّیدن آوازِ کوس | فلک بر دہانِ دہل داد بوس

زغرّیدنِ کوسِ خالی دماغ | زمیں لرزہ افتاد در کوہ و راغ

چناں آمد از نائے ترکی خروش | کہ از نائے ترکاں برآورد جوش

برآوردہ خرمہرہ آوازِ شیر | گلا دماغ از دمِ گاؤدم گشت شیر

ناقوس طراقے کہ از مقرعہ خواستہ | ترنا بروں رفت از زیں طاق آراستہ
تراقے کی آواز تازیانہ

زبیمِ چقاچق کہ آمد ز تیر | کفن گشت در زیر جوشن حریر

ہنگامہ جنگ

روا رو برآمد ز راہِ نبرد | ہزاہز درآمد بہ مردانِ مرد

بہ جنبش درآمد دو دریائے خوں | شد از موجِ آتش زمیں لالہ گوں

زمیں گفتی از یک دگر بر درید | سرافیل صورِ قیامت دمید

یکے گفت ہوی و دگر گفت ہاں | برآورد سر ہای و ہوی از جہاں

جگر تاب شد نعرہ ہائے بلند | گلوگیر شد حلقہ ہائے کمند

سپاہ از دو جانب صف آراستہ | زمیں آسماں دار برخاستہ

زسمِ ستوراں دراں پہن دشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

فرو رفت و بر رفت روزِ نبرد | نمِ خوں بہ ماہی و بر ماہ گرد

زبس گرد بر تارکِ ترک و زیں | زمیں آسمان، آسمان شد زمیں

چناں گرم گشت آتشِ کارزار | کہ از نعلِ اسپاں برآمد شرار

زبس خوں کہ گرد آمد اندر مغاک | چو گو گرد سرخ آتشیں گشت خاک

زغریدنِ تُندہ پیلانِ مست — گرہ در گلوی هژبران شکست

زمین کو بساطے بُد آراستہ — غباری شد از جاے برخاستہ

زپولاد پیکانِ پیکر شکن ، — تنِ کوہ لرزید بر خویشتن

پدر با پسر کیں بر آراستہ — محابا شدہ ، مهر برخاستہ

ستونِ علم جامہ درخوں زدہ — نجات از جہاں خیمہ بیروں زدہ

زشمشیر برگشتہ جاے نبود ، — کہ در غار او اژدہاے نبود

نہنگِ خدنگ از کمین کماں — نیا سود بر یک زمیں یک زماں

کمند اژدہاے مسلسل شکنج — دہن باز کردہ بہ تاراجِ گنج

زبس بر دہن ناچخ انداختن — نفس را نہ راہِ بروں تاختن

زنیزہ نیستاں شدہ روے خاک — زگوپالہا کوہ گشتہ مغاک

سناں در سناں رستہ چوں نوکِ خار — گرزبر سپر رستہ چوں لالہ زار

نہنگانِ شمشیر جوشن گداز — بہ گردن کشی کردہ گردن فراز

بہ ابرو درآمد کماں را شکنج — شتاباں شدہ تیر چوں مار گنج

زروسی درآمد بہ ناوردگاہ — یکے شیر برطاسی[1] روئیں کلاہ

مبارز طلب کرد و جولاں نمود — بہ نام آوری خویشتن را سرود

کہ برطاسیاں را دریں خام چرم — بہ برطاسیِ من شود پشت گرم

آلاتِ جنگ

---

[1] برطاس ایک مقام کا نام ہے ،

پلنگاں درم بر سرِ کوہسار — نہنگاں خورم بر لبِ جویبار

درشتم بہ چنگال و سختم بزد — بہ حملہ درم پہلو نرّہ گور

سنانم ز پہلو درآید بہ ناف — دروغے نمی گویم اینک مصاف

ہمہ خونِ خام است نوشیدنم — ہمہ چرم خام ست پوشیدنم

شہ گردناں شاہ گردوں گرائے — زپر کار موکب تہی کرد جائے

اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہو کر حملہ کرنا

زرہ بر میاں (پہلوان) گوہر آگیں کمر — درآورد پولاد ہندی بہ سر

بہ تن بر یکے آسماں گوں زرہ — چو مرغول زنگی گرہ در گرہ،

یمانی یکے تیغ زہراب جوش — حمائل فروہشتہ از طرفِ دوش

بہ کبکِ دری چوں درآید عقاب — چگونہ جہد بر زمیں آفتاب

ازاں تیز تر خسرو پیل تن — بہ تندی درآمد بدآں اہرمن

جنگ

بزد بانگ بردی کہ ائے اغِ پیر — عقابِ جواں آمد آرام گیر

نخستیں نبردے کہ تدبیر کرد — برآں تیرہ دل بارشِ تیر کرد

چو دژخیم را نامد از تیر باک — ز نندہ شد از تیر خو و خشمناک

یکے خشت (بدذات) پولاد الماس رنگ — برآورد و زد بر دلاور نہنگ

ز سختی کہ تن را بہم در فشرد — برآں خارہ شد خشت پولاد خرد

دگر خشتے انداخت آں تیز تر — برآں کشتی ہم نہ شد کارگر

چو دانست کاں دیو آہن سرشت — نیندیشد از حربہ تیر و خشت

نہنگ جہانسوز را برکشید | سوے اژدہاے دمندہ دوید
زدش برکتف گاہ و بر دش زجاے | چناں کاں ستمگر در آمد نجاے

لیکن انصاف یہ ہے نظامی، فردوسی کی طرح خاص لڑائی کے داؤں پیچ اور فنونِ جنگ کی تصویر اچھی طرح نہیں کھینچ سکتے،

نظامی اور فردوسی کا موازنہ

اگرچہ انصاف یہ ہے کہ نظامی فردوسی کے ہمپایہ نہیں ہیں بھوڑا سا شیریں پانی لے کر بار بار چھانا جائے، مقطر کیا جائے، اور پھر کسی خوشرنگ، خوشنما گلاس میں رکھا جائے تو اسکی شیرینی، خوشگواری، صفائی اور خوشنمائی میں کیا شک ہے لیکن ایک صاف شیریں قدرتی چشمہ جو پہاڑ کے دامن سے نکل کر، بہتا چلا جاتا ہے اس سے کیا نسبت، تاہم دونوں کا انداز کلام دکھانے کے لئے ہم چند مشترک عنوانوں کے اشعار نقل کرتے ہیں اور ان کا فرق دکھاتے ہیں،

سکندر کا قاصد بنکر نوشابہ کے دربار میں جانا، سکندرنامہ کی مشہور داستان ہے، یہی قصہ شاہنامہ میں بھی ہے، فرق یہ ہے کہ شاہنامہ میں نوشابہ کے بجاے قیدافہ کا نام ہے جو اندلس کا بادشاہ تھا، باقی حالات مشترک ہیں، یعنی بادشاہ نے سکندر کو پہچان لیا ہے، اور اس سے اسکا اظہار کیا ہے، سکندر انکار کرتا ہے، بادشاہ اسکی تصویر منگا کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ اپنے چہرہ سے ملالو، سکندر سخت مضطر ہوتا ہے، بادشاہ اس کو تسلی دیتا ہے کہ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔

فردوسی	نظامی
چو قیدافه را دید بر تختِ عاج	برآراست نوشابه درگاه را
ز یاقوت و پیروزه بر سرش تاج	بزر در گرفت آهنی راه را
ز زربفت پوشیده چینی قباے	پریچهرگان را بصد گونه زیب
فراوان پرستنده پیشش به پاے	صف اندر صف آراست آن دلفریب
رخ شاه تابان به کردار هور	برآمود گوهر به مشکین کمند
نشستنگهش را ستون‌ها بلور	فروهشت بر گوهر آگین پرند
پرستنده با طوق و با گوشوار	براورنگ شاهنشهی بر نشست
بپا اندران گلشنِ زرنگار	گرفته معنبر ترنجے بدست
سکندر بدان در شگفتی بماند	بفرمود کائین بجاے آورند
فراوان نهان نامِ یزدان بخواند	فرستاده را در سراے آورند
نشستنگهی دید، قیصر که نیز	فرستادهٔ از در آمد دلیر
نیامد ورا روم و ایران به چیز	سوے تخت شد چون شتابنده شیر
برحصرا اندر زمین داد بوس	کمربند شمشیر بگشاد باز
چنان چون بود مردم چاپلوس	برسم رسولان نبردش نماز
ورا دید قیدافه بنشناختش	نهانی دران قصرِ زیبنده دید
بپرسید بسیار و بنواختش	بهشتی سراے فریبنده دید

فردوسی	نظامی
به می خوردن اندر گرانمایه شاه	ز بس گوہرین گوش گردن کشاں
فزون کرد سوی سکندر نگاه	شده چشم بیننده گوہر فشاں
به گنجور گفت آں درخشاں حریر	ز تابنده یاقوت و رخشنده لعل
نبشته به صورت دلپذیر	خرامنده را آتشیں گشت نعل
به پیش من آور چناں ہم که ہست	مگر کان و دریا بہم تاختند
به تندی بر و ہیچ مپسای[۱] دست	ہمه گوہر اینجا بر انداختند
بیاورد گنجور و بنہاد پیش	زن زیرک از سیرت شانِ او
چو دیدش نگه کرد زاندازه بیش	دراں داوری شد ہراسان او
به چہر سکندر نکو بنگرید	که ایں کارداں مرد آہسته رای
ازاں صورت او را جدائی ندید	چرا شرط خدمت نیارد بجای
بدانست قیدافه کاو قیصر است	ز سر تا قدم دید در شہریار
بران لشکر نامور مہتر است	ز ر پخته را بر محک زد عیار
بدو گفت کای مرد گسترده کام	چو نیکو نگه کرد بشناختش
بیا تا چه دادت سکندر پیام	به تخت خود آرام گه ساختش
چنین داد پاسخ که شاه جہاں	سکندر به رسم فرستادگاں

[۱] یعنی بے احتیاطی سے ہاتھ نہ لگانا۔

فردوسی	نظامی
سخن گفت با من میانِ جهان	نگه داشت آئینِ آزادگان
که قیدافهٔ پاک دل را بگوے	پس آنگه گذارش گرفت از پیام
که جز راستی در زمانه مجوے	که شاهِ جهان داور نیک نام
مگر سر نه پیچی ز فرمانِ من	چنیں گفت کاے داور نامجوی
نگهدار بیدار پیمانِ من	زنام آورانِ جهان برده گوی
دگر هیچ تاب اندر آری بدل	چه افتاد کز ما عنان تافتے
بیارم یکے لشکرے دل گسل	سوے ما تو یک رو نشتافتے
بر آرم دمار از همه لشکرت	ز بونے چه دیدی که توسن شدی
به آتش بسوزم همه کشورت	چه بیداد کردم که دشمن شدی
بدو گفت کاے زاده فیلقوس	چو من ره دریں مملکت ساختم
همت رزم بزم ست هم نعم و بوس	بر و سایهٔ دولت انداختم
دلیر آمدی پیش من باز خواه	کمر چوں نه بستی بدرگاهِ من
ندانم ترا اینکه بنمود راه	چرا روی پیچیدے از راهِ من
سکندر ز گفتار او گشت زرد	به پاسخ نمودن زنِ هوشمند
روان پر ز درد و رخان لاجورد	ز یاقوت سر بسته بکشاد بند
بدو گفت کاے مهتر پر خرد	که صد آفریں بر تو شاهِ دلیر

چنین گفته از تو نه اندر خورد
منم نیطقون کد خدای جهان
جز این بچهٔ فیلقوسم مخوان
بدو گفت قیدافه کز داوری
لبت را بپرداز کاسکندری
بیاورد و بنهاد پیشش حریر
نوشته برو صورتی دلپذیر
که گر هیچ جنبش بدی در نگار
نبودی جز اسکندر شهریار

که پیغام خود خود گذاری چو شیر
چنان آیدم در دل ای پهلوان
که با این سر و سایهٔ خسروان
میانجی نه شاه آزادهٔ
فرستنده نه فرستادهٔ
پیام تو چون تیغ گردن زند
کرا زهره کین تیغ بر من زند
ز تیغ سکندر چه رانی سخن
سکندر توئی چارهٔ خویش کن
مرا خواندی و خود بدام آمدی
نظر پخته‌تر کن که خام آمدی
جهاندار گفت ای سزاوار تخت
پژوهش مکن جز به فرمان بخت

نظامی

سکندر محیط است دشمن چو آب — منه تهمت سایه بر آفتاب
بدرگاه او بیش ازان ست مرد — که او را قدم رنجه بایست کرد
دگر باره نوشابهٔ هوشمند — ز نوشین لب خویش بگشاد بند

نظامی

گزیں پیشہ بر دلفریبی مباش
بہ ناراستی یکر کیبی مباش

پیامت بزرگ است و نامت بزرگ
نہفتہ مکن شیر در چرم گرگ

فرستادہ را نیست ایں دسترس
کہ با ما بہ تندی برآرد نفس

نہ جباری خویش را کم کند
نہ در پیش من پشت را خم کند

جوابش چنیں داد شاہ دلیر
کہ ناید ز روباہ پیغام شیر

اگر من چہ چشم تو نام آورم
سکندر نیم زو پیام آورم

اگر در میانجی دلیر آمدم
نہ از روبہ از نزد شیر آمدم

بہ آشفت نوشابہ زاں شیر دل
کہ پوشید خورشید را زیر گل

بفرمود کارد کنیزے دواں
حریرے برو پیکر خسرواں

یکے گوشہ از نقش آں حریر
بدو داد کیں نقش بر دست گیر

ببیں تا نشان رخ کیست ایں
دریں کارگاہ از پے چیست ایں

اگر پیکر تست چندیں مکوش
بہ ابروی خود آسماں را مپوش

سکندر ز پیغام او ساز کرد
حریر نوشتہ ز ہم باز کرد

بعینہ درو صورت خویش دید
ولایت بدست بد اندیش دید

بترسید و شد رنگ ویش چو کاہ
بدارائے خود برد خود را پناہ

(۱) سب سے پہلے اس پر نظر ڈالو کہ جہاں ایک ہی خیال ایک ہی واقعہ ایک ہی

بات کو دونوں نے لکھا ہے وہاں بھی، بندشِ الفاظ کے لحاظ سے کس قدر فرق ہی، نظامی کی ترکیبوں کی چستی، قافیوں کی بلندی، فقروں کے دروبست، الفاظ کے شکوہ کا یہ انداز ہی کہ گویا شیر گونج رہا ہے، اسکے مقابلہ میں فردوسی کا کلام ایسا معلوم ہوتا ہے، جس طرح کوئی پراتم بڈھا پیرانہ لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتا ہی، ان اشعار کا مقابلہ کرو،

فردوسی	نظامی
ززربفت پوشید چینی قباے	پریچہرگاں را بصد گونہ زیب
فراواں پرستندہ پیشش بپاے	صف اندر صف آراست آں دلفریب
برہتر اندر زمیں داد بوس	سکندر بہ رسم فرستادگاں
چناں چوں بود مردمِ چاپلوس	نگہ داشت آئینِ آزادگاں
سکندر بداں در شگفتے بماند	نہانے دراں قصرِ زیبندہ دید
فراواں نہاں نامِ یزداں بخواند	بہشتی سرائے فریبندہ دید
بہ مے خوردن اندر گراں مایہ شاہ	ز سرتا قدم دید در شہریار
فزوں کرد سوے سکندر نگاہ	زر پختہ را بر محک زد عیار
بہ گنجور گفت آں درخشاں حریر	یکے گوشہ از شقہ آں حریر
نبشتہ بروصورتے دلپذیر	بدو داد کیں نقش بر دست گیر
کہ قیدافہ پاک دل را بگوے	چنیں گفت کاے داور نامجوی
کہ جز راستی در زمانہ مجوے	ز نام آورانِ جہان بردہ گوے

فردوسی	نظامی
دلیر آمدی پیش من باز خواه	که صد آفریں بر تو شاه دلیر
ندانم ترا اینکه ہنبود راه	که پیغام خود خود گذاری چو شیر
بدو گفت قیدافه کز داوری	میانجی نه شاه آزاده
لبت را بپرداز کا سکندری	فرستنده نه فرستاده
سکندر ز گفتار او گشت زرد	بترسید و شد رنگ وی چو کاه
رواں پر ز درد و رخاں لاجورد	به دارائے خود برد خود را پناه
منم بیطقوں کد خدائے جہاں	سکندر محیط است و من جوی آب
جز ایں بچه فیلقوسم مخواں	منه تهمت سایه بر آفتاب

(۲) انہی اشعار میں بلاغت کا فرق دیکھو،

فردوسی	نظامی
فراواں پرستنده پیش بپائے	صف اندر صف آراست آں دلفریب

فردوسی کے بیان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کا ہجوم تھا، اور سب کھڑے تھے، لیکن نظامی کے بیان سے ان کا باقاعدہ صف بصف ایستادہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے "آراست" کے لفظ نے اس خصوصیت کو اور روشن اور خوشنما کر دیا ہی،

فردوسی	نظامی
برہنہ اندر زمیں داد بوس	سکندر به رسم فرستادگاں

چناں چوں بود مردم چاپلوس	نگہ داشت آئین آزادگاں

فردوسی نے سکندر کی شان کا کچھ لحاظ نہیں رکھا، زمین چومنا خوشامدیوں کا شیوہ ہے، فردوسی کو اس پر بھی قناعت نہیں بلکہ کھول کر کہتا ہے کہ سکندر نے اس طرح زمین چومی جس طرح خوشامدی چوما کرتے ہیں. نظامی نے اگرچہ "برسم فرستادگاں" کے لفظ سے ظاہر کر دیا ہے کہ سکندر نے قاصدوں کے طریق اور آئین کو ملحوظ رکھا تھا تاہم دوسرے مصرع میں دفع دخل بھی کر دیا، کہ اس حالت میں بھی اپنی آن بان نہیں چھوڑی،

فردوسی	نظامی
سکندر بداں در شگفتے بماند فراواں نہاں نام یزداں بخواند	نہانے دراں قصر زیبندہ دید بہشتی سرائے فریبندہ دید

فردوسی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر بالکل ندیدہ تھا، دربار کے ٹھاٹ کو دیکھکر مبہوت ہوگیا تھا، اور بار بار خدا کا نام لیتا تھا، نظامی نے مکان اور ایوان کی عمدگی اور خوبی کا اثر سکندر پر طاری کرنا چاہا ہے، لیکن اسی قدر کہ وہ کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا،

فردوسی	نظامی
فزوں کرد سوے سکندر نگاہ	ز سرتا قدم دید در شہریار

فزوں نگاہ کردن سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ قیدافہ سکندر کو بڑی

دیر تک دیکھتا رہا، ممکن ہے کہ صرف چہرہ پر ہی دیر تک اسکی نظر جمی رہی ہو، لیکن صرف چہرہ کی مشابہت پہچاننے کے لئے کافی نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے چہرے ملتے جلتے ہوتے ہیں، لیکن اور اعضا میں فرق ہوتا ہے، بخلاف اس کے نظامی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ نوشابہ نے سکندر کو سر سے پاؤں تک دیکھا یعنی نہ صرف چہرہ بلکہ تمام اعضا اور ڈیل ڈول، رنگ روپ، سج دھج کو بھی دیکھا جس سے صاف ثابت ہوگیا کہ یہ سکندر ہے،

فردوسی	نظامی
کہ قیدافۂ پاک دل راگوے	چنیں گفت کاے داور نامجوی
کہ جز راستی در زمانہ مجوے	ز نام آوران جہاں بردہ گوی

قاصد کا بادشاہ کے دربار میں بادشاہ کا نام لینا، اور پھر فوراً تنبیہ اور نصیحت شروع کر دینا دستور کے خلاف ہے، اس لئے نظامی نے نام نہیں لیا بلکہ داور نامجو کے لفظ سے خطاب کیا اور اس کے ساتھ مدحیہ الفاظ اضافہ کئے،

فردوسی	نظامی
دلیر آمدی پیش من باز خواہ	کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر
ندانم ترا ایں کہ بنمود راہ	کہ پیغام خود خود گذاری چو شیر

فردوسی نے اس بات کو کہ قیدافہ نے سکندر کو پہچان لیا نہایت بے مزہ طریقہ سے بیان کر دیا ہے، اسکے ساتھ یہ الفاظ کہ معلوم نہیں کس نے تمکو یہ طریقہ سکھایا

اور بھی بد تہذیبی ہے، بخلاف اس کے نظامی اس بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں، جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نوشابہ کو یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ میں نے آپ کو پہچان لیا بلکہ وہ سکندر کی دلیری اور جرأت کے اثر سے متاثر ہے، اور بے اختیار تعریف کرتی ہے،

نظامی	فردوسی
بتر سید و شد رنگ رویش چو کاہ	سکندر ز گفتار او گشت زرد
بہ وارلے خود برد خود را پناہ	رواں پر ز درد و رخاں لاجورد

اس قدر مضمون دونوں کے ہاں مشترک ہے کہ جب سکندر کو معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اسکو پہچان لیا، تو وہ ڈرا اور متردد ہوا، لیکن فردوسی نے اسکے ڈرنے کو اسقدر حد سے بڑھا دیا جو سکندر کی شان سے بالکل بعید ہے "رواں پر ز درد و رخاں لاجورد" نظامی کے بیان سے بھی اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کا رنگ زرد پڑ گیا اور دل میں خدا سے دعا مانگی کہ اس خطرہ سے بچ جائے، لیکن اتنا بھی بدحواس نہیں ہوا کہ دل میں ٹیس اٹھنے لگی، فردوسی نے پہلے مصرع میں سکندر کا زرد پڑ جانا بیان کر دیا تھا لیکن اس پر بھی تسلی نہیں ہوئی اور دوسرے مصرع میں پھر کہنا پڑا "رخاں لاجورد"

(۳) اب عام طرح پر نظر ڈالو، جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ بیان کرنے والا واقعہ کا خاکہ رنگین کیونکر قائم کرتا ہے، اور یہ بلاغت کا پہلا لیکن سب سے ضروری مرحلہ ہے،

فردوسی نے واقعہ کا جو خاکہ قائم کیا ہے اس میں متعدد ناموزونیاں ہیں،

(۱) سکندر قاصد کے لباس میں خوشامدیوں کی طرح دربار میں آداب بجالاتا ہی،

(۲) دربار کو دیکھکر مبہوت ہو جاتا ہی، گویا کبھی شاہانہ دربار دیکھا ہی نہ تھا،

(۳) حالانکہ سکندر کی رفتار، گفتار، طور وطریقہ سے ابھی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی تھی جس سے اس احتمال کی طرف ذہن جائے کہ یہ خود سکندر ہے، تاہم بادشاہ کو شبہہ ہوتا ہے اور وہ سکندر کے چہرہ کو بہت غور سے دیکھتا ہے، اسلئے نظامی نے اسکا یہ پہلو نکالا کہ سکندر نے قاصدوں کی طرح سجدہ نہیں کیا تھا، اور پیغام اس شان سے ادا کیا کہ قاصد اس دلیری اور جرأت سے ادا نہیں کر سکتا تھا، اس حالت میں شبہہ پیدا ہونا ضرور تھا، اور شبہہ کو اس لئے قوت ہوئی کہ سکندر کی تصویر اُسکی نظر سے گذر چکی تھی،

(۴) قیدافہ نے سکندر کے سامنے ہی تصویر منگا کر دیکھی، حالانکہ جب مخفی طور سے سکندر کو پہچاننا مقصود تھا، تو سکندر کے سامنے تصویر منگوا کر دیکھنا نہ چاہیے تھا،

(۵) سکندر جب قاصد کی حیثیت سے پیغام ادا کرتا ہی تو معلوم ہوتا ہی کہ آداب شاہی سے ناواقف ہی، اوّل تو بادشاہ کا نام لینا خلاف ادب ہی اسکے علاوہ پہلے ہی سخت کلامی شروع کر دینی نہایت بد تہذیبی ہی،

به آرم دمار از همه لشکرت   به آتش بسوزم همه کشورت

(۶) سکندر جب اپنے آپ کو چھپاتا، اور سکندر کا قاصد ہونا ظاہر کرتا ہی تو اسکو سکندر کا نام بڑی تعظیم وتکریم سے لینا چاہیے تھا لیکن وہ سکندر کو بچہ فیلقوس کے خطاب سے یاد کرتا ہے،

ع جز این بچۂ فیلقوسش مخوان

اس کے مقابلہ میں نظامی نے جس طرح اس تمام واقعہ کا خاکہ کھینچا ہی وہ یہ ہی:
نوشابہ کو جب معلوم ہوا کہ سکندر کے دربار سے قاصد آتا ہی تو اس نے بڑے سا
وسامان سے دربار آراستہ کیا خود بھی بن ٹھن کر ہاتھ میں ایک ترنج لئے ہوئے تختِ شاہی
پر بیٹھی، سامنے پریچہرہ کنیزیں صف باندھ کر کھڑی ہوئیں، پھر سکندر کو طلب کیا، سکندر
دربار میں آیا تو آدابِ شاہی کے موافق کمر بند سے تلوار کھول کر رکھدی، لیکن سجدہ نہیں کیا
اس موقع پر دربار جو جواہرات سے جگ مگ کر رہا تھا، اسکو نہایت مبالغہ آمیز پیرایہ
میں ادا کیا ہے،

زتابندہ یاقوت درخشندہ لعل خرامندہ را آتشیں گشت نعل
مگر کان و دریا بہم تاختند ہمہ گوہر آں جا برانداختند

قاصد کے شاہانہ طرز کلام سے نوشابہ کو شبہہ ہوا کہ یہ خود سکندر ہے، خوب غور
سے دیکھا تو یقین ہوگیا، قاصد نے اب پیغام ادا کرنا شروع کیا، کہ شہنشاہ نے کہا ہی کہ
ہماری طرف کیا کمی ہوئی جو تم نے بے اعتنائی کی، آج تک تم دربار میں نہ آئے، ہم ان
اطراف میں بھی آئے لیکن تم نے ادھر رخ نہ کیا،
نوشابہ نے کہا کہ آپ کی جرات پر صد ہزار آفریں ہی کہ آپ اپنا پیغام ادا کرتے
ہیں، آپ کی باتیں تلوار کا کاٹ کرتی ہیں، یہ تلوار اور کس کی مجال ہے کہ مجھ پر چلائے،

لہ اس بیان میں فردوسی اور نظامی کے اشعار نگر آگئے لیکن اس بحث کو اچھی طرح ذہن نشین کرنیکے لئے ایسا کرنا ضرور تھا

سکندر انکار کرتا ہے کہ میں سکندر نہیں، پھر اسکی نہایت عمدہ توجیہیں بیان کرتا ہی کہ کجا سکندر، کجا میں، سکندر کے دربار میں آدمیوں کی کیا کمی ہے کہ خود قاصد بنکر آتا، اس موقع پر نوشابہ و سکندر کے سوال و جواب کو نہایت بلیغ انداز میں طول دیا ہی، آخر نوشابہ جھلا کر سکندر کی تصویر منگوا کر اسکو دکھلاتی ہے، اور سکندر لاجواب ہو کر رہجاتا ہی، اس کے ساتھ خطرہ کے خیال سے اسکے چہرہ کی رنگت زرد پڑ جاتی ہے،

اس تمام سلسلہ میں کہیں سے کوئی کسر نہیں، تمام واقعات، اصلیت اور نیچر کے مطابق ہیں، اسکے ساتھ فصاحت و بلاغت. تشبیہات اور استعارات کی ندرت اور لطافت، الفاظ کی شان و شکوہ، ان تمام باتوں نے اس داستان کو سحر سامری بنا دیا ہی،

نظامی اور فردوسی میں یہ فرق اور بہت سے موقعوں پر نظر آتا ہی لیکن طول کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں، سکندر و دارا کی گفتگو اوپر گذر چکی ہی، اسکو اس موقع پر ایک بار اور دیکھ لینا چاہئے، ان سب باتوں پر بھی فردوسی فردوسی ہی اور نظامی نظامی،

چند ضروری باتیں

۱۔ شعر العجم کے چار حصوں میں سے یہ پہلا حصہ جو شائع ہو رہا ہی اسمیں صرف قدیم شعرا کے حالات اور ان کی شاعری سے بحث ہے' دوسرا اور تیسرا حصہ مطبع میں جاچکا ہی پہلے حصہ کی تالیف میں اگرچہ تدقیق اور محنت میں کچھ کمی نہیں کی گئی لیکن مجھکو صاف کہنا چاہئیے کہ یہ حصہ اور تمام حصوں کی بہ نسبت کم دلچپ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی تصنیف کی دلچسپی یا شعرا کے حالات سے ہوسکتی تھی یا اُن اشعار سے جو جابجا مثال میں پیش کئے جاتے ہیں، قدیم شعرا کے حالات کم ملتے ہیں، اور یہ حصہ قدما ہی تک محدود ہی دقیقی، عنصری، نظامی بہت بڑے رتبہ کے شاعر ہیں لیکن انکے حالات اور واقعات اس قدر کم ہیں کہ مجبوراً چھوٹی چھوٹی باتوں کو لیکر پھیلانا پڑا ہے، قدما میں سے دور اول کی زبان آج بالکل نامانوس ہی، دقیقی، فردوسی، منوچہری، عنصری کے متواتر دو شعر بھی آجکل کی زبان میں نہیں ملتے، اسکے علاوہ انکی شاعری میں عشق کی چاشنی گویا ہی ہی نہیں اسلئے ان کے کلام میں آج کل کے لوگوں کو مزا نہیں آسکتا،

غرض یہ حصہ چنداں تفریح اور تفنن کے کام کا نہیں، اسکو ایک علمی خشک مضمون کی حیثیت سے پڑھنا چاہئیے، باقی حصے البتہ دلچسپ، بامزہ اور رنگین ہیں،

۲۔ چونکہ کتابوں کی تفحص اور تلاش کا سلسلہ ابتک قائم ہی، اور بعض بعض نادر کتابیں

اس حصہ کی تصنیف کے بعد ہاتھ آئیں، اسلئے وہ معلومات جو ان کتابوں سے ہاتھ آئے اب چوتھے حصے کے کام آئیں گے، مثلاً تمام تذکروں میں مذکور ہی کہ ایران میں سب سے پہلے بہرام گور نے شعر کہا اور وہ یہ تھا،

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ ‎ ‎ ‎ ‎ نام بہرام مرا و پدرم بو جبلہ

لیکن میں نے اس روایت کو اسلئے نظر انداز کیا تھا کہ اول تو یہ اُس زمانہ کی زبان نہیں ہوسکتی، دوسرے یہ کہ بہرام کے کلام میں ابوجبلہ عربی لفظ کیوں آتا لیکن لب اللباب عوفی کی پہلی جلد، کتاب کی تصنیف کے بعد چھپ کر یورپ سے آئی تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بہرام گور عرب میں پلا تھا، اور عربی زبان میں شعر کہتا تھا، چنانچہ عوفی نے اس کا عربی دیوان خود دیکھا تھا لب اللباب میں یہ شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ مذکور ہے جس سے اُس کی ساخت اور زبان دونوں پر اثر پڑتا ہی۔

۳- دنیا میں ناممکنات کی اب تک جو فہرست تیار ہو چکی ہی، اس میں ایک نمبر کتاب کا صحیح چھپنا بھی اضافہ کرنا چاہئے یہ مصیبت مدت سے مجھ کو پیش آتی ہی لیکن علاج کی کوئی صورت نہیں نکلتی، کاپیوں اور پروف کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی، چھپنے میں حرف کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، کسی کتاب کے ساتھ غلط نامہ لگانا بھی بیکار سا ہے غلط نامہ سے کتاب کو مطابق کر کے تصحیح کرنا، اتنی بڑی زحمت کون اُٹھائے، اسی بنا پر میں نے کبھی اس کا قصد نہیں کیا لیکن شعر العجم فارسی لٹریچر کا آئینہ ہے، اسکی غلط بیانی کا اثر خود زبان پر پڑ سکتا ہی، اسلئے چار و ناچار میں خود زحمت اٹھاتا ہوں اور احباب کو

بھی زحمت دیتا ہوں، خفیف غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ سب کا احصا کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے، اسلئے موٹی موٹی غلطیاں لکھدی ہیں، ایک عام غلطی یہ ہو کہ بین السطور میں جہاں کہیں میں نے کسی لفظ کے نیچے اس کے معنی لکھدیئے ہیں کاتب صاحب نے اس سے ہٹا کر کسی دوسرے لفظ کے نیچے وہ معنی لکھدیتے ہیں، اور اس سے مصنف کی سخت جہالت ثابت ہوتی ہو،

ایک جگہ اہل مطبع نے نہیں بلکہ میں نے خود سخت غلطی کی ہو جس سے فردوسی کی شاعری پر حرف آتا ہو، اسلئے نہایت ندامت کے ساتھ فردوسی سے اسکی معافی چاہتا ہوں، کتاب کے ۱۶۷ صفحہ سطر ۹ میں یہ عبارت ہو،

"صلاح و مشورہ کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، اس میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے، لوگ کھا پی کر اٹھ کھڑے ہوئے، اسکو اس طرح ادا کرتا ہو،

پے مشورہ مجلس آراستند   نشستند، خوردند و برخاستند

لیکن فردوسی کا شعر میں نے غلط نقل کیا، اور اسلئے معنی بھی غلط لکھے شعر کا دوسرا مصرع اصل میں یوں آیا ہو ع

نشستند و گفتند و برخاستند

نکتہ دانِ بلاغت جانتا ہو کہ اس ایک لفظ (گفتند) کے تغیر سے شعر برباد ہو جاتا ہو